قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2024 قیمت 25₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

- اردو میں تخلیقی مواد تیار کرنے کے سلسلے میں سہ روزہ ورکشاپ 7

ادب زاویے اور جہات

- سائبر پنک لٹریچر — خواجہ محمد اکرام الدین 11
- تخلیقی تنقید اور سریندر پرکاش کی سحر انگیز افسانہ نگاری — ریاض توحیدی 13

- رامپور میں تذکرہ نگاری کا اجمالی جائزہ — نظام الحسن 17
- خاکہ نگاری کا ایک حوالہ آبِ حیات — دلشاد حسین اصلاحی 21
- برصغیر کی زبانوں میں اردو کا شجرہ — شمیم احمد 25

زبان و تعلیم

- قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے رہنما خطوط — آفاق ندیم خان 28
- اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی — عارفہ بشریٰ 32
- زبان کی تدریس میں تخلیق کا دائرۂ عمل — محمد نور اسلام 34

ابیات

- پیاس کی بازگشت — شیخ عقیل احمد 37

شخصیات

- ظفر گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری میں مٹی کی مہک — اشتیاق سعید 41
- انور ندیم کے قلمی خاکے — محمد اویس سنبھلی 44
- عزیز بانو داراب وفا — محمد مستمر 47
- خواجہ حسن ثانی نظامی کا اسلوب — عزیز احمد خان 49

یاد رفتگاں

- ریاض الرحمٰن شروانی حیات و خدمات — محمد سلیم قدوائی 51
- چھوٹا کشمیر کا قد آور شاعر رسا جاودانی — شہاب عنایت ملک 54

تاریخ

- حیاتِ قدیمہ اور عصر ماقبل تاریخ
  مصنف: ڈی ڈی کوسمبی
  مترجم: بالمکند عرش ملسیانی 57

نفسیات

- فرد کی قدر شناسی اور اثباتِ اقتدار کی صلاحیت
  مصنف: رولومے
  مترجم: زاہدہ زیدی 62

سماجیات

- انسان بحیثیت سماجی حیوان — شریف الحسن نقوی 63

صحت

- ناقص تغذیے کے اثرات — شکیل احمد 67

سلسلۂ صحافت

- اردو صحافت پر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات — محمد سہیل 70

نیا آسماں نئے ستارے

- حسرت کا تصورِ عشق — محمد عارف 74

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 76

خبر نامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 84

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26،شمارہ:11،نومبر 2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

ہماری بات

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے۔ اس لیے سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات پر زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔

واضح رہے کہ ہر شعبۂ علم وفن کی الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ اصطلاحات سازی کے لیے بہت سے علوم وفنون اور زبانوں سے واقفیت لازمی ہے۔ ماضی میں وضع اصطلاحات پر خاصا وقیع کام ہوا ہے، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس میں مختلف سائنسی اور تکنیکی کتابوں کے انگریزی اور دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمے کیے گئے تھے۔ مگر ان اصطلاحات کا ڈیجیٹلائزیشن نہیں ہوسکا تھا اس لیے موجودہ دور میں اس مقصد کے تحت مقامی زبانوں میں بھی اصطلاحات کا ڈیجیٹلائزیشن کیا جارہا ہے تاکہ علمی مواد کی رسائی ہر زبان بولنے والے تک ممکن ہوسکے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہر شخص آسانی سے اس کا استعمال کرسکتا ہے، خاص طور پر یہ ان علاقوں کے لیے بہت مفید ہے، جہاں لغات یا کتابوں تک عام قارئین کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔

ڈیجیٹل اصطلاحات کی وجہ سے ایک تو وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے اور صارفین کو بھی بآسانی معلومات فراہم ہوجاتی ہے۔ ایک فائدہ اور بھی ہے کہ ان اصطلاحات کو وقتاً فوقتاً اَپ ڈیٹ بھی کیا جاسکتا ہے، جیسے جیسے نئے الفاظ اور تکنیکی وسائنسی اصطلاحات سامنے آئیں گے ان اصطلاحات کو شامل کرنے میں سہولت ہوگی۔ لہٰذا آج کے اس ڈیجیٹل دور میں ڈیجیٹل اصطلاحات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا مقصد بھی یہی ہے کہ تعلیمی نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے اور یہ نظام بیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔ اس پالیسی میں ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل وسائل کے بھرپور استعمال پر زور دیا گیا ہے تاکہ معاشرے کے ہر فرد تک تعلیم کی رسائی ہو اور اسی تعلیمی پالیسی میں ابتدائی تعلیم مادری زبان یا مقامی زبان میں دینے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ ڈیجیٹل اصطلاحات کو مقامی زبانوں میں آسان اور جامع بنایا جاسکے۔ یہ طلبا کو ان کی اپنی زبان میں معیاری تعلیمی مواد تک رسائی میں بھی معاون ہوگا۔

NEP 2020 میں ای لرننگ اور ڈیجیٹل تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ تمام بھارتیہ زبانوں میں تعلیمی مواد کی تیاری آسان ہو اور اسے ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے ذریعے وسیع پیمانے پر پھیلایا جانا بھی ممکن ہو، اس سے بھارت کی کثیر لسانی ثقافت کو فروغ ملے گا اور زبان کی بنیاد پر تعلیم کی رکاوٹیں بھی کم ہوں گی۔ طلبا اور محققین کو جدید سائنسی اور تکنیکی زبانوں کو سمجھنے میں بھی رہنمائی ملے گی۔

قومی اردو کونسل نے سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کی فرہنگ سازی میں خاصی پیش رفت کی ہے اور اس تعلق سے بہت سی کتابیں کونسل سے شائع ہوچکی ہیں جن میں فرہنگ اصطلاحات وجغرافیہ، فرہنگ اصطلاحات حیوانیات، فرہنگ اصطلاحات طبیعیات، فرہنگ اصطلاحات ریاضیات، فرہنگ اصطلاحات کامرس، فرہنگ اصطلاحات کیمیا، فرہنگ اصطلاحات لسانیات، فرہنگ اصطلاحات معاشیات، فرہنگ اصطلاحات نباتیات، فرہنگ اصطلاحات سماجیات، فرہنگ اصطلاحات شماریات، فرہنگ اصطلاحات ترسیل عامہ، فرہنگ اصطلاحات سیاسیات، فرہنگ اصطلاحات قومی تجارتی و مالیاتی اصطلاحات، فرہنگ اصطلاحات قانون قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے اردو داں طبقے کو سائنسی، سماجی، قانونی اور دیگر اصطلاحات کی تفہیم میں رہنمائی ملے گی اور سائنس اور تکنیک کے شعبے سے تعلق رکھنے والے طلبا اور اساتذہ بھی استفادہ کرسکیں گے اور اردو میڈیم کے بچوں کے سائنسی ذوق وشعور کو فروغ دینے کے لیے یہ کتابیں بہت معاون ثابت ہوں گی۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✍ اردو دنیا اکتوبر 2024 کا تازہ ترین شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے کے کور پر ہی چنار اردو کتاب میلہ 2024 کے افتتاح کی ایک دیدہ زیب تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس

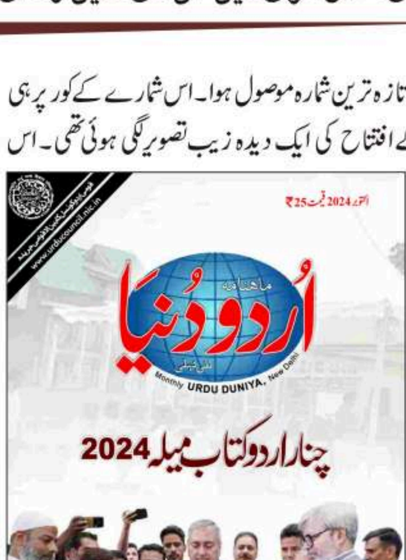

دیدہ زیب تصویر کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی اور آنکھیں اردو کتاب میلہ سے متعلق خبر تلاش کرنے لگیں۔ خبر میں نودنوں کی مفصل روداد عمدہ طریقے سے درج کی گئی ہے۔ ادارے میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر جناب شمس اقبال صاحب نے کتابوں کے مطالعے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ 'جولوگ کتاب نہیں پڑھتے وہ صرف اپنی زندگی جیتے ہیں۔ مطالعہ کرنے والا نہ صرف متنوع تہذیبوں/ ثقافتوں اور مختلف جہانوں کی سیر کرتا ہے بلکہ اپنے مشاہدات، محسوسات اور مطالعات کی بنیاد پر اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔' علمی اور ادبی زندگی کے تناظر میں یہ باتیں بہت اہم ہیں اور کتب کے مطالعے کی طرف راغب کرنے والی ہیں۔ اردو دنیا کے مضامین اور گوشوں میں نت نئے اضافے ہو رہے ہیں اور تازہ کار مضامین نظر آرہے ہیں۔ اس میں ایک طرف جہاں اردو ادب سے متعلق مضامین ہیں وہیں سماجیات، معاشیات اور عالمی ادبیات پر بھی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مضامین کا یہ تنوع ہم جیسے مبدی قاری کے علم ونظر میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ سیدہ جعفر کا مضمون مضمون اور اس کا فن بہت عمدہ اور قابل توجہ مضمون ہے۔ اس مضمون کے تحت سیدہ جعفر نے مضمون نویسی کے اصول وضوابط پر بہت مفصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یعنی مضمون کا آغاز کیسے ہو، مضمون کی اصطلاح کس طرح رائج ہوئی، اصطلاح کا استعمال کس طرح ہوا، مضمون بطور صنف ادب، مضمون کی ماہیت، مضمون کی تعریف، مضمون کا طول، مضمون کا موضوع اور مضمون کی قسمیں جیسے عناوین مضمون کی شناخت اور فہم میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

سرفراز جاوید نے اردو شاعری میں رمائن اور گیتا کے اساطیر پر مضمون تحریر کیا ہے۔ اساطیر کے لفظ پر نگاہ پڑتے ہی ذہن متحرک ہوجاتا ہے اور اس کے محرکات تلاش کرنے لگتا ہے۔ مضمون نگار بے بہت خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ اردو شاعری میں ان اساطیر کی تلاش کی ہے۔ نیر مسعود کے افسانوں کی انفرادیت پر آصفہ زینب نے ایک بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ نیر مسعود کی کہانیوں کے کردار، پلاٹ، زبان وبیان کی ہنرمندی پر بات کرتی ہیں اور مختلف حوالوں سے ان مباحث پر روشنی ڈالتی ہیں۔ عرفان امین گنائی کا مضمون سماجی شعور تعارف، اہمیت اور افادیت بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ انھوں نے اس سیاق میں انسان کے سماجی شعور اس کی جبلت اور اس کے متعلق مختلف نظریات کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ان کا یہ مضمون قاری کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح مقبول احمد مقبول کا مضمون قدیم بھارت کا عظیم سیاست داں اور ماہر معاشیات کوٹلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کوٹلیہ کی مشہور ومعروف کتاب ارتھ شاستر کے حوالے سے مفصل بات کی اور اس تناظر میں کوٹلیہ کی شخصیت کی تفہیم کی ہے۔ ابن قتیبہ کا تصور ادب کے عنوان سے محمد شہباز عالم کا مضمون بھی قابل توجہ ہے۔ ابن قتیبہ کا نام اسلامی علوم وفنون کے تعلق سے ایک اہم حوالہ ہے۔ قلم کار نے بہت عمدہ طریقے سے ابن قتیبہ علمی وادبی کاوشوں کا احاطہ کیا اور مضمون کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اس طور سے اکتوبر 2024 کا شمارہ بہت خوبصورت اور اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے اور زندگی وادب کے مختلف النوع موضوعات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ہماری علم وبصیرت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالوحید خان: گورنمنٹ انٹر کالج، جھانسی، یوپی

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے کونسل کا مسلسل اور قابلِ قدر کام نہ صرف زبان کو زندہ رکھے ہوئے ہے، بلکہ نئی نسلوں میں ادب سے محبت کا چراغ بھی روشن کیا ہے۔اس ادارے کی سرپرستی میں اردو زبان کے فروغ اور ترویج وترقی کا کام جس تسلسل اور سنجیدگی سے ہو رہا ہے، وہ یقیناً اردو زبان کے مستقبل کو روشن کرنے کا ضامن ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' اردو ادبی صحافت میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے، کونسل کی ان کاوشوں کا ایک اہم مظہر ہے۔آپ کے زیرِ ادارت اس مجلّے کی ہر اشاعت قاری کے لیے علمی وفکری وادبی سرمایہ ہے، جس میں اردو زبان وادب کی تازہ ترین تحریکوں، رجحانات اور مکالمات کو نہایت عمدگی سے پیش کیا جاتا ہے۔آپ کا یہ جریدہ علمی وادبی معیاروں کو نبھاتے ہوئے یقیناً اردو کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

محمد شہباز عالم: شعبۂ عربک، سیتل کوچی کالج سیتل کوچی، کوچ بہار، مغربی بنگال

عہد حاضر میں ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام مدیر عالی ڈاکٹر شمس اقبال کی سرپرستی میں بڑی آب و تاب کے ساتھ وقت پر منظرعام پر آجاتا ہے۔ مبارک باد دینا چاہتا ہوں ڈاکٹر شمس اقبال صاحب اور ان کی پوری ٹیم کو صلہ میں۔ ہمارے جیسے قاری اور بہت بڑی تعداد میں اس رسالے سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اس رسالے کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی ادارتی ٹیم جس عرق ریزی کے ساتھ شمارے میں مقالات اور

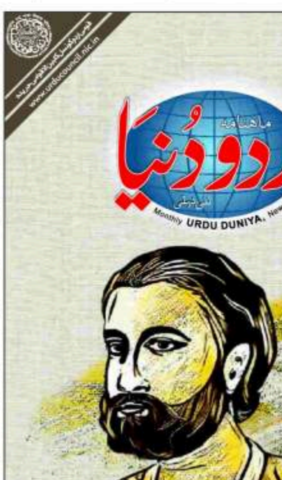

دوسرے مضامین کا انتخاب کرتی ہے اس حوالے سے ہر ایک تحریر اپنے آپ میں ایک الگ قسم ونوعیت کی ہوتی ہے۔اس 100 صفحے کے رسالے میں Print Material کے ساتھ جس میں تمام مقالات اور دیگر مضمون کے ساتھ اردو اور تعلیم کے متعلق قومی اور علاقائی خبریں بھی شامل ہوتی ہیں کا مطالعہ کر کے قاری ہر ماہ کے شمارے سے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ مقالات اور مضامین میں جس وسیع النظری سے کام لیا جاتا ہے وہ تشنہ لب کی پیاس بجھانے میں معاون ہے۔اس لحاظ سے بھی اردو دنیا رسالے کا ہندوستان بھر میں کوئی ثانی نہیں ہے۔پچھلے دو مہینوں جولائی اور اگست 2024 کے شماروں میں تحریریں دستیاب ہوئیں ان کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور علم میں اضافہ بھی۔ جولائی اور اگست کے شمارے کے سبھی مضمون نگاروں کو نیک خواہشات کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔خصوصاً جولائی کے شمارے میں ڈاکٹر محمد نسیم جن کا مضمون 'پریم چند کے ناولوں میں بین التہذیبی کشمکش' ہے۔ یوں تو رسالہ جولائی 2024 کے سارے مضامین بے حد تحقیقی نچوڑ اور اچھے ہیں مگر تحریریں جو بہترین ادب کی عکاسی کرتی ہیں وہ یہ ہیں ہندوستانی تہذیب کا شاعر: نظیر اکبرآبادی (جاں نثار عالم)، سلام کی سادگی: شکستہ بتوں کے درمیان (غضنفر)، قرۃ العین حیدر اور ساگا ناول (شہاب عنایت ملک) رسالے کے آخر میں جو اردو دنیا کی خبریں ہیں وہ بھی نہایت کارآمد اور تحقیق شدہ ہیں۔

ماہ اگست 2024 کا شمارہ بھی ہمیں جشن آزادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوا حاصل ہوا۔اردو دنیا میں ایسے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں جو تاریخ میں گم کسی شخصیت سے متعارف کراتے ہیں، جیسے وکست بھارت کا تصور: 2047@ کے تناظر میں جو کہ سنتوش کمار جے ہند کا تحریر کردہ ہے، بہت اچھا لگا۔اس کے علاوہ دیگر سبھی مضمون اور مقالات بہترین، دلچسپ اور معلوماتی ہیں، نفسیات سے متعلق نسل نو کی نفسیات ہندوستانی معاشرے کے تناظر میں محمد علم اللہ اور آخر میں اردو دنیا رسالے میں خبرنامہ میں اردو کے تعلق سے خبروں سے آگاہی ہوتی ہے تاکہ ہم خبردار رہیں۔

محمد سعید فرخ آبادی، ایمفی ریسرچ اسکالر، مانو حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے اگست کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔اس شمارے کا سرورق بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔اس کے مشمولات بہت عمدہ اور اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں موجود مضامین بہت توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ ہماری بات میں پندرہ اگست کے حوالے سے بہت قابل قدر گفتگو کی گئی ہے۔اس حوالے ملک کے ہم نوجوانوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ موجودہ صدی ہمارے بھارت کی صدی ہوگی۔مشمولات میں مضامین اور تخلیقات کا اس قدر تنوع ہے کہ نگاہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتی ہے۔خطوط، بھارت وژن اور مشن، زبان وتعلیم، شخصیت، ارضیات، عالمی ادبیات/شخصیات، نوریات، خراج عقیدت، لسانیات، زراعت، نفسیات زراعت، نفسیات، خصوصی گفتگو، حیاتیات، تعارف وتبصرے اور خبرنامے وغیرہ کے خصوصی گوشے قائم کیے گیے ہیں۔ان گوشوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوش اور مسرت کا احساس ہوا۔میں اردو دنیا کے شمارے کا بہت شدت سے منتظر رہتا ہوں۔ شمارہ شائع ہوتے ہی اسے جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔مجھے اس بات سے بھی بہت خوشی ہوتی ہے کہ منجھے اور پختہ خیال لوگوں کے ساتھ ساتھ اردو دنیا نئی نسل کے لکھنے والوں کو بھی موقع دیتا ہے اور ان کے مضامین شائع کرتا ہے۔میں محسوس کرتا ہوں کہ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے کاندھوں سے کاندھا ملاتے ہوئے نئی نسل کے افراد اور ریسرچ اسکالر بہت دلجمعی کے ساتھ عمدہ اور وقت کے سلگتے ہوئے مضامین لکھ رہے ہیں۔ان کے اسالیب، زبان، مضامین اور خیالات کا ایک خاص معیار ہے۔اس حوالے سے خاص طور سے اردو دنیا ایک اہم پلیٹ فارم عطا کر رہا ہے۔ اس طور سے دیکھا جائے تو اردو دنیا کا رسالہ نئے پرانے ادیبوں کا سنگم بن گیا ہے۔

عبد الرحمن عابد، بٹلہ ہاؤس نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں نہایت اچھی اچھی معلومات ہوتی ہیں۔ وہ باتیں بھی آتی ہیں جو ہم اسکول یا کالج میں بھی نہیں پڑھ پاتے تھے اور نہ سن پاتے تھے۔اس کو پڑھنے سے ہر بار کچھ نہ کچھ نئی معلومات ملتی ہے۔

بشن چودھری، منڈی، گوبند گڑھ، پنجاب

ادارہ

بچوں اور نوجوان قارئین کے لیے اردو میں تخلیقی مواد کے سلسلے میں سہ روزہ ورکشاپ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر جسولہ میں بچوں اور نوجوان قارئین کے لیے اردو میں تخلیقی مواد تیار کرنے کے سلسلے میں سہ روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ ورکشاپ اس لیے اہم ہے کہ جب ہم تعلیم یافتہ سماج کی بات کرتے ہیں تو اس کا اہم پہلو بچے اور نوجوان ہوتے ہیں جن کی تربیت اور تعلیم ہماری ذمے داری ہے۔ بچے سماج کا اہم حصہ ہیں ان کو کیسے آگے لے جایا جائے۔ آج اسی مقصد کے تحت اردو کے اہم قلمکاروں کو مدعو کیا گیا ہے۔ تخلیق کار اور قارئین کے درمیان رشتہ جوڑنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں اسی کی ایک کڑی کی شکل میں اسے دیکھ سکتے ہیں، اس ورکشاپ میں کوشش ہوگی کہ اجتماعی طور پر جو نتیجہ نکلے گا اسے دلکش اور خوبصورت انداز میں 31 مارچ 2025 تک شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بچوں کی مشہور تخلیق کار اور مصنفہ مریم کریم اہلاوت نے کہا کہ بچوں کے لیے جس طرح ہم یہ سوچتے ہیں کہ انھیں کیا کھانا چاہیے کیا نہیں، اسی طرح یہ بھی سوچا جانا چاہیے کہ ان کے لیے کس طرح کی تخلیقات اور ادب کی ضرورت ہے۔ بچپن میں جو کہانیاں سنتے ہیں اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، بچوں کو چیزیں اس طرح بتانی چاہیے کہ براہ راست نہ ہو مگر بالواسطہ ان تک پیغام پہنچ جائے۔ بچوں کی کہانیاں اور میتھوڈولوجی ہماری زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔

مشہور فکشن نگار ذکیہ مشہدی نے کہا کہ بچوں کے لیے کم لکھا جا رہا ہے اور جو لکھا جا رہا ہے اس میں ایج گروپ اور نفسیات ولفظیات کا خیال نہیں رکھا جا رہا ہے۔ اگر ایک عمر کی سطح کا خیال رکھتے ہوئے بچوں کے تجسس کا خیال کرتے ہوئے کہانیاں تخلیق کریں تو ان کے ذہنی ارتقا اور نشو ونما میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بچوں کی کہانیوں میں تصویروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ تصویریں ہونی چاہیے، بچوں کی کہانیوں میں تشدد، فرقہ واریت اور فسادات وغیرہ موضوعات و مسائل سے گریز کرنا چاہیے، بچوں کے لیے تخلیقات لکھتے وقت ان کی تفریح طبع اور انبساط کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

بچوں کے بزرگ ادیب عابد سورتی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ بچوں کے لیے لکھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کچھ نیا سیکھیں اور ان کے لیے مواد ہمیشہ نئے انداز میں پیش کرنا چاہیے۔ اگر اچھا بیج بوئیں گے تو کل ہمیں اچھا پھل ملے گا،۔ ہمیشہ تحقیق اور تجسس کا عمل جاری رکھنا چاہیے اور فیکٹ سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے، بغیر تحقیق کے لکھیں گے تو اس کے غلط نتائج مرتب ہوں گے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) نے کی۔

لنچ کے بعد تکنیکی سیشن شروع ہوا جس میں توصیف بریلوی نے 'رومی کے سہانے دن' کے عنوان سے کہانی پیش کی جو خاندانی نامیات اور ہجرت پر مبنی کہانی ہے۔ شاہ تاج نے 'پالکی' کے عنوان سے اپنی کہانی پیش کی۔ یہ کہانی مہاراشٹر کے کلچر، ثقافت اور بھاجی فیسٹول پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر شہناز رحمان نے 'شان سلطانی' نامی افسانہ پیش کیا۔ جو تاریخی اور سائنس میوزیم کی سیر پر مبنی ہے۔ نہاں رباب نے 'ایک شخصیت ایسی بھی' کے عنوان سے مجاہد آزادی مولانا مظہر الحق کے حالات زندگی پر مبنی کہانی پیش کی۔ نثار احمد نے 'پٹنہ کی سیر' کے عنوان سے کہانی پیش کیا۔ نثار احمد نے اس کہانی میں پٹنہ کے تاریخی مقامات اور تاریخی عمارتوں کے حوالے سے بالتفصیل گفتگو کی۔

ان تمام کہانیوں پر موجود ماہرین تخلیق کار اور اسکولی طلبا و طالبات نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

سہ روزہ ورکشاپ کے دوسرے دن اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر شمس

اقبال نے کہا کہ جو کہانیاں سنائی گئی ہیں سب عمدہ ہیں مگر کہانیوں میں کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری اس پر توجہ دینے کی زیادہ ضرورت ہے۔ زبان و بیان اور عمر کی سطح کا بھی خیال رکھا جانا لازمی ہے۔ ہماری سماجی ذمے داری ہے کہ بچوں کو صحت منداور مثبت ماحول میں ایسا مواد فراہم کریں جس سے بچوں کے ذہن وفکر کا دائرہ وسیع ہو، ایسے مواد سے گریز کرنا چاہیے جو بچوں کو نفسیاتی مریض بنا دے۔ پروفیسر غضنفر نے کہا کہ بچوں کی کہانیوں میں ایک ایک لفظ کی اہمیت ہوتی ہے، کوئی لفظ بھرتی کا نہیں ہوتا، بچوں اور بڑوں کی کہانیوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ بچوں کی کہانیوں میں زبان، لفظیات، مقصد پر نظر رکھنی چاہیے۔ کہانی کا مقصد صرف نصیحت نہیں ہوتا بلکہ مزہ اور حظ بھی ہوتا ہے۔

دوسرے دن کے ایک سیشن میں دو معصوم بچوں محمد توصیف اور عافیہ سیفی نے صدارت کی اور کہانیوں پر جن تاثرات اور ردعمل کا اظہار کیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زمانی /تقویمی عمر کچھ بھی ہو مگر ادراکی عمر کے لحاظ سے وہ نہایت بالغ، باخبر اور بیدار مغز ہیں۔ دوسرے دن کا آغاز سلمان عبدالصمد کی کہانی 'چائے بگان' سے ہوا۔ اس میں تفصیل سے چائے کی کھیتی اور آسام کے کلچر سے متعلق بتایا گیا۔ دوسری کہانی حبیب سیفی نے 'موبائل کھلونا نہیں' کے عنوان سے پیش کیا۔ موبائل کے مثبت استعمال اور منفی اثرات کے بارے میں بچوں کو بتایا گیا۔ ڈاکٹر محمد علیم نے 'تان سین ایک عظیم موسیقار' کے عنوان سے کہانی پڑھی۔ تان سین ایک عظیم موسیقار تھے جو اپنی موسیقی سے عوام کا دل جیت لیتے تھے۔ اقبال برکی نے 'روبوٹ' کے عنوان سے کہانی پڑھی۔ یہ آرٹی فیشیل اینٹلی جینس پر مبنی ایک کہانی ہے۔ وقفۂ لنچ کے بعد سیشن کا آغاز نگار عظیم کی کہانی 'دوست' سے ہوا۔ اس کہانی میں انسان اور پرندے کی دوستی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سراج عظیم نے 'میں ہوں انڈیا گیٹ' پیش کیا۔ یہ انڈیا گیٹ کی تاریخ پر مبنی کہانی تھی۔ قاسم خورشید نے 'انقلاب کی آواز' کے نام سے کہانی پیش کی جو مجاہد آزادی اور عظیم شاعر حسرت موہانی کے حالات زندگی پر مبنی تھی۔ اس میں حسرت موہانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ثروت خان نے 'پریم دیوانی میراں' کے عنوان سے کہانی پیش کی۔ انیس اعظمی نے 'پھول

والوں کی سیر‘ کے عنوان سے کہانی پیش کی جو قدیم دہلی کی تہذیب وثقافت پر تھی۔ سبھی کہانیوں پر اسکولی بچوں اور ماہرین نے اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا۔

سہ روزہ ورکشاپ کے تیسرے دن کے سیشن کا آغاز ذکیہ مشہدی کی کہانی ’ایک سچ مچ کے راجکمار‘ سے ہوا۔ یہ مہاتما گوتم بدھ کے حالاتِ زندگی پر مبنی کہانی ہے۔ اس کے بعد مشتاق احمد نوری نے ’گفتگو‘ کے عنوان سے کہانی پڑھی جس پر موجودہ ماہرین نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے ’حیرت انگیز کارنامہ‘ کے عنوان سے کہانی پڑھی۔ یہ ایک تاریخی کہانی ہے جس میں راجستھان کے مشہور شہروں ٹونک اور جودھپور کے بارے میں حیرت زا باتیں بتائیں۔ خورشید اکرم نے ’شرارتی ڈینس‘ اور غضنفر نے ’بھولی ہوئی لومڑی‘ کے عنوان سے کہانیاں پیش کیں جسے موجود بچوں، نوجوانوں اور ماہرین نے خوب سراہا۔ وقفۂ لنچ کے بعد اختتامی سیشن ہوا۔ ورکشاپ کے شرکا نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا ورکشاپ پہلی بار منعقد ہوا ہے جس میں چھوٹے بچوں سے لے کر نوّے سال کی عمر تک کے لوگ شامل ہوئے۔ بچوں نے جس اعتماد اور بیباکی سے کہانیوں پر سوالات قائم کیے یقیناً وہ دلچسپ اور حیران کن تھے۔ اس سے قلمکاروں کو سمجھنے کا موقع ملے گا کہ آج کے بچوں کی نفسیات اور ان کے شعور وادراک کی سطح کیا ہے۔ اس موقعے پر مقررین نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل کا یہ خوشگوار تجربہ نئے تخلیق کاروں کی تربیت کے ساتھ بچوں کے لیے ایسا مواد تیار کرنے میں مددگار ہوگا جو دیگر زبانوں کے مقابل رکھا جاسکے۔

ورکشاپ کے تینوں دن جامعہ ملیہ اسلامیہ، اینگلو عربک اسکول اور دہلی کے مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات بھی موجود رہے، جنھوں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ورکشاپ کا اختتام ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) کے کلماتِ تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر کونسل کے اراکین ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، محمد بہلول، محمد افضل حسین خان، افروز عالم، فیضان الحق وغیرہ موجود رہے۔

■

خواجہ محمد اکرام الدین

سائبر پنک لٹریچر
(مشینی دور کا نیا ادبی رجحان)

اکیسویں صدی کی تیسری دہائی نے تخلیقی ادب کو ایک نیا رجحان دیا ہے۔
یہ دراصل ٹیکنالوجی کے بڑھتے دائرۂ اثر اور بازاری دنیا سے کارپوریٹ دنیا میں صارفیت کی اجارہ داری اور انسانی ذہن کے دوش بدوش مصنوعی ذہانت کی بالادستی نے انسانی معاشرے کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جسے ہم انسان اور مشین کے انضمام کا دور کہہ سکتے ہیں۔ آن لائن دنیا میں انسانی اور ڈیجیٹل تعاملات یا اشتراک اور برقی لین دین کی وجہ سے انسان اور مشین کے درمیان ایک حیرت انگیز طور پر فرق مٹ رہا ہے۔ ایسے اقتصادی اور ثقافتی ماحول میں ادب کا تخلیقی رویہ کئی جہتوں سے تبدیل ہوا ہے۔

اس نئے رجحان کی افہام و تفہیم سے قبل یہ پیش نظر رہے کہ ادب خواہ کسی بھی دور کا ہو اس میں معاصر عہد کا عکس کسی نہ کسی طور پر موجود ہوتا ہے اور بہت نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے، کیونکہ ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا ادب کی تخلیق ہم عصر معاشرے کے مزاج، اس کے تقاضے، مطالبات اور رجحانات پر ہوتی ہے کیونکہ مصنف یا تخلیق کار اپنے سماج اور معاشرے سے ہی سے مواد حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا جیسا معاشرہ ہوگا ویسا ہی ادب تخلیق ہوگا۔ ماورائی اور تخیلاتی دنیا سے زندگی کی اصل تصویر کشی، انسان اور انسانی زندگی کی تفہیم و تعبیر کی گتھیوں کو سلجھانے کی کاوشوں تک کا سفر، ادب کے تخلیقی رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ تخلیقی سطح پر یہ تمام تبدیلیاں فطری بھی معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن اس کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ادب کیا ہے اور تخلیق کیا ہے؟ ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تحریر کی اعلیٰ شکل جس میں احساسات و تجربات، مشاہدات، تفکرات اور تخیلات کو جمالیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہو وہ ادب ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'شعر و ادب تفسیر زندگی بھی ہے اور تصویر زندگی بھی'۔ ایک لسانی حقیقت یہ بھی ہے کہ زبان کسی خاص خطے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اس مخصوص خطے کا ادب اپنے مخصوص علاقے کے تہذیب و تمدن کا ہی عکاس ہوتا ہے۔ اس کلیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ادب میں علاقے اور خطے کے تہذیب و تمدن کی پیشکش لازمی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اکیسویں صدی کے تخلیقی ادب میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی ہے کہ اس میں گلوبل دنیا کی عکاسی اور ترجمانی اس طرح ہو رہی ہے کہ اس میں کسی مخصوص خطے کے بجائے عالمی گاؤں کی ترجمانی دیکھنے کو مل رہی ہے۔

> آن لائن دنیا میں انسانی اور ڈیجیٹل تعاملات یا اشتراک اور برقی لین دین کی وجہ سے انسان اور مشین کے درمیان ایک حیرت انگیز طور پر فرق مٹ رہا ہے۔ ایسے اقتصادی اور ثقافتی ماحول میں ادب کا تخلیقی رویہ کئی جہتوں سے تبدیل ہوا ہے۔

ٹیکنالوجی کا غلبہ اور کارپوریٹ ورلڈ کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ادب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ سائنس فکشن کی تیزی سے مقبولیت دراصل تفریحی ادب کی تخلیق کے ذریعے حصولِ زر اہم مقصد بن گیا ہے اور اب سائبر پنک لٹریچر نے ایک نیا ادبی رجحان اور رویہ پیش کیا ہے۔ ادب انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو معاشرتی بیانیہ ہے۔ ہر دور میں انسانی ذہن معاشرتی ترقی اور نشیب و فراز کے تحت اثر پذیر ہوتا ہے۔ نتیجتاً ادبی رویے اور رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ عصر حاضر میں ادب کے بدلتے تخلیقی رویے دراصل ہم عصر معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیوں کا اشاریہ ہیں۔

موجودہ دور برقی وسائل کی ان ترقیوں کا دور ہے جو وہم و گمان سے بھی پرے ہے، جس تیزی سے ٹیکنالوجی ہمیں حیرت زدہ کر رہی ہے، اسی تیزی سے ہماری زندگی کو بھی متاثر کر رہی ہے۔ ادب میں تنقیدی نظریات ادب کی پرکھ کے لیے ہیں اور تخلیقی رجحانات معاشرتی ترقی کا اشاریہ ہیں، اس لیے بدلتے دور کے تمام تخلیقی رجحانات و رویے کو سمجھے بغیر ادب کی قدر و قیمت کا تعین مشکل امر ہے۔ آج کے سائبر دور نے ادبی تخلیق کو ایک نئی سمت دی ہے۔ بالکل ایک نیا رجحان عالمی ادب میں سامنے آ رہا ہے۔ اسے 'سائبر پنک لٹریچر' کہا جاتا ہے۔

اردو ادب کے سرمائے کو اگر دیکھیں تو آج کی جو اصطلاح سامنے آ رہی ہے وہ تو موجود نہیں، لیکن اردو

میں ایسے تخلیقی سرمایے موجود ہیں جو آج کے سائبر پنک لٹریچر کے دائرے میں آتے ہیں۔ (اردو میں اس تخلیقی رجحان اور اس سرمایے پر آگے گفتگو ہوگی)

سائبر پنک لٹریچر

سائبر پنک لٹریچر جدید دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ممکنہ نتائج پر غور کرنے کا ایک تخلیقی زاویہ ہے۔ سائبر پنک کی اصطلاح 'سائبر نیٹک' اور 'پنک' کے مجموعے سے بنی ہے۔ 'سائبر نیٹک' کا تعلق کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی سے ہے، جب کہ 'پنک' ایک ثقافتی تحریک کی نمائندگی کرتا ہے جو عام طور پر سماجی اصولوں اور روایات کے خلاف ہوتی ہے۔ سائبر پنک کی کہانیوں میں ایک طرف انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی دکھائی جاتی ہے، جب کہ دوسری طرف سماجی ناانصافی اور اخلاقی بحران کی صورت حال بیان کی جاتی ہے۔ (ماخوذ: برقی وسائل کے حوالے)

یہ ایک نئی ادبی صنف ہے یا تخلیقی رجحان ہے جو مستقبل کی ٹکنالوجی، ڈیجیٹل کلچر اور سائبر نیٹکس (Cybernetics) کے مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ سائبر نیٹکس کے لغوی معنی ''مشینوں اور جانداروں دونوں میں مواصلات اور خودکار کنٹرول سسٹم کا سائنس ہے۔'' (بحوالہ آن لائن انگلش اردو ڈکشنری) اور ادبی اصطلاح میں سائبر نیٹکس ایک نئی اصطلاح ہے جس کے تحت معنی بین العلومیت، بین موضوعاتی تحریر و تخلیق کا تجربہ کیا جاتا ہے جو متعدد سیاق و سباق کا حامل بھی ہوتا ہے جیسے ماحولیاتی، تکنیکی، حیاتیاتی، علمی اور سماجی نظام اور برقی وسائل کی عملی سرگرمیاں اس میں مطالعے میں خصوصی طور پر شامل ہوتی ہیں۔ ڈیجیٹل عہد میں ایک بڑی تبدیلی یہ بھی آئی ہے کہ فیڈ بیک نظام میں آؤٹ پُٹ بھی اِن پٹ ہو جاتا ہے۔ ایسا ادبی رجحان عام طور پر ایک ڈیسٹوپیائی دنیا (Dystopian) میں ترتیب دیا جاتا ہے جہاں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے دور میں انسانی حالت کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کیمبرج ڈکشنری کے مطابق ڈیسٹوپیئن کا مفہوم ہے ''ایک بہت برا یا غیر منصفانہ معاشرہ جس میں بہت زیادہ مصائب ہوتے ہیں، خاص طور پر مستقبل میں ایک خیالی معاشرے کا تصور جو خوفناک حد تک منعکس ہو۔'' اور ووکیبلری ڈاٹ کام کے مطابق ''یوٹوپین ایک ایسے معاشرے کی وضاحت کرتا ہے جس پر کامل ہونے کا تصور کیا جاتا ہے۔ ڈسٹوپین اس کے بالکل برعکس ہے۔

سائبر پنک لٹریچر ایک ذیلی صنف ہے جو سائنس فکشن میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ صنف ٹیکنالوجی اور سائبر نیٹکس کے عناصر کو انسانیت اور سماجی مسائل کے تناظر میں بیان کرتی ہے۔ سائبر پنک لٹریچر عام طور پر مستقبل کی دنیا کی تصویریں پیش کرتا ہے جہاں ٹیکنالوجی انسانی زندگی کے ہر پہلو میں رچ بس چکی ہوتی ہے۔

یہ ایک ایسے خیالی معاشرے کی وضاحت کرتا ہے جو انتہائی غیر انسانی اور ممکن حد تک ناخوشگوار ہے۔'' اس طرح ڈیسٹوپیائی دنیا (Dystopian) کی یہ کہانیاں ایک ایسی دنیا میں ترتیب دی جاتی ہیں جہاں معاشرتی اور سیاسی صورت حال بہت خراب ہوتی ہے۔ ایک ڈیسٹوپیئن معاشرہ وہ ہوتا ہے جو ناپسندیدہ یا خوفناک ہوتا ہے، جس میں اکثر وسیع پیمانے پر مصائب، جبر اور ایک کامل معاشرے کا وہم ہوتا ہے۔ یہ یوٹوپیا کے برعکس ہے، جو ایک مثالی معاشرہ ہے جہاں سب کچھ کامل ہے۔

سائبر پنک لٹریچر ایک ذیلی صنف ہے جو سائنس فکشن میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ صنف ٹیکنالوجی اور سائبر نیٹکس کے عناصر کو انسانیت اور سماجی مسائل کے تناظر میں بیان کرتی ہے۔ سائبر پنک لٹریچر عام طور پر مستقبل کی دنیا کی تصویریں پیش کرتا ہے جہاں ٹیکنالوجی انسانی زندگی کے ہر پہلو میں رچ بس چکی ہوتی ہے۔

سائبر پنک لٹریچر فکشن کی صنف ہے جو مستقبل میں ٹیکنالوجی، کمپیوٹر نیٹ ورکنگ، مصنوعی ذہانت اور سائبر نیٹکس کی ترقی کے ساتھ ہونے والی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کو موضوع بناتی ہے۔ یہ لٹریچر عام طور پر ایک ڈیسٹوپیائی مستقبل کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں اعلیٰ ٹیکنالوجی اور معاشرتی زوال ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

نئی صدی کا نیا ادبی رجحان 'سائبر پنک لٹریچر' مذکورہ معاشرتی عناصر میں ان شناختوں کی حدود کو تلاش کرتا ہے اور ان کی دوبارہ وضاحت کرتا ہے۔ اس کے کردار تضادات اور پیچیدگیوں کی تجسیم ہے جو ایک ایسے دور میں موجود ہے جہاں حقیقت اور نقل، انسان اور مشین، خود اور غیر کے درمیان فرق ممکنہ حد تک موہوم ہے۔ سائبر پنک ادب میں خصوصی طور پر ان خطوط پر ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔ لیکن سائبر پنک لٹریچر نہ صرف تفریح فراہم کرتا ہے بلکہ یہ قارئین کو ٹیکنالوجی اور مستقبل کے بارے میں گہرے سوالات پر غور کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

سائبر پنک لٹریچر کے موضوعات

انسان اور مشین کا انضمام، ڈیجیٹل کلچر اور شناخت، ٹیکنالوجی کا استحصال، کارپوریٹ کنٹرول (اقتصادی اجارہ داری)، معاشرتی اور اقتصادی عدم مساوات وغیرہ ہیں۔

سائبر پنک لٹریچر کی خصوصیات

ٹیکنالوجی کا غلبہ: سائبر پنک کہانیوں میں انتہائی جدید اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا غلبہ ہوتا ہے۔

اینٹی ہیرو کردار: ان کہانیوں کے مرکزی کردار اکثر روایتی ہیرو سے مختلف ہوتے ہیں اور انھیں اینٹی ہیرو کہا جاتا ہے۔

انسانیت کا بیانیہ: سائبر پنک لٹریچر میں انسانی حالت، شناخت اور ٹیکنالوجی کے ساتھ انسانی تعلقات کا گہرا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

سائبر پنک کے مشہور مصنفین

ولیم گبسن: 'نیورومانسر' (Neuromancer) ان کی مشہور ترین کتاب ہے جو سائبر پنک لٹریچر کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ 'بروس اسٹرلنگ' کی کتابیں بھی سائبر پنک موضوعات سے متعلق ہیں اور ان کے مضامین میں اس صنف کی تاریخ اور فلسفہ بھی شامل ہے۔

اردو ادب کے تخلیقی سرمایے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اردو میں اس نئے ادبی رجحان کے تحت ابھی تک کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ہے، مگر اردو کے افسانوی ادب میں پہلے ہی سے ایسی تخلیقات موجود ہیں جن کو اس دائرے میں لا سکتے ہیں۔ ایسی تخلیقات میں تقلیب، جسم اور ماورائی دنیا کی مہمات اور کسی قدر مستقبل کی دنیا کی تعبیر و تفہیم کو دیکھا جاسکتا ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ جس طرح اردو ادب نے ہمیشہ نئے رجحانات کا استقبال کیا ہے، اس سمت میں بھی پہل ہوگی اور نئے رجحان کے زیر اثر ایسی تخلیقات سامنے آئیں گی۔

■

Prof. Khwaja Md Ekramuddin
Professor, Centre of Indian Languages
School of Language
Literature and Culture Studies, JNU
New Delhi- 110067
Mob.:9717977743
khwajaekram@gmail.com

ریاض توحیدی

تخلیقی تنقید اور سریندر پرکاش کی سحر انگیز افسانہ نگاری

ایک نقاد کا کام ہوتا ہے کہ وہ 'جتنا آپ جانتے ہیں' کے ساتھ ساتھ وہ بھی بتائے جتنا آپ نہیں جانتے ہیں۔

ہر قاری کی اپنی مطالعاتی ترجیحات ہوتی ہیں' کوئی راست اسلوب کو پسند کرتا ہے اور کوئی علامتی یا استعاراتی اسلوب سے محظوظ ہوجاتا ہے اور ادب میں دونوں کا چلن ہے۔ دراصل معیاری تخلیق سحر انگیز کیفیت کی حامل ہوتی ہے تو شعر و فکشن میں یہ جادو تخیل آمیز تخلیقی فن کاری سے ہی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس ضمن میں ان گنت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جیسے غالب کی شاعری میں استعاراتی وتلمیحاتی اور علامتی فن کاری کا یہ سحر، ان کے دیوان کی پہلی ہی غزل 'نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا' یا خلیل جبران کے فکشن یا سریندر پرکاش وغیرہ جیسے کئی اور افسانہ نگاروں کے افسانوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میں جب بھی اس قسم کے تخلیق کاروں کی تخلیق پڑھتا ہوں تو دل و دماغ پر جادوئی کیفیت (Magical Condition) طاری ہوجاتی ہے اور تخلیق کی یہی جادوئی کیفیت فن کاری کہلاتی ہے۔ جس کی طرف غالب نے بھی اشارہ کیا تھا کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

سریندر پرکاش (مئی 1930 - نومبر 2002) کا ایک شاہکار افسانہ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' ایم اے کے زمانے میں پڑھا تھا اور اس کے تخلیقی اسلوب' علامتی رچاؤ اور فنتاسی (Fantacy) کے تاثر نے سحر زدہ کر دیا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سریندر پرکاش کا شمار اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی فنی خوبی نے ہی انھیں بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ جیسا کہ معروف فکشن نگار انور سجاد اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

''...سریندر پرکاش نے 60 کی دہائی سے اب تک نئے افسانے کی تخلیق اور ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے اور اب وہ اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔''

(بحوالہ کتاب سریندر پرکاش شخصیت اور فن: مرتب مظہر سلیم، ص 390)

شعر میں شعریت اور افسانے میں افسانویت (Fictionality) ہونی چاہیے اور سریندر پرکاش کے افسانوں میں افسانویت جگہ جگہ نظر آتی ہے اور ایک خوبی ان کے بیشتر افسانوں میں یہ نظر آتی ہے کہ ان کا تھیم فی البدیہہ احساس کے ساتھ اس طرح کہانی میں ڈھل جاتا ہے کہ افسانہ کسی قسم کے منطقی انجام (Logical end) کے برعکس قاری کے ذہن کو ایک تحیر انگیز فضا (Haunted Space) کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر یہ تحیر و استعجاب کی گرفت قاری کے ذہن کو کافی دیر تک جکڑ کر رکھ دیتی ہے۔ بقول نقاد اور فکشن نگار شمس الرحمٰن فاروقی:

''ان [سریندر پرکاش] کے افسانے کے واقعات میں زمانی تسلسل اور نقطۂ آغاز و اختتام نہیں ہے۔ یہ کوئی بنا بنایا قصہ نہیں کہتے' بلکہ ان کے قصہ کی حرکت گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے اور پیچھے دونوں طرف اس قدر برابر مقدار میں ہے کہ ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

(مجموعہ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، پیش لفظ، شمس الرحمٰن فاروقی، ص 10)

اس ضمن میں کئی افسانوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ جیسے رونے کی آواز، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، رہائی کے بعد، نئے قدموں کی چاپ، اپنے آنگن کا سانپ، پیاسا سمندر، تلقارمس، بجوکا، سرنگ، آرٹ گیلری، چھوڑا ہوا شہر، تعاقب، بازگوئی، ہم صرف جنگل سے گزر رہے تھے، جمغورہ الفریم، برف پر مکالمہ' علامت کے آر پار، ساحل پر لیٹی ہوئی عورت، بالکنی وغیرہ۔

سریندر پرکاش کے بیشتر افسانوں میں نفسی کشمکش (Psycho-struggle) کی فضا طاری ہے اور کردار جیسے خواب کی دنیا میں چل پھر رہے ہیں اور افسانہ نگار کردار کی تحلیل نفسی (Psycho-analysis) کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن اور تکنیک کی سطح پر ان کے افسانے 'اردو کے روایتی افسانے کے فنی اور تکنیکی اسلوب سے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں اور اپنا عمدہ تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً افسانہ 'بازگوئی' میں مرکزی کردار، جو کہ صیغہ واحد میں بطور راوی اپنی حاضر کردار نگاری ظاہر کر رہا ہے، حال اور ماضی کے فکری، تہذیبی، علمی اور نفسیاتی انسلاک کی نمائندگی کرتا ہے اور نفسیاتی سطح پر افسانہ نگار کردار کی نفسیاتی باز رسانی (Psychological feed back) کرتا دکھائی دیتا ہے' تاہم اس دوران وہ تہذیب و تمدن کے آپسی انسانی رشتے کو اجاگر کرتا ہے نہ کہ کردار کی نجی نفسیاتی پیچیدگیوں کو مس کرنے تک محدود رہتا ہے۔ کردار صدیوں پرانے ایک تاریخی شہر کے عجائب گھر میں جاتا ہے تو وہاں پر قدیم زمانوں کے

موجود عجیب وغریب رسم الخط کے نسخے اسے حیران کردیتے ہیں لیکن عجائب گھر کا افسر جب اسے ایک شوکیس میں رکھا ہوا پرانا مسودہ دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ کئی ماہر لسانیات اس مسودے کو پڑھنے اور سمجھنے میں سر کھپاتے رہے لیکن کچھ خاص ہاتھ نہ آیا، کیونکہ یہ کوئی پرانی داستان ہے، مرکزی کردار اس مسودے کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے یہ اسی کی تحریر ہے:

’’میں اس کی بات غور سے سن رہا تھا اور میری نظریں مسودے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ تحریر کچھ جانی پہچانی لگی....پھر اس تحریر کے کچھ لفظ تصویروں کی طرح میرے ذہن میں ابھر آئے...پھر جیسے صحرا میں کوئی تیز بگولہ اٹھا.... اور ساری بات آناً فاناً میرے ذہن میں ایک کلی کی طرح چٹک گئی، وہ میری ہی تحریر تھی۔ میں غیر ارادی طور پر چیخ اٹھا۔‘‘

لیکن یہ حرکت دیکھ کر افسر اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس قدیم تحریر کو ماہر لسانیات پہچانے میں ناکام ہوئے اور یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، افسر اس کی نفسیاتی خوشی دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے:

’’میں آپ کی قدر کرتا ہوں۔ اپنے ورثے کو ہمیں اسی طرح اپنانا چاہیے۔‘‘

کردار جب افسر کی حیرانی کو بھانپ جاتا ہے تو وہ روانی کے ساتھ تحریر پڑھتا ہے اور افسر حیرت انگیز مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

’’آپ نے مجھے زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا دیا ہے جناب والا! یہ ہزاروں سال پرانی تحریر آپ پانی کی روانی کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ کیا آپ اس کا مطلب بیان فرمائیں گے؟‘‘

جب کردار اس قدیم داستان کے بارے میں بتاتا ہے تو افسر خوش ہو کر عجائب گھر کے سارے عملے کو وہاں پر جمع کرتا ہے۔

اس کے بعد کردار مسودہ اٹھا کر گھر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ’’ہزاروں سال پہلے کی اپنی زندگی کا ایک ایک واقعہ میرے دھیان میں آ گیا تھا۔‘‘

اردو کے چند اہم افسانے خصوصاً علامتی اسلوب کے حامل افسانے پڑھنے، سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جیکف دریدا کی کتاب ’Acts Of Literature‘ اور رولاں بارتھ کی کتاب 'The Pleasure Of The Text' کے مباحث بڑے کارآمد نظر آتے ہیں۔ دریدا کی کتاب فلسفۂ ردتشکیل (Philosophy of deconstruction) کو بحث بناتے ہوئے ادبی متون کے یک رخی معنی و تفہیم کو چیلنج کرتے ہوئے متن کے لسانی وثقافتی اور متنوع متون کے آپسی لسانی و تکنیکی اور معنوی وثقافتی رشتوں کے تنقیدی ڈسکورس کو سامنے لاتی ہے۔ 472 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 1991 میں شائع ہوئی تھی اور اس کی تھیوری نے تنقید میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ رولاں بارتھ کی کتاب 'The Pleasure of the Text' 1973 میں سامنے آئی تھی۔ اس کتاب کے لسانی وتنقیدی مباحث اپنی جگہ، تاہم بارتھ ایک قاری کو متن/تخلیق سے مسرت حاصل کرنے پر زور دیتا ہے کہ کس طرح مطالعہ کرنے کے دوران انسان جمالیاتی مسرت حاصل کر سکتا ہے۔

دریدا اور بارتھ کی تھیوریز یا کتابوں کا حوالہ اس لیے مناسب لگا کیونکہ سریندر پرکاش کے کئی افسانے لسانی اور فنی طور پر ردتشکیل مطالعے کی عکاسی کرتے ہیں اور قرأت سے لطف اندوز ہونے کا سحر رکھتے ہیں۔ دریدا کی کتاب کے تعارف یا پیش لفظ میں Derek Attridge نے استفہامیہ انداز میں اس کتاب کے مباحث اور کسی بھی تخلیق سے متعلق عمدہ بات کہی ہے کہ ’’کب اور کس طرح ایک نقش/تحریر ادب بن جاتی ہے اور وجود میں آنے کے بعد یہ کون سا مقام متعین کرتی ہے۔‘‘

"When and how does an inscription become literature and what takes place when it does." (Book:Acts of literature, P.2)

اور متن کی قرأت سے لطف اندوز ہونے سے متعلق رولاں بارتھ نے اپنی کتاب 'The pleasure of the text' میں خوبصورت بات کہی ہے: ’’آپ کی تحریر خود ثابت کر کے میرے شوق مطالعہ کو ابھارے۔‘‘

"The text you write must prove to me that it desires me."

تو اس تعلق سے سریندر پرکاش کے چند اہم افسانوں کے تخلیقی رچاؤ اور فنی ومعنوی خوبیوں کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ کچھ حد تک واضح ہو جائے کہ یہ افسانے کیوں خود کو پڑھوانے کی دعوت دیتے ہیں اور دوران مطالعہ کس طرح کی لطافت فراہم کرتے ہیں۔ سریند پرکاش کے کئی افسانے پراسرار ماحول کا ایسا تخلیقی جہاں معلوم ہوتے ہیں جو قاری کے دماغ کو اس اسرار کے کھوجنے کے لیے فکری گشت پر لگا دیتے ہی، جس کی مثال علامتی و تجریدی افسانہ ’دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم‘ ہے۔ یہ افسانہ علامتی اسلوب اور تجریدی فکر کا حامل ہونے کے باوجود سریندر پرکاش کی افسانہ نگاری کی پہلی شناخت بن گیا۔

افسانہ ’دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم‘ تخیل اور تخلیقی اسلوب کا حامل ایک ایسا دلچسپ افسانہ ہے، جس کی کہانی میں سحر انگیز فضابندی نظر آتی ہے۔ یعنی اس میں تخیل (Imagination) اور تخلیقی فن کاری (Creative artistry) اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور جدید افسانوں میں یہ ایک ایسا معیاری افسانہ ثابت ہوا جو آج بھی بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ نہیں تو اس دور کے بیشتر افسانے تجریدی پن کی بھینٹ ہی چڑھ گئے۔ اس افسانے کے فارم اور تکنیک کی خوبی اور دلکش بیانیہ پڑھنے والے کو محظوظ کر دیتا ہے۔ معنوی ترسیل میں مشکل ہونے کے باوجود پڑھنے کے بعد قاری پر فکشن کا خوشگوار تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ رسالہ ’تکمیل‘ (بھیونڈی۔ جنوری تا جون 2007) کے ایک انٹرویو میں انھوں نے اپنے افسانوں کے بارے میں کہا تھا کہ:

’’آج اردو میں تیس سال پہلے کی کہانی لکھی جا رہی ہے جب کہ کچھ نیا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ہمیشہ علامتی کہانیاں لکھیں لیکن وہ سپاٹ نہیں ہیں۔ ان میں قاری کو پکڑنے کی طاقت ہے۔ نئی بات ہے۔ بڑا مشکل کام ہے علامتی افسانہ لکھنا۔‘‘

واقعی جب ہم ان کے علامتی افسانے پڑھتے ہیں تو ان میں الفاظ وخیالات کا گورکھ دھندہ نظر نہیں آتا اور علامتی افسانہ ہر کس و ناکس کے لکھنے کا کام نہیں ہے اور علامتی نوعیت کا افسانہ ’دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم‘ اگرچہ اپنی ترسیل میں مشکل نظر آتا ہے لیکن ابتدا سے انجام تک قاری کو ضرور پکڑ کر رکھتا ہے۔ اس افسانے کی ابتدا نیم داستانی اسلوب میں اس طرح سے کی گئی ہے کہ قاری پہلے ہی خیال سے خوش ہو جاتا ہے کہ کچھ خاص پڑھنے کو مل رہا ہے۔ راوی شروع میں ہی کسی سفر یا ہجرت کرنے کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

’’سمندر پھلانگ کر ہم نے جب میدان عبور کیے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیل گئیں۔ میں ذرا رکا اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ میں بے پناہ اپنائیت کے احساس سے لبریز ہو گیا....

تب علیحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کی اور میں انتہائی غم زدہ سرجھکائے وادی میں اتر گیا۔''

یہاں پر افسانہ نگار نے روایتی افسانے کی ابتدائی منظر نگاری کے برعکس تکنیکی سطح پر سیدھے قصے کا آغاز واقعاتی اسلوب میں کیا ہے اور قاری کی سوچ کو شروع میں ہی اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوا ہے۔ ضمائر کے استعمال 'ہم'، 'ان' سے ظاہر ہے کہ راوی ایک قافلے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا وہ بھی ایک حصہ ہے لیکن ان سے اپنائیت کے جذبے کے باوجود وہ لوگ اپنی ہی زندگی کے جوکھم جھیلنے میں نظر آتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ لوگ کس بنا پر سفر یا ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جارہے تھے۔ اب راوی ان لوگوں کی سردمہری دیکھ کر جدا ہونا ہی مناسب سمجھتا ہے اور غم زدہ ہوکر سر جھکائے ایک وادی میں اتر جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی اقتباس میں افسانہ منفی سے مثبت ماحول کی منظر کشی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ پیچھے مڑکر دیکھتا ہے تو وہ لوگ تھوتھنیاں اٹھائے اسے دیکھ رہے تھے اور سر ہلا ہلا کر اپنی رفاقت کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن ان کی گردنوں میں دھات کی گھنٹیاں تھیں، جو کہ ان کی مجبوری ولاچاری کی عکاسی کرتی تھیں یا اپنی تہذیبی وثقافتی جڑوں سے جڑے رہنے کا اشارہ کرتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز الوداع الوداع کا اشارہ کر رہی تھی۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے جو جدائی اور اپنائیت کا دکھڑا سنا رہے تھے۔

اب یہاں تک افسانہ ابہام آمیز ماحول میں ایک قافلے کی ہجرت، بے بسی اور اپنوں سے بچھڑنے کا منظر دکھا رہا ہے۔ یہ قدیم دور سے جدید دور کی طرف قدم بڑھانے کا قصہ بھی ہوسکتا ہے اور مجبور ہوکر اپنی زمین سے ہجرت کا درد بھی۔ یہیں سے افسانے کا متن ردِ تشکیل تھیوری کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر متعین معنی (Fixed meaning) کے بجائے غیر متعین معنی کا لسانی منظر سامنے آرہا ہے۔ ایک طرح سے افسانہ ابہامی کیفیت خلق کرکے معنوی تضاد (Semantic paradox) پیدا کر رہا ہے اور یہی خوبی افسانے کو تخلیقی رچاؤ کی حامل بنا دیتی ہے۔

اب افسانہ آگے بڑھتا ہے اور ہجرت کرنے کے بعد وادی میں داخل ہونے کی منظر نگاری سامنے لا رہا ہے۔ یہاں پر ایک چیز دیکھنے کی ہے کہ افسانے کا پلاٹ کہیں پر ٹوٹتا نہیں بلکہ قصہ کردار کے سفر سے آگے بڑھ رہا ہے اور پھر نیا قصہ جو کہ عنوان 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' کی طرف بڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔

یہاں سے افسانہ قدیم دور کی زندگی اور جدید دور کی زندگی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اب کردار جس مکان کی منظر کشی کر رہا ہے وہ جدید سہولتوں سے مزین ہے۔ کمرے میں مصنوعی گل دان کی علامت جدید دور کے انسان کی زندگی کے مصنوعی ٹھاٹ باٹ کا اشارہ کر رہی ہے کیونکہ فطری زندگی میں زندگی بھی اپنی ہوتی ہے اور احساس بھی اپنا لیکن یہاں پر راوی کہتا ہے:

''ہاتھ میرا ہے اس لیے احساس بھی میرا ہے، لیکن گل دان نے میرے احساس کو قبول نہیں کیا۔''

سریندر پرکاش کے افسانوں کی موضوعاتی جہات متنوع موضوعات و مسائل کی عکاسی کرتی ہیں جن میں قاری کو مختلف رنگ کی سماجی وانسانی اور سیاسی ونفسیاتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

زندگی میں جب احساس کا جذبہ ہی ختم ہوجائے تو وہ بے مزہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ افسانہ مزید آگے بڑھتا ہے اور افسانہ نگار مکان کی منظر نگاری کے دوران کہانی کو مختلف قسم کے پیش منظر شیڈز (Foregrounding shades) دے کر کچھ حد تک ڈرامائی سین کی صورت دیتا ہے جیسے:

''میں نے اس تصویر کو اٹھا کر دیکھا' ایک خوش پوش آدمی گود میں ایک ننھی سی بچی کو اٹھائے بیٹھا ہے اور اس کے کندھے سے کندھا بھڑائے ایک عورت بیٹھی ہے۔ دونوں مسکرا رہے ہیں۔''

''نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کبھی ایسی ہی تصویر کھنچوانے کے لیے میں بھی بیٹھا تھا اور فوٹو گرافر نے کہا تھا'' ذرا مسکرائیے!''

ہم تینوں مسکرائے اور فوٹو گرافر نے کہا'' تھینک یو' اور ہم بیٹھ گئے۔''

افسانے کا یہ حصہ شعور کی رو (Stream of consciousness) کی عکاسی کر رہا ہے کیونکہ راوی احساس کی سطح پر حال کے منظر میں ماضی کی یاد کو دہرا رہا ہے۔ کبھی وہ خود کا شعوری رشتہ سمندر سے جوڑ رہا ہے اور کبھی سمندر کے کنارے کے کسی شہر کو یاد کرتا ہے۔

افسانے میں مکان یا ڈرائنگ روم ایک ایسی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جو کردار اور پوری کہانی کے لیے فکشن گیلری بن جاتا ہے کیونکہ افسانے کا بیشتر پلاٹ اسی ڈرائنگ روم کے اردگرد گھومتا رہتا ہے اور ایک طرح سے پورا قصہ ہی ڈرائنگ روم کے اندر ایک اسٹیج کی طرح سامنے آتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو افسانہ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ' کا پلاٹ، فن اور تکنیک کی سطح پر توضیحی اسلوب (Expository style) کے بجائے علامتی اسلوب (Symbolic style) پر استوار ہوا ہے اور موضوعاتی طور پر ماضی کے قصے سے شروع ہوکر جدید دور کی زندگی، انسانی رشتوں کی بے مائیگی، مادی وسائل کی آرائش کے باوجود انسان کی تنہائی، درد وکرب، بوڑھے کی کردار نگاری میں انسانی زندگی کے گزرے ہوئے دور کی اپنائیت، سانپ کی صورت میں انسانی سوچ وفکر میں پھیلا ہوا زہر' اور انسان کا تنہائی کا کرب جھیلتے جھیلتے مصنوعی زندگی کے بجائے فطری زندگی گزارنے کی طرف روحانی واپسی وغیرہ جیسے کئی موضوعات ومسائل کو فکشنائز کر رہا ہے، جو کہ تفہیم میں مشکل محسوس ہونے کے باوجود اپنا افسانوی رنگ پوری چمک دمک سے سامنے لا رہا ہے اور قاری پڑھنے کے دوران افسانے کے سحر میں کھو سا جاتا ہے، یہ اس افسانے کی ایک اہم تخلیقی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانوں کی موضوعاتی جہات متنوع موضوعات ومسائل کی عکاسی کرتی ہیں جن میں قاری کو مختلف رنگ کی سماجی وانسانی اور سیاسی ونفسیاتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ سریندر پرکاش کے ایسے ہی افسانوں میں ان کا افسانہ 'بجوکا' (Scare Crow) بھی شامل ہے جو اردو کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس افسانے کی فنی خوبیوں میں ایک تو افسانوی کہانی پن موجود ہے اور دوسرا کردار نگاری میں علامتی رنگ بصورت بجوکا، ہوری، درانتی، انگریز کا سرخ لباس اور ہیٹ وغیرہ نمایاں ہے اور اسی علامتی رنگ نے افسانے کو فنی طور پر ایک معیار عطا کیا ہے۔ اس افسانے میں فکشن کے روایتی اسلوب یعنی کہانی پن، کا ہی استعمال کیا گیا

ہے نہ کہ افسانہ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' کی جدید تکنیک کا، لیکن اس کے باوجود تنقیدی نقطہ نگاہ سے افسانے کی بنت کاری میں بین المتونیت (-Inter textuality) کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ بین المتونیت کا مطالعہ کسی بھی متن میں موجود کسی دوسرے متن (Text) یا کسی بھی ادبی تخلیق میں کسی اور تخلیق' چاہے وہ اس سے پہلے وجود میں آئی ہو یا اسی دور سے تعلق رکھتی ہو، کا کوئی خیال، موضوع، تکنیک، اسلوب، کردار وغیرہ کی فنی موجودگی (Artistic Existence) ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں افسانہ 'بجوکا' موضوع اور کردار نگاری میں کسان 'ہوری' اور استحصال کے جدید سرمایہ دارانہ نظام (Modern Capitalistic setup) بصورت 'بجوکا' بین المتن رشتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ چونکہ افسانے کا مرکزی کردار 'ہوری' بنیادی طور پر پریم چند کے مشہور ناول 'گئودان' کے ہیرو سے ماخوذ ہے جو کہ ناول میں کسانوں پر ہو رہے استحصال کی نمائندگی کرتا ہے لیکن افسانے میں اسی کردار کو ملک کی آزادی کے بعد 'جے کسان کے انقلابی نعرے' کے باوجود نئے استعماری نظام کے زیر اثر بصورت بجوکا اور اس کے انگریزی لباس کا غلام اور مظلوم بن کر دکھایا گیا ہے اور افسانہ نگار کا مقصد واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند کا ناول 1936 میں جس قسم کی اندوہ ناک صورت حال کو موضوع بنا رہا تھا، اتنے برس بیت جانے اور ملک کی آزادی کے باوجود کسانوں کی وہ صورتحال کسی نہ کسی صورت میں جوں کی توں موجود ہے۔ افسانے کی یہی تخلیقی قوت اسے شاہکار افسانے کے زمرے میں شامل کرتی ہے۔ افسانے میں بجوکا نہ صرف ہوری کی کمائی ہوئی فصل کا چوتھائی حصے کا دعویٰ دار بن جاتا ہے بلکہ نئے نظام بصورت پنچائیت کے فیصلے کو بھی اپنے حق میں کرواتا ہے:

''آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس نے پنچایت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کرلیا...''

افسانہ 'بجوکا' بنیادی طور پر ملک کے جدید اقتصادی نظام پر فنکارانہ طنز (Artistic Irony) ہے، جس کی کہانی کی تخلیقی معنویت (Creative significance) یہ ہے کہ اس میں ایک بے جان (Inanimate) بجوکا کو جاندار (Animate) علامت بنایا گیا ہے اور معاشی و معاشرتی اور سیاسی استحصال کو فن کے پیکر میں ڈھال کر علامتی مقصد (Symbolic goal) کو پورا کیا گیا ہے جس میں افسانہ نگار پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔ کیونکہ اس افسانے کے توسط سے جو پیام ترسیل ہوجاتا ہے وہ قاری کے سامنے کھل کر آتا ہے بقول فیض احمد فیض

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

مستند فن کار (Genuine Artist) اپنی تخلیق میں خارجی ماحول کے مشاہدے کو داخلی احساس کا حصہ بنا کر اپنے فنی تجربے کے ساتھ پیش کرتا ہے' جب ہی تو وہ تخلیق اپنی مخصوص فنی صورت اختیار کر جاتی ہے اور پھر وہ فنی سطح پر تصوری حقیقت (Conceptual realism)

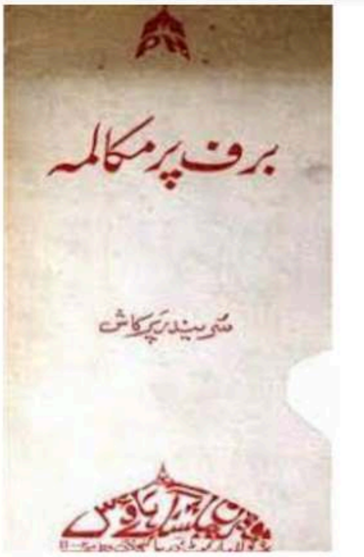

کی مظہر بن جاتی ہے اور افسانہ تو اس تصوری حقیقت کا ایک ایسا تخلیقی روپ ہوتا ہے جو کہانی کی صورت میں قاری کے حافظے کا حصہ بن جاتا ہے۔ سریندر پرکاش کے کئی افسانے ایک مستند فن کار کے فنی تجربے کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں اور سماجی ونفسیاتی موضوعات ومسائل کے تخلیقی روپ میں تصوری حقیقت کے نمونے بن گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے دہائیوں پہلے وجود میں آکر آج بھی قارئین کے حافظے کا حصہ بن چکے ہیں، جن میں 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'، 'بجوکا'، 'باز گوئی' تو خاصے مقبول ہوچکے ہیں، اس کے علاوہ بھی کئی اور افسانے ہیں جو فن کاری کا عمدہ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان میں رونے کی آواز، رہائی کے بعد، نئے قدموں کی چاپ، اپنے آنگن کا سانپ، پیاسا سمندر، تلقارمس، سرنگ، آرٹ گیلری، چھوڑا ہوا شہر، تعاقب باز گوئی، ہم صرف جنگل سے گزر رہے تھے، برف پر مکالمہ، علامتوں کے آر پار، ساحل پہ لیٹی ہوئی عورت' بالکنی' وغیرہ شامل ہیں۔

افسانہ 'رونے کی آواز' کا افسانوی ماحول اس طرح سے تشکیل دیا گیا ہے کہ جیسے پورا شہر رونے کی چیخ و پکار کا حصہ بن چکا ہے۔ چند افسانوں میں اساطیری ماحول بھی نظر آتا ہے جیسے افسانہ 'ساحل پہ لیٹی ہوئی عورت'۔ یہ افسانہ داستانی اسلوب میں تخلیق ہوا ہے۔ اس کے مرکزی کردار ایک شکاری مرگول اور ایک پراسرار سیاہ فام الف ننگی عورت ہیں۔ بنیادی قصہ انھیں دو کرداروں کے اردگرد گھومتا ہے۔ مرگول ایک ماہر شکاری ہونے کے باوجود قوت مردمی سے محروم ہوتا ہے لیکن اس سیاہ فام عورت کو دیکھ کر اس کی مردانگی جاگ اٹھتی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ایک غار تک جا پہنچتا ہے لیکن عورت اندھیری غار میں داخل ہوجاتی ہے اور مرگول اندر جانے سے خوف کھاتا ہے اور اسے آواز دے کر باہر سے ہی اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ پھر قصہ آگے بڑھتا ہے اور پتھر مارنے کی شرط پوری نہ ہونے پر اسے مردانگی کے بجائے اپنی بینائی سے محروم ہونا پڑتا ہے جو کہ ایک کالے ناگ کے ڈسنے سے ہوجاتا ہے۔

'سرنگ' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں کردار کی خارجی اور داخلی کشمکش کی تحیر انگیز کیفیت کو خلق کیا گیا ہے۔

افسانہ 'باز گوئی' ایک طویل افسانہ ہے، ایک طرح سے اس افسانے میں دوسرے کئی افسانوں کے چند کردار اور موضوعات کو فنی چابکدستی سے سمیٹ لیا گیا ہے۔

سریندر پرکاش کے چار افسانوی مجموعے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم (1968)، برف پر مکالمہ (1981)، باز گوئی (1988)، حاضر حال جاری (2002) شائع ہوچکے ہیں۔ ان مجموعوں کے بیشتر افسانے تخلیقی پن سے مزین ہیں۔ ابتدائی افسانوں کے برعکس اگرچہ بعد کے افسانوں میں علامتی وتجریدی ابہام قدرے کم نظر آتا ہے لیکن پھر بھی ہر افسانہ تخلیقی رچاؤ کا حامل نظر آتا ہے اور بیشتر افسانے کہیں نہ کہیں اپنی علامتی ساخت برقرار رکھے ہوئے ہیں جس سے ان افسانوں کی فنی وتخلیقی اور تکنیکی ندرت بڑھ جاتی ہے اور معنوی ہم آہنگی (Semantic Coherence) میں استحکام پیدا ہوگیا ہے۔

■

Dr. Reyaz Tauheedi
Wadipora Handwara
Kashmir 193221 (J&K)
Cell:9906834877
drreyaztawheedi777@yahoo.com

رامپور میں تذکرہ نگاری کا اجمالی جائزہ

نظام الحسن

علم و ادب کے حوالے سے رامپور کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ 1774 میں بہ حیثیت روہیلہ ریاست قائم ہونے والا یہ شہر اپنی ڈھائی سو سالہ تاریخ میں انتہائی روشن اور تابناک منظر نامہ رکھتا ہے۔نواب فیض اللہ خاں بانیِ ریاست رامپور کے زمانے 1774 سے تا حال، علم و ادب کے میدان میں اس شہر نے ایسے گوہر نایاب پیدا کیے ہیں جن کی آب و تاب اور قدر و قیمت کا ایک زمانہ معترف ہے۔

رامپور کے ادبی پس منظر کی جب بھی بات کی جاتی ہے تو عام طور سے اردو شاعری کا ذکر ہوتا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے بڑے شہروں کے بعد رامپور بھی اردو شاعری کا اہم مرکز رہا ہے۔

لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہاں صرف شاعری ہی کو فروغ ملا۔ یہاں علم و ادب کے ہر میدان میں کار ہائے نمایاں انجام دیے گئے البتہ شاعری کی کثرت رہی اسی لیے شاعری کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

رامپور میں تذکرہ نگاری کی روایت بھی انتہائی قدیم ہے۔ 1774 سے 1780 کے درمیان دو اہم تذکروں کے نام ملتے ہیں جن میں ایک کا تعلق رامپور سے براہ راست ہے اور دوسرے کا بالواسطہ۔ بالواسطہ تکمیل پانے والا تذکرہ مولوی قدرت اللہ شوق کا 'طبقات الشعرا' ہے جس کو شوق نے لکھنؤ، بدایوں، آنولہ، بریلی، رامپور[1] اور روہیل کھنڈ کے دیگر شہروں میں رہ کر مکمل کیا۔ چونکہ خصوصی طور سے رامپور میں یہ تذکرہ تکمیل کو نہیں پہنچا اس لیے اس تذکرے کو براہ راست رامپور کا تذکرہ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔لگ بھگ اسی دور کا ایک اہم اور مشہور تذکرہ 'مخزنِ نکات' کا زیادہ تر حصہ مصنف نے آنولہ اور رامپور میں رہ کر ہی مکمل کیا ہے۔آنولہ 1774 تک ریاست رامپور کا حصہ رہا جو بانیِ رامپور نواب فیض اللہ خاں کے چھوٹے بھائی نواب محمد یار خاں کی جاگیر میں تھا۔ چونکہ نواب محمد یار خاں امیر انتہائی ادب نواز اور علم دوست شخص تھے اسی لیے ان کے حلقہ احباب میں مولوی قدرت اللہ شوق، قائم چاند پوری، غلام ہمدانی مصحفی اور دیگر مشہور شعرا تھے۔قائم نواب کے دربار میں حاضر باش رہتے تھے اور اسی دوران انھوں نے روہیل کھنڈ اور رامپور کے بہت سے شعرا کے احوال اپنے تذکرے میں شامل کیے لیکن اس کے باوجود ہم 'مخزنِ نکات' کو خالص رامپور میں لکھا گیا تذکرہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس کے مختلف مندرجات دہلی، اودھ، اور شاہجہانپور میں رہ کر بھی قائم نے مکمل کیے تھے۔

چونکہ ریاست روہیلہ کا قیام 1774 میں عمل میں آیا اس لیے تذکرے کو رامپور سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ رامپور میں تحریر شدہ اولین تذکرے کے طور پر 'ہشت خلد' کا نام لیا جاسکتا ہے۔مولف 'تذکرہ کاملان رامپور' اور موجودہ دور کے سینئر اسکالر عتیق جیلانی سالک وغیرہ کی روایت کے مطابق رامپور میں تکمیل پانے والا اولین تذکرہ 'ہشت خلد' ہے۔اس کے مولف روہیل کھنڈ اور رامپور کے استاد شاعر مولوی غلام جیلانی رفعت ہیں۔

عتیق جیلانی سالک نے تحریر کیا ہے:

''نجو خاں ولد مستقیم خاں ولد کبیر خاں نے مولوی غلام جیلانی رفعت سے شعرائے اردو کا تذکرہ ہشت خلد مرتب کرانا شروع کیا، غلام جیلانی کی وفات ہو جانے سے کام رک گیا۔ نجو خاں نے تسلیم (محمد کبیر خاں تسلیم)، اکرم، عنبر، (عنبر شاہ آشفتہ و عنبر) جیسے علما و شعرا کی ذمے داری لگائی کہ تذکرہ مکمل کریں... جب خود نجو خاں جنگِ دوجوڑا 1796 میں شہید ہو گئے اور ان کے بھائی سپہ سالار ستو خاں کو بھی نواب محمد یار خاں نے محاذِ جنگ سے واپس بلا لیا تو انھوں نے...... اس تذکرہ کو 1210ھ/ 96-1795 میں مکمل کیا۔[2]

اس کے بعد جو دوسرا تذکرہ تحریر کیا گیا اس کے مولف مشہور شاعر مولوی قدرت اللہ شوق ہیں جنھوں نے 1244ھ/ 29-1828 میں 'تکملۃ الشعرا المعروف بہ جامِ جمشید' تالیف کیا، اس تذکرے میں شعرائے عرب و عجم کے حالات اور کلام کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ دونوں تذکرے فارسی زبان میں ہیں اور رامپور رضا لائبریری میں بہ شکلِ مخطوطات موجود ہیں۔ ایک اور اہم تذکرہ 'تذکرہ شعرائے رامپور' بھی ہے، اس کے مولف کپتان جارج فانتوم ہیں۔ جارج فانتوم بنیادی طور پر فرانسیسی تھے اور رامپور میں نواب احمد علی خاں رند کے معالج کی حیثیت سے قیام تھا، ان کو فارسی اور اردو میں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ ان کا تذکرہ 1275ھ 59-1858 سے قبل مکمل ہوا تھا۔[3]

2019 میں اردو ترجمہ کی شکل میں اس تذکرے کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے ہو چکی ہے۔حالانکہ اس تذکرے میں بھی اردو شعرا کے احوال اور کلام کو جمع کیا گیا ہے البتہ مروجہ دستور کے مطابق اس کی زبان بھی گزشتہ دونوں تذکروں کی طرح فارسی ہے جب کہ نمونہ کلام اردو میں ہی درج کیا گیا ہے۔

تذکرہ نگاری کے حوالے سے رامپور میں سب سے سنہری دور کہلانے کا مستحق نواب کلب علی خاں کا ہے۔ نواب خود بھی شاعر تھے اور علم و ادب کے بے حد قدر داں بھی تھے۔ ان کے دور میں حکیم وحید اللہ نے 'تذکرہ حکومت المسلمین' کے نام سے رامپور، ٹونک، گنج پورہ، شاہ جہاں پور وغیرہ ریاستوں کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اس تذکرے کی زبان اردو ہی ہے اور یہ تا حال مخطوطے کی شکل میں رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ 'تذکرہ حکومت المسلمین' میں ریاست رامپور کے قیام سے لے کر نواب کلبِ علی خاں کے دورِ حکومت تک کی تاریخ اور اہم واقعات لکھے گئے ہیں۔

نواب کلبِ علی خاں کے دور کا ہی اہم ترین کارنامہ انتخاب یادگار ہے۔ امیر مینائی نے نواب کی فرمائش پر شعرائے رامپور کے حالات اور کوائف جمع کر کے 1879 میں یہ تذکرہ ترتیب دیا۔ اس تذکرے میں صرف اردو ہی نہیں بلکہ رامپور کے ہندی گو شعرا بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی تعداد چار سو پندرہ کے قریب ہے۔ یہ تذکرہ دو طبقات میں تقسیم ہے ایک تو وہ شعرا جو نوابین یا ان کے خاندان سے متعلق تھے اور دوسرے وہ جو عوامی حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عوامی شعرا کے مقابلے میں نوابین اور ان کے خاندان کے شعرا کے زیادہ تفصیلی حالات اور کلام شامل کیا گیا ہے۔

''یہ تذکرہ 4 ذی الحجہ 1297ھ مطابق کوتاج المطابع میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ چونکہ امیر مینائی نے اسے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا اس لیے اکثر عبارت آرائی کا کمال اور مبالغے کا مظاہرہ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے شعرا کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ انتخاب یادگار کا دوسرا عکسی ایڈیشن 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔''[4]

انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے قدیم تذکرہ نگاروں کی پیروی کرتے ہوئے مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے تذکرہ کا حسن متاثر ہوا ہے اور تذکرے میں صرف عبارت آرائی کا کمال زیادہ نظر آتا ہے۔ تذکرے کے آغاز سے قبل تمہید کے طور پر امیر مینائی نے روہیل کھنڈ اور رامپور کی تاریخ بھی درج کی ہے جو محض خانہ پری کہلا سکتی ہے کیونکہ اس میں بیان کردہ اکثر واقعات کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے کچھ بعد کے دور میں ایک اہم تذکرہ 'تذکرہ کلیم' کے نام سے بھی ترتیب دیا گیا ہے، اس کا آغاز قدرت علی خاں قدرت رامپوری نے کیا تھا اور ان کی وفات کے بعد منشی عتیق الرحمٰن کلیم نے ضروری حواشی اور شعرا کے کلام اور حالات کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کیا۔ اس میں بھی رامپور کے شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ تا حال یہ تذکرہ مخطوطے کی شکل میں رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

نواب حامد علی خاں کے عہدِ حکومت میں رامپور کی نامور علمی و ادبی شخصیت حافظ احمد علی شوق نے 'تذکرہ کاملان رامپور' کے نام سے ایک اہم تذکرہ لکھا ہے جو رامپور میں لکھے گئے تذکروں میں سب سے زیادہ کارآمد سمجھا جاتا ہے اور بہت مشہور بھی ہے۔ اس تذکرے میں صوفیا و مشائخ، علما، اطبا، شعرا اور دیگر اہم شخصیات کے کوائف جمع کیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ 1929 میں مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد پریس دہلی سے شائع ہوا۔ 1986 میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے اس کا دوسرا ایڈیشن چند حواشی اور اضافوں کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس میں آغاز ریاست رامپور سے نواب حامد علی خاں کے دور کی اکثر اہم شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے، حالانکہ مولف کو اگر متعلقہ لوگوں کا تعاون حاصل ہوتا تو کئی اہم شخصیات شامل ہونے سے نہ رہ جاتیں۔

"تذکرہ نگاری کے حوالے سے رامپور میں سب سے سنہری دور کہلانے کا مستحق نواب کلب علی خاں کا ہے۔ نواب خود بھی شاعر تھے اور علم و ادب کے بے حد قدر داں بھی تھے۔"

تمہید میں خود مولف نے تحریر کیا ہے:

''مجھے اس کتاب کی تالیف سے کوئی نام آوری مد نظر نہیں ہے بلکہ ابتدائے عمر سے یہاں کے اہلِ کمال کے حالات سن کر یہ خیال دامن گیر ہوا کہ یادگار کے لیے جہاں تک ممکن ہو بزرگوں کے حالات بہ طور یاد داشت لکھ دوں ...... چھ سو خط چھاپ کر شہر اور بیرون جات میں تقسیم کیے تا کہ موجودہ اخلاف اپنے اسلاف کا حال بتائیں لیکن میری بد قسمتی دیکھیے کہ دس بارہ صاحبوں کے سوا کسی نے بھی مجھے جواب نہ دیا۔ مجبور ہو کر کتابوں کی ورق گردانی شروع کی اور اہلِ شہر سے زبانی روایات کو جمع کیا۔ 1914 میں اس کام کو شروع کیا تھا اور آج یہ ہدیہ حاضر خدمت ہے۔''[5]

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ احمد علی خاں شوق حسبِ خواہ حالات جمع نہ کر پائے ورنہ تذکرہ ضخیم بھی ہوتا اور بہت سے اہم لوگ شامل ہونے سے نہ رہ جاتے۔ البتہ تذکرہ جس حالت میں بھی ہے وہ بھی بہت اہم اور قابلِ قدر ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور تذکرہ ایسا نہیں ملتا جس میں اس قدر تفصیل اور کثرت کے ساتھ اہلِ فضل و کمال کو یکجا کیا گیا ہو۔ رامپور منظر نامہ تاریخ و تہذیب و ادب کی مصنفہ کے بقول:

''تذکرہ کاملان رامپور حافظ احمد علی خاں شوق کی رامپور سے والہانہ محبت کا روشن ثبوت ہے۔ انھوں نے یہ تذکرہ محض ادب دوستی کی غرض سے لکھا یعنی نہ تو والی ریاست کے حسبِ فرمائش پر اس کی تصنیف کی گئی اور نہ ہی کسی ذاتی غرض کی تکمیل کے لیے۔ اس تذکرے کے وسیلے سے شوق نے بے شمار مشاہیر رامپور کے علمی و ادبی کارناموں کا وہ ریکارڈ محفوظ کر دیا جو ادبیات رامپور پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔''[6]

رامپور کے آخری فرماں روا نواب رضا علی خاں (1930-1947) کے عہدِ اقتدار میں بھی کئی تذکرے لکھے گئے جن میں مولانا محمد علی خاں اثر رامپوری کا تذکرہ 'خم کدہ شعر و سخن' ہے۔ یہ تذکرہ دراصل مولانا اثر رامپوری کے شعرائے رامپور پر ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے انتہائی تحقیق اور عرق ریزی سے تحریر کیے تھے اور جو معارف، نقوش اور دیگر ادبی جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ عرصے تک یہ تذکرہ گمنامی میں رہا اور مسودے کی شکل میں ادھر ادھر منتقل ہوتا رہا لیکن چند سال قبل مولانا محمد علی خاں اثر کے فرزند ڈاکٹر شوق اثری نے لکھنؤ سے اس کو شائع کر دیا ہے۔ اسی دور کا ایک مختصر تذکرہ راز یزدانی رامپوری کا بھی ہے۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کے رسالہ 'نگار' میں 'رامپور کا ماحول شعر و سخن' کے نام سے کئی قسطوں میں ایک تفصیلی مقالہ

لکھا تھا جس میں رامپور کی شاعری کے ادوار کا تعین نوابین رامپور کے دور حکومت کی نسبت سے کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ بہت اہم ہے اور آج بھی دستاویزی حیثیت کا حامل ہے بعد کو یہی مقالہ 'تاریخ ادبیات رامپور' کے نام سے شائع ہوا۔

نواب رضا علی خاں کے دور حکومت میں ہی رامپور کے ایک بزرگ سید شمس الدین نے 'تذکرہ بزرگان رامپور' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جس میں رامپور کے مختلف صوفیائے کرام کے حالات درج ہیں۔ اس تذکرہ کا سنہ تالیف 1935 ہے۔حالانکہ یہ ایک مختصر تذکرہ ہے لیکن اپنے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ اس کے دو نسخے ہیں ایک رامپور رضا لائبریری کے ذخیرہ مخطوطات اور دوسرا صولت پبلک لائبریری رامپور میں۔ لگ بھگ اسی عہد میں حشمت علی خاں رامپوری نے انساب کے حوالے سے ایک تذکرہ ترتیب دیا جس کا نام 'تخصیص الانساب معروف بہ بہار افغانیہ' ہے۔ بہار افغانیہ میں رامپور کے بہت سے خاندانوں کے تفصیلی حالات اور کوائف اور نسلی سلسلے درج کیے گئے ہیں۔ بہار افغانیہ کو اپنے موضوع کی مناسبت سے ایک اہم تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔

صاحب زادہ تجمل علی خاں علیگ رامپوری نے کراچی پاکستان سے 'اردو شاعری کا تیسرا اسکول' کے نام سے ایک تفصیلی تذکرہ لکھا جس میں ابتدائی دور سے سنہ 2000 تک کے اکثر شعرائے رامپور کے حالات اور نمونہ کلام شامل ہے۔اس تذکرے کے کراچی سے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ صاحب تذکرہ خود نوابین کے خاندان کے ہی ایک فرد تھے اس لیے انھوں نے خاندان نوابین کے شعرا کو ہی نمایاں طور پر پیش کیا ہے البتہ اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رامپور سے 1950 کے بعد ہجرت کر کے جانے والے وہ شعرا بھی شامل ہو گئے ہیں جن کے نام رامپور سے تحریر شدہ تذکروں میں نہیں ملتے۔ اس تذکرے کی اولین اشاعت 1982 میں ہوئی تھی جب کہ دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن جوہر اکیڈمی، کورٹ روڈ کراچی پاکستان سے 2001 میں شائع ہوا۔ شعرا کے نام اور نمونہ کلام کے اضافے کے متعلق مصنف نے خود بھی تحریر کیا ہے:

''ضمیمہ اردو شاعری کا تیسرا اسکول کی اشاعت ثانی میں شعرائے ذیل کے حالات جو اشاعت اول میں دستیاب نہ ہو سکے تھے۔ضمیمہ کی صورت میں شائع کیے جارہے ہیں۔''[7]

اضافہ شدہ شعرا میں سید زین العابدین منصور رامپوری، محسن برلاس، انجم شادانی، رضوان عنایتی، بشیر درانی، رحمٰن خاور، شرر نعمانی، شاہد عشقی، انجم شیرازی رامپوری، سجاد سخن اور محمد ذاکر علی خاں شامل ہیں۔ ان تمام شعرا کے احوال رامپور سے متعلق کسی دیگر تذکرے میں نہیں ملتے۔

رامپور کے صاحب لہجہ شاعر ہوش نعمانی صاحب نے شعرا و نثر نگاروں اور چند علما کے تعلق سے ایک منفرد حیثیت کا تذکرہ 'ادب گاہ رامپور' لکھا ہے جس میں شامل لوگوں کے حالات کو منظوم پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، اس تذکرے میں شعرا ہی نہیں بلکہ ہندی کوی اور نثر نگاران رامپور کو بھی جگہ دی گئی ہے جس سے اس تذکرے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ 1997 میں رامپور رضا لائبریری سے اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔

1999 میں ایک تذکرہ 'رامپور کا دبستان شاعری' کے نام سے رضا لائبریری رامپور سے شائع ہوا۔ اس کے مولف رامپور کے مشہور ادیب و شاعر شبیر علی خاں شکیب ایڈوکیٹ ہیں۔ اس میں بھی شاعری کے ادوار کا تعین نوابین کے دور حکومت کی مناسبت سے ہی کیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے اہم شعرا کے احوال اس تذکرے میں رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس تذکرے کا اصل مسودہ جو کافی ضخیم تھا اور رامپور رضا لائبریری میں اشاعت کی غرض سے جمع کیا گیا تھا وہ کہیں غائب ہو گیا اور پھر مصنف نے دوبارہ میسر شدہ شعرا کے کوائف اور کلام کے نمونے جلد از جلد تیار کر کے پھر سے رضا لائبریری میں داخل کیے جس کی اشاعت ہوئی۔

بقول مصنف:

''یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ رامپور کا دبستان شاعری کا واحد مسودہ چند سال ہوئے ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی افسر بکار خاص رضا لائبریری کو دیے جانے سے قبل کہیں گم گیا۔ خرابی صحت کے پیش نظر دوبارہ لکھنا ناممکن ہوتا تھا۔ لیکن احباب کے ہمت دلانے پر جس طرح بھی ہو سکا لکھ کر پیش کر دیا۔ جو اب شائع ہو رہا ہے۔''[8]

ہوش نعمانی کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے رامپور کے ایک اور کہنہ مشق شاعر ڈاکٹر فرید صدیقی نے بھی 'آئینہ رامپور' کے نام سے قطعات پر مشتمل ایک تذکرہ چند سال قبل پیش کیا، اس میں شعرا کے علاوہ ادبا، علما اور عام سماجی شخصیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

تذکرہ نگاری کے حوالے سے ہی میں چند سال قبل سلیم عنایتی اور مشہور شاعر اظہر عنایتی نے مشترکہ طور پر ایک تذکرہ بنام 'دبستان رامپور' 2013 میں مرتب کر کے شائع کیا، اس میں رامپور کے ابتدائی دور سے موجودہ دور تک کے شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ البتہ یہ تذکرہ کسی بھی شاعر سے متعلق تفصیلات سے خالی ہے کیونکہ اس میں صرف شاعر کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تلمذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس تذکرے میں 191 شعرا کو شامل کیا گیا ہے اور اس تذکرے کا امتیاز یہ ہے کہ دو ایک شعرا کو چھوڑ کر باقی تمام شعرائے رامپور کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح سلیم عنایتی کا مرتبہ ایک اور تذکرہ جس میں نمائندہ شعرائے رامپور کے احوال و کوائف جمع کیے گئے ہیں غیر مطبوعہ حالت میں ہے۔ اس کے علاوہ 'بقلم خود' اور 'تذکرہ شعرا' بھی غیر مطبوعہ ہیں جس کے مصنف کا نام عبداللہ خالد ہے۔

تذکرہ نگاری کے متعلق عتیق جیلانی سالک کی کتاب 'رامپور شناسی' کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں رامپور کی متعدد علمی و ادبی اور سماجی شخصیات کے کوائف درج کیے گئے ہیں۔ رامپور شناسی کی اشاعت 2012 میں شاہد پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی سے ہوئی ہے اور اس کے مشتملات میں 'امتیاز علی عرشی کے بعض مباحث'، کاظم خاں شیدا، رامپور کا ایک ادبی رسالہ نیرنگ، پدماوت کے اردو تراجم رامپور میں، منے میاں صابر (رامپوری) اور ان کا کلام، دارالسرور میں غالب، قدیم اخبارات اور ریاست رامپور، رامپور کی صحافت پر سرسری نظر، مومن خاں مومن اور روابط رامپور، رامپور کے قدیم آثار اور تہذیبی صورت حال، اردو کے فروغ میں رامپور کا حصہ'میر مہدی مجروح اور روابط رامپور'' وغیرہ ہیں۔ ان موضوعات پر سیر حاصل معلومات جمع کی گئی ہیں اس کے علاوہ شخصیات کے ذیل میں روہیلہ سردار عمر خاں بڑ مچھے، عابد رضا بیدار، شبیر علی خاں شکیب، ڈاکٹر ابن فرید، ہوش نعمانی، ڈاکٹر شوق اثری، بشارت علی خاں فروغ، اظہر عنایتی، پروفیسر حسن احمد نظامی، شبیر علی خاں ضیا، سسٹر آصف جہاں، مولانا فضل حق رامپوری، مولانا

عبدالسلام خاں رامپوری، مولانا وجیہ الدین خاں، مولانا عبدالحئی وغیرہ پر تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں۔

حال ہی میں رامپور کے سینئر اسکالر اور ادیب و شاعر رضوان لطیف خاں نے دو تذکرے 'تذکرہ سخنوراں' اور 'دستک دیے بغیر' تالیف کیے ہیں۔ تذکرہ سخنوراں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رامپور کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں مقیم بہت سے شعرا و شاعرات کے احوال درج ہیں۔ دوسرا تذکرہ 'دستک دیے بغیر، ایک مشہور مصرع طرح 'دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا، پر مختلف شعرا کی طبع آزمائی کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے اور اس میں بھی ہندو پاک کے بہت سے شعرا و شاعرات کے احوال و مصرع طرح پر کلام موجود ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رامپور میں تذکرہ نگاری کے حوالے سے زیادہ تر شاعری پر ہی کام کیا گیا لیکن دیگر موضوعات تصوف، شکاریات، نثر نگاری، صنعت و حرفت کے تعلق سے بھی کئی اہم تذکرے لکھے گئے ہیں۔ تصوف کے متعلق شاہ محمد حسن صابری کا 'حقیقت گلزار صابری' معروف تذکرہ ہے جو 1960 کے آس پاس ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رامپور کے شکاری اور شکاریات پر ناصر علی خاں علیگ کا ایک تذکرہ شائع ہو چکا ہے اور اسی موضوع پر رامپور رضا لائبریری نے مشہور افسانہ نگار مسعود الظفر خاں کا تذکرہ بھی شائع کیا ہے۔ رضا لائبریری سے ہی صنعت وحرفت پر بھی 'تذکرہ ہنرمندان رامپور' شائع ہو چکا ہے جس کے مولف مشہور ادیب و افسانہ نگار ابن حسن خورشید ہیں۔ اس تذکرے میں بیشتر ایسے ہنرمند شامل ہیں جو یا تو ظروف سازی میں یکتا و یگانہ تھے یا پھر وہ ریاست کے ملازم تھے اور اسلحہ سازی مثلاً چاقو، تلوار، بھالا اور ڈھال وغیرہ بناتے تھے اور اپنے فن میں ایسے مکمل تھے کہ دور دور تک ان کی مشاقی اور مہارت کی تعریف تھی۔

نسبی اور خاندانی تذکروں میں 'احوال خاندان مولوی غلام جیلانی خاں' مولف ارشاد اللہ خاں چیف جسٹس رامپور' آشیانہ رامپور' مولف امتیاز اللہ خاں اور 'نقش جمیل' مولف محمد طارق خاں جیسے مطبوعہ تذکرے بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں تذکرے ایک ہی خاندان یعنی مولوی غلام جیلانی خاں رسالدار کے احوال و کوائف اور خاندانی سلسلے کے بیان پر مشتمل ہیں۔

فنی تذکرے کے بطور 'چہار بیت' از شبیر علی خاں شکیب ایڈوکیٹ 1994 میں خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوا ہے جس میں رامپور میں چہار بیت گوئی کے فن، چہار بیت گو اور چہار بیت خوانوں کے حالات اور منتخب چہار ابیات شامل کی گئی ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل صبر تسلیمی رامپوری کا اسی موضوع پر ایک تذکرہ 'نوازش رضا' کے عنوان سے تالیف کیا جا چکا ہے لیکن وہ بہ شکل مخطوطہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ خدابخش لائبریری کے

رامپور میں تذکرہ نگاری کے حوالے سے زیادہ تر شاعری پر ہی کام کیاگیا لیکن دیگر موضوعات تصوف، شکاریات، نثر نگاری، صنعت و حرفت کے تعلق سے بھی کئی اہم تذکرے لکھے گئے ہیں۔

ڈائریکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی تحریک پر شبیر علی خاں شکیب ایڈوکیٹ نے رامپور کے چہار بیت خواں اور چہار بیت گو شعرا کے حالات انتہائی تلاش و تحقیق کے بعد جمع کیے۔ خدا بخش لائبریری کی جانب سے ہی 'تذکرہ کاملان رامپور' کی جلد دوم اور سوئم بھی تیار کی گئی تھی جس میں رامپور کے بیشتر اصحاب کمال کے حالات ہیں لیکن ان دونوں جلدوں کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی بلکہ پروف کاپی کی شکل میں یہ جلدیں رامپور رضا لائبریری اور صولت پبلک لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

تاریخی تذکرے کے حوالے سے 2010 میں نجو خان شہید نامی ایک تذکرہ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں رامپور کے نامور روہیلہ سردار اور رامپور فوج کے سپہ سالار غلام مصطفی خاں عرف نجو خاں کے حالات، جنگ نجو خانی 1794 [9] کا تفصیلی بیان اور نجو خاں کے خاندان اور اولاد کا تفصیلی ذکر ہے۔

'رامپور تاریخ وادب' مولفہ سعود الحسن خاں روہیلہ اور 'رامپور منظر نامہ تاریخ وتہذیب و ادب' بھی تاریخی تذکرہ نگاری کے حوالے سے اہم کتب ہیں۔ 'رامپور تاریخ وادب' لاہور سے 2012 میں شائع ہوا ہے جب کہ 'رامپور منظر نامہ تاریخ و تہذیب وادب' نامی تذکرہ 2019 میں آگرہ سے شائع ہوا ہے اس کی مصنفہ سعدیہ سلیم شمسی ہیں جنھوں نے اس تذکرے میں رامپور کی تاریخ، نثر نگاران رامپور کا تفصیلی تذکرہ اور رامپور کے شعرائے کرام کا مختصر تذکرہ اور نمونہ ہائے کلام درج کیے ہیں۔ 194 صفحات پر محیط یہ تذکرہ کئی لحاظ سے بہت اہم ہے کیونکہ اس سے قبل رامپور کے نثر نگاروں کا اس طرح باقاعدہ کسی نے تفصیلی تذکرہ نہیں لکھا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ رامپور میں تذکرہ نگاری کے حوالے سے کافی اہم اور قابل قدر کارنامے انجام دیے گئے ہیں بلکہ گزشتہ سطور میں بیان کیے گئے تذکروں کی خاصی اہمیت ہے اور وہ رامپور ہی نہیں بلکہ بیرون رامپور کے اہل فضل و کمال کے لیے حوالہ جاتی حیثیت رکھتے ہیں۔

محدود رقبہ والی ایک چھوٹی سی ریاست رامپور میں تذکرہ نگاری کے حوالے سے اہم کارنامے انجام دیے گئے ہیں وہ یقیناً ادبی تاریخ میں تعریف وستائش کے مستحق ہیں۔

حواشی

1. شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن بیخار تک) از حنیف نقوی، ص 299، رامپور کا دبستان شاعری از شبیر علی خاں شکیب، ص 127
2. رامپور شناسی از عتیق جیلانی سالک، ص 202 (ناشر: مصنف، رامپور، 2012)
3. تذکرہ شعرائے رامپور از جارج فانتوم، ص XIX (اردو ترجمہ مصباح احمد صدیقی 2019)، رامپور کے فارسی گو شعرا از ساجدہ شیروانی صفحہ XX (اشاعت 2020)
4. رامپور شناسی از عتیق جیلانی سالک، ص 205 (ناشر: مصنف، رامپور، 2012)
5. تذکرہ کاملان رامپور از احمد علی خاں شوق، ص 08، (ناشر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1986)
6. رامپور منظر نامہ تاریخ تہذیب ادب از سعدیہ سلیم شمسی، سنہ اشاعت: 2019، سعدیہ سلیم شمسی، غالب پورہ کلاں نذن سہاش پارک، ایم جی روڈ، آگرہ، ص 62
7. اردو شاعری کا تیسرا اسکول از تجمل علی خاں علیگ، ناشر جوہر اکیڈمی آرا ے لائن، کورٹ روڈ، کراچی، پاکستان، اشاعت 2001، ص 177
8. رامپور کا دبستان شاعری از شبیر علی خاں شکیب، ص 10
9. ایضاً، ص 22

Nizamul Hasan
Village Mohabbat Nagar
Tahseel Suar
District: Rampur- 9675221881 (UP)
Mob.:9675221881
syednizam0096@gmail.com

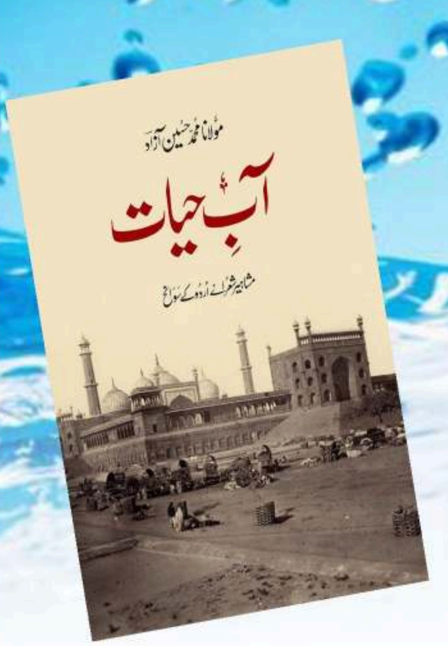

دلشاد حسین اصلاحی

خاکہ نگاری کا ایک حوالہ
آبِ حیات

اردو داں حلقے میں شاید کوئی ایسا شخص ڈھونڈ نے سے بھی نہ ملے جس نے محمد حسین آزاد کی کتاب ’آب حیات‘ سے استفادہ نہ کیا ہو یا اس کتاب سے نا آشنا ہو یہ کتاب اس قدر اہم ہے کہ 1907 تک سات ایڈیشن نکل چکے تھے اور آخری ایڈیشن کی تعداد بھی دو ہزار تھی۔[1]

اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

’آب حیات‘ ایک مخزن معلومات ادب اردو ہے تاریخ، زبان اردو، آزاد کی تنقیدی بصیرت، زبان کی ترقی اور تبدیلی کے احوال مختلف زبانوں پر ایک دوسرے کے اثرات کا ذکر نظائر کے ساتھ، دبستان دہلی اور لکھنؤ کا مختصر ہی صحیح موازنہ اس میں پڑھنے کو یکجا مل جاتا ہے۔ اردو ادب کا طالب علم اور اسکالر مختلف زاویوں سے اس کا مطالعہ کر کے بہت سے موضوعات اخذ کرسکتا ہے۔ میں نے ’آب حیات‘ میں خاکہ نگاری کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خاکہ نگاری اردو ادب میں ناول، افسانہ اور انشائیہ نگاری کی طرح نثری تخلیقی صنف ہے۔ اور اردو ادب میں اس وقت اس کا دامن بحیثیت صنف بڑا اثر وت مند ہے۔ خاکہ نگاری کی یہ روایت اردو میں تذکروں سے ہوتے ہوئے ہم تک آئی ہے جہاں اس کے نقوش کہیں دھندلے اور کہیں واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔

’آب حیات‘ میں پیش کی گئی بہت سے شعرا کی تصاویر (پورے طور پر فنی لحاظ سے نہ سہی) کے خدوخال خاکہ نگاری کے ضمن میں ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس تعلق سے پروفیسر شمیم حنفی کہتے ہیں کہ: ’’خاکہ نگاری کے اعتبار سے بھی آب حیات ایک اہم دستاویز ہے کہ آزاد نے تنقید و تاریخ کے ساتھ ساتھ جابجا شخصیت کے مرقعے پیش کیے ہیں شاعروں کے کلام سے قطع نظر جب وہ ان کی شخصیت پر توجہ کرتے ہیں تو اس طرح کہ یہ شخصیتیں زندہ شبیہیں بن جاتی ہیں اور پڑھنے والا ان کی قربت کی آنچ محسوس کرنے لگتا ہے۔‘‘[2]

’آب حیات‘ تصنیف کرنے کے پیچھے مولانا محمد حسین آزاد کا مقصد کیا تھا کتاب کے دیباچے میں صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں ’’زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرت عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو، اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ جو خوبیاں باہم پہنچائیں انھیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ حرف حرف گراں بار احسان ہو... ایسے بزرگان باکمال کے رویے اور رفتاروں کو دیکھنا انھیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے۔ اور ہمیں بھی دنیا کے پیچیدہ راستوں میں چلنا سکھاتا ہے... اس کے علاوہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے...

اگر چہ اعتراض ان کا کچھ اصلیت سے خالی نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی معلوماتیں زیادہ تر خاندانوں اور خاندانی باکمالوں اور ان کے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتی ہیں وہ لوگ کچھ تو انقلاب زمانہ سے دل شکستہ ہو کر تصنیف سے ہاتھ کھینچ بیٹھے کچھ یہ کہ علم اور اس کی تصنیفات کے انداز روز بروز کے تجربہ سے راستے بدلتے ہیں... غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انھیں جمع کر کے یکجا لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اسی طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔ اور انھیں حیات جاوید حاصل ہو۔‘‘[3]

کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں اس اقتباس سے کئی چیزیں معلوم ہوتی ہیں اول یہ کہ خود آزاد کی نظر میں قدیم تذکرے کسی شخصیت کی مکمل تصویر کشی کرنے میں ناکام ہیں۔ ان کا احساس ہے کہ کسی شخصیت کا بھرپور عکس اس کے بیان کی روشنی میں قاری کے سامنے ضرور آجانا چاہیے یوں انھوں نے پرانے تذکروں پر اپنی تنقیدی رائے دے دی ہے دوسرے یہ کہ نقص کے اسباب کو بھی بتا دیا ہے تیسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں زیر قلم آئی شخصیات کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں خود پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے اس دعوے کے نقوش کی تلاش اور یہ کہ وہ اپنے دعوے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں اس تحریر کا مقصد ہے ’آب حیات‘ کو زمانی تدریج کے ساتھ مصنف نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے پہلے دور میں چھ شعرا شامل ہیں دوسرے دور میں صرف تین شاعروں کو لیا ہے تیسرے دور میں سات شاعر ہیں چوتھے دور میں یہ تعداد چار ہے پانچویں دور میں سب سے زیادہ 8 شاعروں کو شامل کیا ہے۔ یہ آخری دور میر ببر علی

انیس پر ختم ہوتا ہے اس طرح کتاب میں مجموعی تعداد 28 شعرا کی ہوتی ہے جن کے کوائف واحوال اور ان کے کلام پر مصنف 'آبِ حیات' نے گفتگو کی ہے۔ ان تمام شعرا کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب شخصیات کے مرقعے صاحب تصنیف نے پیش کیے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر شمیم حنفی کے مندرجہ بالا اقتباس سے مترشح ہوتا ہے تاہم کچھ اشخاص کے بیان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں خاکے کا رنگ جھلکتا ہے یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'آبِ حیات' میں آج سے ایک صدی سے زائد عرصہ قبل بھی خاکے کے کچھ واضح نقوش بڑی تابدار شکل میں ملتے ہیں اور یہ آج کے فن خاکہ نگاری سے ہم آہنگ بھی ہیں تاہم مکمل خاکہ نگاری کے حوالے سے کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

'آبِ حیات' کے پہلے دور کی تمہید میں آزاد لکھتے ہیں کہ ''مگر حیران ہوں صورت کیوں کر دکھادوں۔ اول تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل اس پر میں زبان کا اپاہج اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی بولتی چلتی تصویر کھینچ دکھاؤں۔''4

تمہید کے بعد ولی کے ذکر میں خاکے کا کچھ رنگ نظر آتا ہے لکھتے ہیں: یہ (یعنی ولی) نظم اردو کی نسل کا آدم ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے۔ اور مضامین کی رائج الوقت دستکاری سے مینا کاری کی۔ جب کشور وجود میں پہنچا تو ایوان مشاعرے کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا شہرت عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے اس کی بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو اور جو کتابے لکھے ہیں انھیں پڑھو دنیا سو برس دور نکل آئی ہے مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔''5

اس کے بعد کی بحث میں ولی کے کلام بیان اور زبان کے ساتھ ساتھ مضامین شاعری کا ہی بیان ہے اور جو آزاد نے زبان کا اپاہج ہونے کی بات کی ہے وہ محض ان کا انکسار ہے ان کی انشاپردازی اور قدرت زبان تو مسلم ہے لیکن مقدمے میں۔ ''بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں'' کے دعوے کے بعد ان کا عجز صرف اس واسطے ہے کہ ان کو ولی سے معاصرت نہیں رہی جو خاکہ نگاری کے لیے اہم ہے۔

اس دور میں شامل تیسرے شاعر شیخ شرف الدین مضمون کی جھلک چند سطروں میں دکھا دی ہے لکھتے ہیں: ''شیخ فرید ین شکر گنج کی اولاد میں تھے جاج مئو علاقہ اکبر آباد وطن اصلی تھا دلی میں آ رہے تھے اصل پیشہ سپاہ گری تھا۔ تباہی سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مرکر اٹھے اس عالم میں بھی خوش مزاج با اخلاق یار باش آدمی تھے۔''6

یہاں چند جملوں میں تعارف کے ساتھ ظاہری اور باطنی شخصیت کے کئی پہلو پیش کر دیے ہیں۔ اس دور کے باقی چار افراد کے بارے میں اس طرح کی کوئی گلکاری نہیں ملتی۔

دوسرا دور شیخ ظہورالدین شاہ حاتم سے شروع ہوتا ہے۔ تعارف یوں کراتے ہیں: ''والد کا نام فتح الدین تھا... رہنے والے خاص شاہجہان آباد کے تھے یہ معلوم نہیں کہ بزرگ ان کے کہاں سے آئے تھے کسی تذکرے سے ان کی علمیت تحصیلی کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے۔ نہ کچھ ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے مگر اس قدر استعداد ضرور رکھتے تھے کہ ان کی انشاپردازی میں خلل نہیں آنے دیتی۔''7

ان کے مزاج بود و باش اور طرز معاشرت کے متعلق لکھتے ہیں: ''شاہ حاتم پہلے سپاہی پیشہ تھے عمدۃ الملک امیر خاں کی مصاحبت میں عزت و فارغ البالی بلکہ عیش وعشرت سے بسر کرتے تھے۔ اور چونکہ محمد شاہی دور تھا اس لیے آئین زمانہ کے بموجب جو جو اس وقت کے نوجوانوں کے شوق تھے سب پورے کرتے تھے۔ دلی میں قدم شریف کے پاس میر بادل علی شاہ کا تکیہ ایسے رند مشرب لوگوں کا ٹھکانہ تھا یہ بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ فقیر کی صحبت نے ایسا اثر کیا کہ انہی کے مرید ہوگئے رفتہ رفتہ سب گناہوں سے توبہ کی... توکل پر گزارہ کیا اور فقط ایک رومال اور ایک پتلی سی چھڑی جو کہ ہندوستان کے فقرائے آزادمنش کا تمغہ ہے وہ پاس رہ گئی۔ شاہ موصوف باوجود یہ کہ نہایت مہذب اور متین تھے... بہت خوش مزاج اور نہایت خلیق اور ظریف تھے۔ فقیری اختیار کر لی تھی مگر بانکوں کی طرح دوپٹہ سر پٹ ٹیڑھا ہی باندھتے تھے۔''8

''تیسرا دور جن اہم شعرا پر مشتمل ہے ان کے متعلق آزاد تمہید میں لکھتے ہیں اس مشاعرہ میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پاانداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ خ زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا.. اگر چہ بہت سے مرصع کار مینا نگار پیچھے آئے مگر اس فخر کا نولکھا ہار انہی بزرگوں کے گلے میں رہا۔''9

اس تیسرے دور کی ابتدا مرزا جان جاناں مظہر سے کی ہے مگر ان کی مرقع کشی نہیں ملتی ہاں ان کے حسن پرستی اور حسن جمال کا اچھا خاصا تذکرہ کر دیا ہے اسی ذیل میں میر عبدالحئی تاباں جو یوسف ثانی معروف تھے نوجوان کا ذکر آ گیا ہے جن کی دید کے لیے شاہ وقت بھی ان کے مکان تک گئے۔

مرزا رفیع سودا کا بیان جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں سے انھوں نے کتاب میں ذیلی عناوین لگانے کی ابتدا کی ہے۔ سودا کا تعارف مع تاریخ پیدائش اور دیگر تفصیلات کے ساتھ کیا ہے یہاں تک کہ وجہ تخلص بھی بیان کی ہے مگر شخصیت کیا اس تعارف اور بیان میں کہیں بھی خاکے کا رنگ نہیں ہے۔

سودا کے بعد میر ضاحک کا بیان ہے یہاں آزاد نے 'وضع اور لباس' عنوان لگا کر جو کچھ لکھا ہے وہ مرقع نگاری کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے دیکھیے لکھتے ہیں:

''نام سید غلام حسین تھا ان کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے خاندان سیادت کا ان کا سندی تھا امام ہروی کی اولاد میں تھے اور شاعری بھی گھرانے میں میراث چلی آتی تھی میر موصوف نہایت خوش طبع، خوش مزاج خنداں جبیں ہنسنے اور ہنسانے والے تھے۔ اس واسطے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ وضع اور لباس قدمائے دہلی کا پورا نمونہ تھا۔ سر پر سبز عمامہ بوضع عرب، بڑے گھیر کا جامہ یا جبہ کہ وہ بھی اکثر سبز ہوتا تھا، گلے میں خاک پاک کا کنٹھا، داہنے ہاتھ میں ایک چوڑی اس پر کچھ دعائیں کندہ، چھنگلی بلکہ اور انگلیوں میں بھی کئی انگوٹھیاں، ڈاڑھی کو مہندی ملتے تھے۔ میانہ قد رنگ گورا۔''10

خواجہ میر درد اور میر سوز کے ذیل میں بھی ان کی شخصیت کے تعارف میں خاکے کا رنگ بالکل دکھائی نہیں دیتا۔

اس دور سوم کے آخری اہم شخصیت خدائے سخن میر تقی میر ہیں تقریباً بیس صفحات میں ان کا تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ بہت مفصل بیان ہے۔ ان کی نازک مزاجی

اور تندیِ طبع کا بیان بڑا ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ان کی شخصیت انانیت کا بینار نظر آتی ہے غیر مربوط انداز میں ذیلی عنوان لگا کر انھوں نے تین مقام پر جو کچھ ان کی ذات کے متعلق خاکے کے انداز میں قلم بند کیا ہے بالترتیب یوں ہے۔

وضع ولباس: ''ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ، ایک پورا تھان پستولیہ کا کمر سے بندھا، ایک رومال پڑی دار طے کیا ہوا اس میں آویزاں۔ مشروع کا پاجامہ، جس کے عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب۔''11

یہ اس وقت کی ہیئت بیان کی ہے جب میر دلی سے لکھنؤ وارد ہوئے تھے اور جاتے ہی پہلی بار ایک مشاعرے میں حاضری دی تھی۔ ایک جگہ عنوان لگاتے ہیں 'میر صاحب کی تصویر دیکھو' اس کے ذیل میں تحریر کیا ہے:

''میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ، بات بہت کم، وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی اور ملائمت ضعیفی نے ان صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا کیونکہ سو برس کی عمر بھی آخر اثر رکھتی ہے۔''12

میر کی خود پسندی اور انانیت کے متعلق آزاد رقم طراز ہیں:

''افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے... بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔''13

اس اقتباس میں بزرگوں کی جن روایتوں اور حکایتوں کا ذکر آزاد کرتے ہیں ان کی مثالیں نہیں دی ہیں بس صرف اپنے استاد حضرت ذوق کا بیان چار صفحات آگے جا کر یوں نقل کیا ہے:

''استاد مرحوم ایک دیرینہ سال شخص کی زبانی بیان کرتے تھے کہ ایک دن میر صاحب کے پاس گئے۔ نکلتے جاڑے تھے۔ بہار کی آمد تھی۔ دیکھا کہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ پر افسردگی کا عالم ہے۔ اور رہ رہ کر یہ مصرع پڑھتے ہیں:

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے یہ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اٹھے اور سلام کر کے چلے آئے۔ میر صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ خدا جانے دوسرے مصرعے کی فکر میں تھے یا اس مصرع کی کیفیت میں محو تھے۔14

آزاد نے ان ذیلی سرخیوں کے علاوہ کئی اور سرخیاں لگا کر میر کی شخصیت کی مرقع کشی کی ہے مثلاً 'بے اعتدالی' غیرت مزاج اور آزادی طبع' 'پونے تین شاعر' شائقین کلام کے ساتھ بے دماغی' 'بے دماغی کا اتفاقی ثمرہ' 'قناعت اور بلند نظری' وغیرہ۔ اگر ان تمام ذیلی سرخیوں کے ذیل میں موجود مواد کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر دیا جائے تو واقعی حضرت میر تقی میر کا ایک عمدہ خاکہ سامنے آجائے گا۔

چوتھے دور کے شعرا کے سلسلے میں خاکہ نگاری کا اہتمام نہیں ہے زیادہ تر سید انشا اور مصحفی کے درمیان چشمکوں اور معرکہ آرائی کا اظہار ہے فن شعری کے تعلق سے ہی زیادہ تر گفتگو کی گئی ہے۔

پانچویں دور میں شیخ امام بخش ناسخ کے احوال کا بیان بالتفصیل درج کیا ہے، علمی و فنی استعداد اور صلاحیت پر بحث کی ہے، ذاتی ذوق وشوق کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کو پہلوانی کا شوق تھا اس کا مفصل بیان مع خوش خوراکی ملتا ہے۔ دن بھر کے معمولات پر بڑے حسین پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے۔ صبح تک اس سے فارغ ہوتے تھے... صبح سے احباب اور شاگرد آنے شروع ہوتے تھے۔ دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند، حضرت دسترخوان پر بیٹھے... عصر سے پھر آمد شروع ہوتی مغرب کے وقت سب رخصت... کوٹھے پر ایک کمرہ خلوت کا تھا وہاں گئے کچھ سو رہے اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر فکر سخن میں مصروف ہوئے۔''15

کبھی کسی کی نوکری اور ملازمت نہیں کی۔ پھر بھی خوشحال زندگی بسر کی ہے۔ قدردانوں اور شاگردوں کا وسیع حلقہ تھا یہ آزاد طبیعت شخص معاش کے لیے سرگردہ نہیں رہے، اس تعلق سے آزاد کا بیان یہ ہے نواب معتمد الدولہ اور ان کے بیٹے ہمیشہ خدمت کو حاضر رہتے تھے۔ تحفے نذرانے جابجا سے آتے رہتے تھے۔ یہ بھی کھاتے اور کھلاتے ہی رہتے تھے۔ سادات، اہل حج، اہل زیارت کو دیتے تھے اور آزادی کے عالم میں جہاں جی چاہتا وہاں جا بیٹھتے جس کے ہاں جاتے وہ اپنا فخر سمجھتا تھا۔''16

اس دور کے شعرا میں آزاد نے میر مستحسن خلیق کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو ایک مکمل خاکہ کہا جا سکتا ہے سارے احوال وکوائف انھوں نے خاکے کے رنگ میں پیش کر دیے ہیں خلیق لکھنؤ میں مرثیہ کے منفرد شعرا میں سے تھے۔ مشہور مرثیہ گو میر ضمیر، میاں دلگیر اور میاں فصیح ان کے معاصر تھے۔ مرثیہ نگاری میں نام پیدا کرنے والے میر انیس آپ کے فرزند ارجمند تھے۔

اسی دور کے شعرا میں خواجہ حیدر علی آتش کے ذیل میں بھی خاکہ نگاری کا رنگ بڑا نمایاں ہے طرز معاشرت کے سلسلے میں یہ جملے دیکھیے یہاں ان کے اخلاق کا ایک پہلو سخاوت کتنا نمایاں ہے لکھتے ہیں: اسی روپے مہینہ بادشاہ لکھنؤ کے ہاں سے ملتا تھا 15 روپے گھر میں دیتے تھے باقی غربا اور اہل ضرورت کو کھلا پلا کر مہینے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیتے تھے۔ پھر توکل پر گزارا تھا۔''17

اسی طرح بے نیازی اور شرافت نفس کے متعلق آزاد کا یہ بیان بھی قابل ملاحظہ ہے کہ ''نہ امیروں کے دربار میں جا کر غزلیں سنائیں نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کیے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا... وہ شیخ امام بخش ناسخ کے ہم عصر تھے... دونوں کے معتقد کہ انبوہ در انبوہ تھے۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے۔ مگر دونوں بزرگوں پر صد رحمت ہے کہ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح دست و گریباں نہ ہوتے تھے۔''18

میر خلیق کی طرح شاہ نصیر الدین نصیر صاحب کا خاکہ بھی عمدگی سے پیش کیا ہے فرق یہ ہے کہ ابتدا میں ان کے احوال خاندانی اور اسفار کا ذکر ہے اور کلام پر تبصرہ ہے آخر میں جا کر خاکہ کے رنگ میں ان کے اعتقادات، عادات و اطوار، زندہ دلی اور بذلہ سنجی کو بیان کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

''شاہ صاحب نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج تھے... ان کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت و ادب پیدا کرتی تھی۔ وہ اگر چہ رنگت کے گورے نہ تھے مگر نور معنی سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ بدن چھریرا اور کشیدہ قامت تھے۔ وجاہت ظاہری کم تھی اس سے ہزار درجے زیادہ خلعت کمال نے شان وشوکت بڑھائی تھی۔''19

مومن خاں مومن کے تذکرے میں خاندانی تفصیل

پیش کی ہے۔ اس کے بعد جو حصہ رقم کیا ہے اس میں مومن کا مرقع پیش کیا ہے اس میں ان کی وضع قطع، قامت و رنگ، بالوں کی کیفیت، لباس کی تراش خراش، کلام پڑھنے کا انداز نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہاں صرف ان کی خودداری اور غیرت کے سلسلے میں یہ طور اور ڈھنگ ملاحظہ کیجیے:

”راجہ کپورتھلہ نے انھیں ساڑھے سو روپے مہینہ کر کے بلایا اور ہزار روپے خرچ سفر بھیجا۔ وہ بھی تیار ہوئے، مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویے کی بھی یہی تنخواہ ہے کہا کہ جہاں میری اور ایک گویے کی بھی یہی تنخواہ ہو میں نہیں جاتا... وہ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنی احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔“[20]

طبابت خاندانی پیشہ تھا۔ خود مومن حکیم حاذق تھے۔ علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ مگر بقول آزاد ان کا مزاج یہ تھا:

”جس طرح شاعری کے ذریعہ انھوں نے پیسہ نہیں پیدا کیا اسی طرح نجوم، رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔“[21]

مومن کے بیان میں آزاد نے واقعی ان کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حسین آزاد نے ملک الشعرا خاقانی ہند یعنی اپنے استاد محترم ابراہیم ذوق کے حالات بڑی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ اس میں شاگردانہ نیاز مندی کا بھی خاصا دخل ہے جو فطری ہے آب حیات کے 22 صفحات پر یہ تفصیل ہے مگر خاکے کے رنگ میں جو تصویر مصنف نے پیش کی ہے وہ صرف ’خاص حالات اور طبعی عادات‘ کی سرخی لگا کر سامنے رکھی ہے۔ جو فقط سات صفحے پر مشتمل ہے۔ یہاں انھوں نے ذوق کا خاکہ کھینچ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ جس میں ان کی بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں کا بیان ہے، تو وہیں مزاج میں تقوی و تصوف کے رنگ کو پیش کیا ہے۔ ان کے شوق اور پسندیدہ مشاغل کا بیان ہے۔ طرز معاشرت اور روزمرہ کے معمولات سے بھی آگاہی ملتی ہے جو ایک مکمل خاکی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سراپہ نگاری کا یہ انداز دیکھیے: شیخ مرحوم قد وقامت میں متوسط اندام تھے۔ رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ نو دفعہ چیچک نکلی تھی۔ آنکھیں روشن نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آئندہ۔ جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اٹھتی تھی۔“[22]

مرزا اسد اللہ خان غالب کے سلسلے میں چار صفحات میں ابتدائی حالات قلم بند کیے ہیں پھر ذوق کے خاکے کے انداز میں سرخی ’مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات‘ لگا کر تصویر غالب پیش کی ہے مگر یہ پیشکش زیادہ تر خطوط غالب کے ذریعے ہی انجام پائی ہے جو مجموعہ خطوط غالب ’اردوئے معلیٰ‘ میں انھیں دستیاب رہی ہے۔ ان معلومات کو ہی جوڑ کر غالب کی تصویر سامنے رکھ دی ہے خود لکھتے ہیں: ”میں نے چاہا کہ مرزا کی تصویر الفاظ و معنی سے کھینچوں مگر یاد آیا کہ انھوں نے ایک جگہ اسی رنگ و روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے میں اس سے زیادہ کیا کرلوں گا اس کی نقل کافی ہے۔“[23]

غالب نے واقعی خود اپنے خطوط میں اپنی تصویر اور حالت کو بحسن خوبی بیان کر دیا ہے۔ ساتھ ہی دلی کے احوال کو بھی ’عود ہندی‘ اپنے مجموعہ خطوط میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے غالب کے زمانے کی دلی دیکھنی ہو تو ’عود ہندی‘ کے خطوط پڑھے جا سکتے ہیں۔ تاہم آزاد نے غالب کی شبیہ کو پیش کرنے کے لیے اپنے قلم سے بھی جا بجا کام لیا ہے غالب کے مزاج اور دوست داری کے ضمن میں جو جملے آزاد کے قلم سے نکلے ہیں ملاحظہ کیجیے:

”مرزا کثیر الاحباب تھے دوستوں سے دوستی کو ایسا نبھاتے تھے کہ اپنائیت سے زیادہ ان کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفہ اور رئیس زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی۔“[24]

تصویر غالب اس قدر دل آویز نہیں ہے جتنی کہ حسین تصویریں آزاد نے مستحسن خلیق، حیدر علی آتش، مومن اور ذوق کی دکھائی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کی مرقع نگاری میں انھوں نے اپنے قلم کو زیادہ زحمت نہ دے کر خطوط غالب پر انحصار کیا ہے۔ یہ بات پر اعتماد طور پر کہی جاسکتی ہے اور ’آب حیات‘ کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ خاکہ نگاری کا اسلوب اور انداز آخری حصے میں جا کر زیادہ واضح اور صاف دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر خلیق، آتش، مومن اور ذوق کے بیان میں یہاں ایک ترتیب و تدریس پائی جاتی ہے جبکہ اس سے پہلے مذکور افراد کے سلسلے میں یہ چیزیں مفقود ہیں۔ وہاں انتشار ہے آخر کے مذکورہ خاکوں میں فنی لوازمات کا اجتماع موجود ہے میر تقی میر کا خاکہ بھی مفصل ہے مگر وہاں پر بھی خاکے کا مواد یکجائی سے محروم ہے۔

پیش نظر موضوع کے اعتبار سے ’آب حیات‘ اس لیے اہم ہے کہ آزاد نے اتنا عرصہ قبل جو کچھ خاکے کے انداز میں تحریر کیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے جبکہ آج کی طرح خاکہ نگاری کے اصول و آداب مرتب نہ تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ خاکہ نگاری کے اصول و ضوابط کے وضع کرنے میں یہ کتاب کہیں نہ کہیں ناقدین کے لیے ضرور معاون رہی ہوگی۔

حواشی

1 ٹائٹل پیج ’آب حیات‘ فوٹو آفسیٹ عکسی ایڈیشن، اتر پردیش اردو اکادمی، قیصر باغ، لکھنؤ، مطبوعہ 1993

2 آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، مرتب: پروفیسر شمیم حنفی، ناشر: اردو اکادمی دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، دہلی، 2001، ص 21-31

3 دیباچہ آب حیات، فوٹو آفسیٹ عکسی ایڈیشن، اتر پردیش اردو اکادمی، قیصر باغ، لکھنؤ، 1993، ص 3-4

4 ایضاً، ص 81 — 5 ایضاً، ص 83

6 ایضاً، ص 96 — 7 ایضاً، ص 107

8 ایضاً، ص 107-108، (شاہ حاتم کے مفصل حالات اور کلام کے تعلق سے پروفیسر عبد الحق سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی کتاب ’دیوان حاتم‘ مطبوعہ: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 2010 دیکھی جاسکتی ہے۔)

9 ایضاً، ص 123 — 10 ایضاً، ص 173

11 ایضاً، ص 196 — 12 ایضاً، ص 205

13 ایضاً، ص 206-207 — 14 ایضاً، ص 211

15 ایضاً، ص 336 — 16 ایضاً، ص 338

17 ایضاً، ص 373 — 18 ایضاً، ص 374-75

19 ایضاً، ص 394-95 — 20 ایضاً، ص 409-10

21 ایضاً، ص 410 — 22 ایضاً، ص 443

23 ایضاً، ص 486

■

Dilshad Husain Islahi
Sub Editor, Monthly 'Salah Kar,
E-54, Abul Fazl Enclave
New Delhi- 110025
Mob.:8750380917
dilshadhussain426@gmail.com

شمیم احمد

برصغیر کی زبانوں میں اردو کا شجرہ

برصغیر کی زبانوں کے خاندان کا مطالعہ کرنے سے پہلے ایک نظر دنیا میں زبانوں کے خاندان کے بارے میں مختصر وضاحت ضروری ہے تا کہ آسانی سے معلوم ہو کہ برصغیر کی زبانوں کے خاندان کس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ 1822 میں جرمن عالم ہمبولٹ نے دنیا میں زبانوں کو 13 خاندانوں میں تقسیم کیا ہے پھر ایک اور ماہر لسانیات پارٹی رج نے 10 خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور ماہر لسانیات فریڈرک ملر اور کئی ماہر لسانیات نے دنیا میں زبانوں کو 100 خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سپیر نے 1929 عیسوی میں زبانوں کے چھ بڑے خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں فرینچ اکیڈمی نے دنیا میں زبانوں کی تعداد 2796 بتائی ہے۔ گرے نے دنیا میں زبانوں کو 26 خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مختلف ماہر لسانیات کے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ماہر لسانیات کی اپنی اپنی زبانوں کے خاندانوں کے متعلق رائے پیش کی گئی ہے۔ بعض نے تعداد کم اور بعض نے زیادہ بتائی ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا ایک نظریہ اور ہے۔ جس کے مطابق دنیا میں زبانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کے بڑے بڑے آٹھ خاندان ہیں جن خصوصیات کی بنا پر ان آٹھ بڑے خاندانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس کو بھی واضح کرنا ضروری ہے۔ پہلی قسم میں زبان کو لفظ اور گرامر کی خصوصیات کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ اس گروہ میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی ایک لفظ سے کئی الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہر لفظ اپنی الگ حیثیت، شناخت اور وجود رکھتا ہے۔ ہر لفظ کا ایک مخصوص مطلب ہوتا ہے اور لفظ کے معنی نہیں بدلتے جب کہ دوسری قسم میں زبانوں کو نسلی اور تاریخی تعلقات کی بنا پر رکھا گیا ہے یعنی اس گروہ میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا ان میں الفاظ اپنی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ مطلب اور مفہوم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کے کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں۔

دنیا کے آٹھ بڑے لسانی خاندان

سامی	ہند چینی	دراوڑی	مونڈا	افریقہ کی بانتو	ملایا	امریکی	ہند یوروپی
46	115	26	5	83	12	1134	32

دنیا کے آٹھ بڑے خاندانوں کے نام اور ان کی زبانوں کی تعداد لکھنے کے بعد ہم صرف ہند یوروپی زبان کے خاندان کے بارے میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہند یوروپی خاندان: ہند یوروپی خاندان السنہ کے بارے میں خلیل صدیقی اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

'' زبانوں کے خاندان میں ہند یوروپی خاندان کو ایک لسانی اہمیت حاصل ہے۔ پوری دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں اکثر اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں لسانی، ادبی، علمی اور سائنسی سرمایہ دوسرے خاندان کی زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والوں میں یورپ، ایران، افغانستان ،شمالی ہند، سری لنکا، نیپال، بھوٹان، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور جزائر عرب الہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا تعلق مختلف نسل و مذہبوں اور فرقوں سے ہے۔''

(خلیل احمد صدیقی، زبان کیا ہے، ص171)

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہند یوروپی زبان کو کسی دوسرے نام سے بھی پکارا جاتا ہے؟ اس کا جواب بھی خلیل احمد صدیقی پیش کرتے ہیں۔

'' ہند یوروپی خاندان کو سنسکرتی، یوروپی، سریئین، سامی اور حافی کے مقابلے میں ہند کلاسیکی کی ہند جرمانی اور آریائی بھی کہا جاتا رہا۔ بہر حال عالمی سطح پر ہند یوروپی رائج ہے۔'' (خلیل احمد صدیقی، زبان کیا ہے، ص173)

'' ہند یوروپی زبانوں کا خاندان اپنی اہمیت کے اعتبار سے لسانیات کے باب میں ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ہند یوروپی کی تین شاخوں کا تعلق تین ادوار سے ہے۔ ان شاخوں میں ہند ایرانی، یونانی اور اٹالک زبانیں شامل ہیں۔ قدیم ایرانی کی ذیلی شاخ 'ایرانی' کی قدیم ترین دستاویز میں ملتا ہے اور ہند آریائی کی سب سے پرانی زبان 'رگ وید سمہتہ' ہے۔ ماہرینِ لسانیات کے مطابق رگ وید کے منتر اور بھجن 1600 تا 2000 قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں وضع کیے گئے۔ اسی بات کو ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی رائے کے مطابق ان کی تخلیق 1200 قبل مسیح کے قریب ہوئی ہوگی۔ اس زمانے میں آرین فنِ تحریر سے ناواقف تھے۔ اس لیے انھوں نے ان منتروں اور بھجنوں کو از بر کرلیا ہوگا جو سینہ بہ سینہ آگے چلتے گئے اور ایک طویل مدت کے بعد ضبط تحریر میں لائے گئے ہوں گے۔'' (خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص174)

گیان چند جین ہند یوروپی خاندان السنہ کے متعلق اپنی رائے کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

'' سر ولیم جونز کی اس دریافت کی وجہ سے کہ سنسکرت اور یوروپی کلاسیکی زبانیں ایک ہی کڑی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جرمنوں نے اپنے لسانی مطالعہ کو آگے بڑھایا جس سے تاریخی لسانیات قاعدے کا مقابلہ او رآوازوں کے قوانین مرتب ہوئے۔ جرمنوں نے سوچا کہ زبانوں کا یہ خاندان ایک طرف تو یوروپ سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف انگریزی یا آئس لینڈ جرمن زبانوں سے اسی لیے اس خاندان

کا نام ہند جرمن سوچا گیا تا کہ اس نام سے دونوں بڑے علاقوں کی نمائندگی ہو جائے۔ آئرلینڈ کی زبان آئرش کیٹلک خاندان ہونے کی وجہ سے اس کا نام ایڈو کیٹلک بھی رکھا گیا۔ مگر پھر زبانوں کے اس خاندان کا نام ہند یوروپی رکھ دیا گیا۔ جرمن علما نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا اور خیال کیا کہ ہند جرمن نام کو بدلنا دراصل جرمن بیزاری کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ہند یوروپی نام بھی فرانسیسیوں کا دیا ہوا ہے۔ جو کہ جرمنی سے کئی بار جنگ کر چکے تھے اسی لیے جرمن اس خاندان کو ہند جرمن ہی کہتے ہیں اور باقی اسے ہند یوروپی کے نام سے پکارتے ہیں۔'' (گیان چند جین عام لسانیات ص793)

ہند یوروپی خاندان کی شاخیں

(1) ہند آریائی/ہند ایرانی (2) ستم (3) کینٹم

ہند ایرانی/ ہند آریائی

1600 قبل مسیح آریوں نے جب یہاں قدم رکھا تو ان میں سے کچھ ایران میں ٹھہر گئے اور کچھ ہندوستان کی طرف چلے آئے۔ ان دونوں کی زبانوں میں مماثلت 'اوستا' اور 'سنسکرت' کی زبان کے تقابلی مطالعے نے ثابت کر دی ہے۔ 'اوستا' اور 'سنسکرت' سے زبان کے دو دھاروں نے جنم لیا۔ گریرسن نے ہند آریائی زبان کو تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

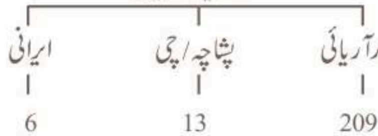

ہند آریائی: ہند آریائی میں سنسکرت وسط ہند آریائی پراکرتیں، اپ بھرنش قواعد نویس مارکنڈیہ کے بقول سنسکرت سے پراکرت نکلی اور پراکرت سے اپ بھرنش مذہبی پراکرتوں میں پالی، اودھی، مگدھی، جین مہاراشٹری، جین شورشینی، عمومی سنسکرت، اوہٹ پراکرتیں سنسکرت سے جہاں بہت کچھ لیتی تھیں وہاں وہ بہت کچھ دیتی بھی تھیں۔ ہیورنلے اور گریرسن نے جدید آریائی زبانوں کو دو گروہوں اندرونی اور بیرونی میں تقسیم کیا ہے۔

ہند آریائی زبانیں ہند یوروپی خاندان السنہ کی ہند ایرانی شاخوں کی ایک شاخ ہے۔ یہ انڈک کے نام سے بھی معروف ہے۔ ایس آئی ایل انسٹیٹیوٹ 2005 کی تحقیق کے مطابق ہند آریائی زبانوں میں 209 زبانیں شامل ہیں۔ ہندوستانی (ہندی اور اردو) سب سے بڑی زبان ہے۔ جس کے بولنے والے کروڑوں ہیں اس خاندان میں دوسرے نمبر پر بنگالی جس کے بولنے والے بھی کروڑوں ہیں۔ پنجابی تیسرے نمبر پر اور مراٹھی چوتھے نمبر پر آتی ہے۔ اس خاندان میں سنسکرت، ہندی، اردو، بنگالی، کشمیری، سندھی، پنجابی، شرائکی، رومانی، آسامی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ۔

اسی طرح ایک اور نظریہ ہند یوروپی زبانوں کے متعلق ہے کہ یہ لسانی گروہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اس میں اکثر ایسی زبانیں داخل ہیں جو اپنے ادبی اور علمی ذخیروں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے اعلی زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ ان کے اجزائے الفاظ ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل جاتے ہیں اور ان میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ کچھ عرصے بعد ایک ہی لفظ مختلف شکلوں اور کئی ایک معنوں میں استعمال ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ گروہ نہایت وسیع اور زیادہ اہم درجہ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان، یوروپ، ایران وغیرہ کے باشندے بھی اس کی شاخوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ابتدائی زبان کو کئی مختلف شاخوں کے ساتھ تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے:

(1) ہند یوروپی (2) ہند جو مائی (3) ہند آریائی

پہلا نام ان ملکوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں زیادہ تر یہی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح نام ہے۔ دوسرا نام عام طور پر جرمنی میں استعمال ہوتا ہے اور پورے یورپی خاندان کے لیے غیر تسلی بخش ہے۔ تاہم تیسرا نام مشہور ہو چکا ہے کہ شاید آنے والے دور میں ہند آریائی کے نام سے ہی پکارا جانے لگے۔

1 **ہند ایرانی خاندان** کی زبانیں متعدد ہیں تقریباً600 قبل مسیح اور قدیم ایرانی کتبوں کی تحقیق کے مطابق 520 سے 350 قبل مسیح اس خاندان کی سب سے مشہور زبانیں ہیں۔ جو بحر اسود سے لے کر وسط ایشیا تک بولی جاتی ہیں۔ ہند ایرانی خاندان میں پشتو اور بلوچی بھی شامل ہیں۔ مغربی فارسی بھی اسی میں ہے۔ اس میں شمال اور وسط کی بولیاں قدیم فارسی، جدید فارسی اور کردی شامل ہیں۔ جدید فارسی اپنے علم وادب کی وجہ سے مشہور ہے۔ اردو خاص کر اس سے بے حد متاثر ہے۔

2 **پشاچہ**: کا تعلق بھی ہند آریائی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی زبانیں ہندوستان کے انتہائی شمال مغربی مقامات پر بولی جاتی ہیں اس کے تین گروہ ہیں۔

3 **ہند آریائی**: ہند آریائی خاندان سے ہماری اردو زبان کا تعلق براہ راست ہے جس کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔

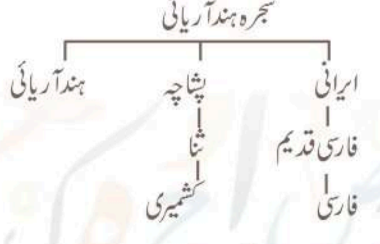

البتہ بعض محققین کی یہ بھی رائے ہے کہ فاتحین اور مفتوحین کے ملاپ سے نئی زبانیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر لاطینی زبان جب فرانس میں پہنچی تو مدت کے بعد فرانسیسی ہسپانیہ میں بلکہ خود اطالیہ میں اطالوی زبان بن گئی یہ مقامی اثرات کا نتیجہ تھا

تعجب نہیں اگر برصغیر میں یہی صورت ظہور پذیر ہوگئی ہواور اردو جیسی مخلوط زبان فقط لسانی اختلاط سے وجود میں آ گئی ہو۔ درحقیقت زبان کی نشو ونما قدرتی عوامل کے تحت ہوتی ہے اور بڑے بڑے سماجی انقلاب صرف ان کی سمت متعین کرتے ہیں۔

امیر خسرو جو کہ مختلف زبانوں کے فرق سے آگاہ تھے۔(امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں بعض علاقوں کی الگ الگ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ جو یہ ہے سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، گجراتی، تلنگی، معبری، دہور سمندری، اودھی دہلوی) اس لیے انھوں نے (لاہوری جسے ابوالفضل نے ملتانی کا نام دیا ہے) اور دہلوی (برج بھاشا کے نام ہندی کا ذکر کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ یہ زبان مذکورہ بالا صوبائی علاقائی زبانوں کے مابین ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ بشمول مندرجہ بالا السنہ کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو اور ابوالفضل نے اس زبان کو دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے۔ ہندو اہل علم نے عام طور پر برج، قنوجی، بندیلی، بولیوں وغیرہ سے امتیاز کے لیے جنھیں بڑی بولیاں کہتے تھے اسے کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا ہے۔ جب دہلی کی شاہی فرودگاہ کو اردوئے معلیٰ کہا جانے لگا تو یہ زبان بھی اردو کہلانے لگی مسلمانوں کے اثر سے اس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے اور فارسی عربی قواعد کا بھی کچھ اثر پڑا۔ دہلی کی مرکزی حکومت سے مسلمان برصغیر میں جہاں گئے یہی زبان ان کے ہمراہ رہی۔ بعض ماہرین لسانیات کی رائے ہے کہ جس زبان کو ہم آج کل اردو کہتے ہیں وہ دہلی میرٹھ اور اس کے قریب کی بول چال کی زبان کی نکھری ہوئی ترقی یافتہ شکل ہے۔

زبان کا مولد وہی ہوتا ہے جہاں وہ بلا شرکت غیر بولی جائے پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات، ممبئی، وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکہ چلتا ہے اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں۔ کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ بول چال کی زبانیں اور ہیں، کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، کہیں شہر کی زبان اردو ہے اور دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے تھے۔ لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں۔ صرف اردو ہے، جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ یوپی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سبھی اردو زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندو علما مفکرین تارک الدنیا فلسفے پر اعتقاد رکھنے والوں کی حیثیت سے ہمیشہ عقبہ پر نظریں جمائے رہتے تھے اور اس بے ثبات دنیا اور اس کے چند روزہ واقعات کو بہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے تاریخ اور سوانح نگاری میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ البتہ شاعری، ڈرامے، فلسفے کی طرف توجہ کی، مذہبی نوشتے، رزمیہ قصائد، مہابھارت اور رامائن کو تاریخ میں ہرگز شمار نہیں کیا جا سکتا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو سوانح، علم الرجال اور تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ برصغیر میں آ کر بس گئے تو انھوں نے یہاں بھی اس دلچسپی کا عام طور پر مظاہرہ کیا۔ عربوں نے عربی، ایرانیوں اور پٹھانوں نے زیادہ تر فارسی میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن سے برصغیر کے جغرافیہ، تہذیب وتمدن، ثقافت، معاشرت، اہم شخصیات اور سیاسی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ سلاطین دہلی کے زمانے کی تاریخوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ضیاء الدین کی فیروز شاہی، قاضی منہاج الدین بن سراج کی طبقات ناصری، شمس سراج کی تاریخ فیروز شاہی، امیر خسرو کی خزائن فتوح، مغلیہ خاندان کی تاریخوں میں بابر کی تزک بابری، جہانگیر کی تزک جہانگیری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان تمام تاریخوں سے بھی زیادہ معتبر و مستند عام تاریخیں جن سے اکثر مورخین استفادہ کرتے ہیں، ملا نظام الدین احمد کی طبقات اکبری جس میں سبکتگین کے آغاز حکومت سے لے کر اکبر کے سال جلوس تک کے واقعات درج ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذکر الملوک یا تاریخ حقّی جس میں سلطان شہاب الدین غوری سے اکبر کے جلوس تک کے واقعات درج ہیں۔ نظام الدین حسن نیشا پوری کی تاج المآثر، ملا یحییٰ بن احمد کی تاریخ مبارک شاہی افغان سلاطین کے زمانے کی تاریخوں میں خواجہ نعمت اللہ ہروی کی مخزن افغانی اور عبداللہ کی تاریخ داودی، خاندان مغلیہ کی تاریخوں میں بابر کی تزک بابری، جوہر آفتابچی کا تذکرۃ الواقعات، گل بدن بیگم کا ہمایوں نامہ، ابوالفضل علامہ کا اکبر نامہ اور آئین اکبری، امیر حیدر حسینی کی سوانح اکبری، محمد شریف معتمد خان کا اقبال نامہ جہانگیری، مرزا ابنائے قزوینی کا بادشاہ نامہ، محمد صالح کنبوہ کا عمل صالح، مرزا محمد طاہر آشنا کا شاہجہاں نامہ، مرزا محمد کاظم کا عالمگیر نامہ، نعمت خاں کے وقایع گولکنڈہ، عاقل خان رازی کے واقعات عالمگیری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

کیونکہ ان سب کتابوں کا اردو زبان کی پیدائش سے گہرا تعلق ہے۔ یہ کتاب مبادی طور پر 75 فیصد فارسی اور 25 فیصد عربی کی آمیزش سے فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ جدید اردو میں کافی حد تک عربی اور فارسی کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ایک الگ عنوان کی ضرورت ہے کہ کس طرح برصغیر کے خطے میں کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی اردو زبان وجود میں آئی۔

پروفیسر احتشام حسین بھی کم وبیش اسی نتیجے پر ہیں۔

”فارسی بولنے والے مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں سنسکرت اختیار کی اور یقیناً انھوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہوگی جسے امیر خسرو نے لاہوری اور ابوالفضل نے ملتانی کہا ہے اور جب وہ لوگ دہلی کی طرف بڑھے تو انہیں پنجابی سے کسی قدر ملتی جلتی نئی بولیوں کا سابقہ پڑا یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ 200 سال کی مدت زبان بننے کے لیے کافی نہیں ہوتی لیکن ایک مولود زبان کے خدوخال ضرور ابھر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی اردو یا مخلوط زبان میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہے۔“ (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ احتشام حسین، لکھنؤ، 1928)

محققین لسانیات کی ان تمام آرا کا جائزہ لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم اردو (ہندوی) کا آغاز جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے ساتھ ایک ہزار عیسوی کے لگ بھگ اس زمانے میں ہو گیا تھا۔ جب مسلمان فاتحین شمال مغربی ہند میں آباد ہوئے اور یہاں اسلامی اثرات بڑی تیزی سے پھیلنے لگے۔ اس کے بعد مسئلہ اردو زبان کے آغاز کا نہیں رہتا بلکہ اس کے نشو ونما وارتقا کے مختلف مرحلوں کا آ جاتا ہے، جس سے گزر کر اردو زبان نے ترقی کر کے موجودہ صورت اختیار کر لی ہے۔

■

Dr. Shamim Ahmad
2964, 4th Floor
Kucha Neel Kanth, Darya Gamnj
New Delhi- 110002
Mob.:9868596773
shamimah1975@gmail.com

آفاق ندیم خان

قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے رہنما خطوط

'قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023' کے نکتے 1.6.1 میں واضح کیا گیا ہے کہ 'زبان کی تعلیم' کے تعلق سے ہندوستان کے کثیر لسانی ورثے کو زبان کی تعلیم کے نصاب میں مناسب مقام دیا گیا ہے۔ خاکے میں درج زبان کے نصاب کا مقصد 15 سال کی عمر یعنی 10ویں جماعت تک کے طلبا کو تین زبانوں میں تعلیمی استعمال کے لیے لسانی مہارت کا فروغ کرنا ہے۔ ان تین زبانوں میں کم از کم دو ہندوستانی زبانیں ہوں گی جن میں کم از کم ایک ہندوستانی زبان کا مطالعہ 'ادب کی سطح' پر کیا جائے گا۔ زبان کی تعلیم کو تین زمروں R1، R2 اور R3 میں درجہ بند کیا گیا ہے۔ جہاں R1 سے مراد ذریعہ تعلیم اور ابتدائی خواندگی کے حصول کے لیے استعمال کی جانے والی زبان (طلبا کے لیے سب سے زیادہ مانوس زبان، مادری زبان یا گھریلو زبان) ہے۔ R2 زمرے میں انگریزی سمیت دیگر زبان اور R3 میں R1 یا R2 کے علاوہ کسی بھی زبان کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح طلبا R 2 اور R 3 کے طور پر ہندوستانی آئین کی درج فہرست زبان، کسی علاقائی زبان یا غیر ملکی زبان کا انتخاب مطالعے کے لیے کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ بارہویں جماعت تک کے تمام طلبا کے لیے کم از کم ایک ہندوستانی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ گیارہویں اور بارہویں جماعت میں، کم از کم دو زبانوں کا مطالعہ کیا جائے گا، جن میں کم از کم ایک ہندوستانی زبان ہوگی۔ ان تمام زبانوں میں زبان کی تعلیم کا مقصد صرف زبان بولنا اور خواندگی نہیں ہے بلکہ طلبا میں بحث و مباحثہ اور تحریری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ادبی استعداد اور زبان کے تخلیقی استعمال کی صلاحیتوں کا فروغ کرنا ہے۔ خاکے میں بیان کیا گیا ہے کہ زبان سیکھنا ثقافت سیکھنا ہے۔ زبان کی تعلیم کا مقصد طلبا کو ہندوستان کے لسانی ورثے اور ثقافت، بشمول ہندوستان کے بھرپور تحریری اور زبانی ادب جیسے کہ کہانیاں، نظمیں، گانے، مہا کاویہ، ڈرامے، فلمیں، اور بہت کچھ کے ساتھ شراکتی مشغولیت کے ذریعے منہمک کرنے اور اس میں حصہ لینے کے قابل بنانا ہے۔

> **زبان کی تعلیم کا مقصد طلبا کو ہندوستان کے لسانی ورثے اور ثقافت، بشمول ہندوستان کے بھرپور تحریری اور زبانی ادب جیسے کہ کہانیاں، نظمیں، گانے، مہاکاویہ، ڈرامے، فلمیں، اور بہت کچھ کے ساتھ شراکتی مشغولیت کے ذریعے منہمک کرنے اور اس میں حصہ لینے کے قابل بنانا ہے۔**

زبان کی تعلیم کے خصوصی حوالے سے قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے رہنما خطوط: قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے حصہ 2.6 میں ان امور پر توجہ مرکوز کی گئی ہے جو اسکولوں میں زبان کی تعلیم کے لیے سب سے اہم ہیں۔ تدریس اور اندازۂ قدر کے طریقہ کار، اصول، اور طریقوں کے بارے میں اس دستاویز کے حصہ A، باب 3، 3.3 اور 3.4 میں خصوصی بحث کی گئی ہے۔ قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے نکتے 2.6.1 میں تدریسِ زبان کے حوالے سے رہنمائی فراہم کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ، تمام بچوں میں زبانیں سیکھنے کی خداداد اور فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ اسکول کے تعلیمی تناظر میں طلبا کے ذریعے زبان کو کس طرح بہترین طریقے سے سیکھا جاتا ہے؟ طلبا زبان کس طرح سیکھتے ہیں؟ اسکولی تعلیم کی مختلف سطحوں پر تدریسِ زبان کی کون سی طرز رسائی بہتر ہے؟ زبان کے اساتذہ کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ اس ضمن میں قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 میں درج ذیل رہنما خطوط فراہم کیے گئے ہیں۔

1. **طلبا اسکولوں میں ارادی عمل کے ذریعے زبان اچھی طرح سیکھتے ہیں:** زبان کو باضابطہ اور بامقصد طریقے سے براہ راست ہدایات اور ضروری اصولوں کے ذریعے سکھایا جانا چاہیے۔ ابتدائی زندگی میں زبان کا حصول لاشعوری یا غیر ارادی ہوتا ہے،

> تعلیم کے شروعاتی مراحل میں بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھنا بہتر خواندگی کی اساس ہیں لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ کسی بھی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے مستقل مشغولیت کے ذریعے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا اور سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں کی منظّم مشق کرنا ضروری ہے۔

لیکن اسکولوں میں زبان کی آموزش ایک شعوری عمل ہے۔ اس لیے زبان کو پڑھنا اور لکھنا سکھانا ایک فعال تدریسی عمل ہونا چاہیے۔

ii. **خواندگی کے لیے متوازن نقطہ نظر سے طلبا بہتر سیکھتے ہیں:** معنی سازی، خط رمز شناسی (ڈی کوڈنگ) اور ہجے کے ذریعے پڑھنا سیکھنے سے طلبا رفتہ رفتہ آزاد قاری بن جاتے ہیں۔ الفاظ کی شناخت اور درستگی کے ساتھ زبان کی فہم اور اظہارِ خیال پر توجہ دے کر خواندگی میں مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔

iii. **ابتدائی تعلیم اور خواندگی کے حصول کے بعد طلبا کو مستقل طور پر باقاعدہ مشق کی ضرورت ہوتی ہے:** تعلیم کے شروعاتی مراحل میں بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھنا بہتر خواندگی کی اساس ہیں لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ کسی بھی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے مستقل مشغولیت کے ذریعے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا اور سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں کی منظّم مشق کرنا ضروری ہے۔

iv. **طلبا مختلف قسم کے ادب سے مسلسل ربط کے ذریعے اپنی زبان کی مجموعی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں:** تعلیمی سطح کے مطابق ادب کی مختلف اصناف کو متعارف کرانے سے مطالعے میں دلچسپی کا فروغ ہوتا ہے۔ یہ طلبا کو 'مطالعے کے لیے سیکھنے' سے 'سیکھنے کے لیے مطالعہ' کے قابل بناتا ہے۔ وسطانیہ (مڈل) مرحلے تک، طلبا اپنی زبان کی مہارتوں کا تجزیہ کرنے، ترکیب کرنے، بیان کرنے، وضاحت کرنے اور ان کا اطلاق کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ترقیاتی طور پر تیار ہوتے ہیں۔ ثانوی مرحلے میں، طلبا سماجی واقعات اور تعاملات کی شناخت کرتے ہیں، ان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور آزادانہ ردِعمل کا اظہار کر سکتے ہیں۔

زبان کی تعلیم کے خصوصی حوالے سے قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کی حکمت عملیاں: قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں تعلیمی مراحل کو '5+3+3+4' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پالیسی کے مطابق باضابطہ تعلیم کا عمل 3 سال کی عمر میں شروع ہوگا جسے ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ یہ تعلیم 5 سال پر مشتمل ہے جو 3 سال سے 8 سال کی عمر کے بچوں کے لیے ہے۔ اس مرحلے کی تعلیم کو قبل اسکولی تعلیم یا بنیادی (فاؤنڈیشنل) تعلیم سے منسوب کیا گیا ہے۔ قبل اسکولی تعلیم مکمل ہونے کے بعد 3 سالہ تعلیم کا دوسرا مرحلہ یعنی اسکولی تعلیم کا پہلا مرحلہ جسے پالیسی میں تیاری (پریپریٹری) مرحلہ کہا گیا ہے، شروع ہوتا ہے۔ اسکولی تعلیم کا دوسرا مرحلہ وسطانیہ (مڈل) اور تیسرا ثانوی مرحلے کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جو بتدریج 3 اور 4 سال پر مشتمل ہے:

تعلیم کے مراحل	عمر	وقفہ	درجہ
ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم	3 سال سے 8 سال	5 سال	شروعات سے درجہ 2 تک
تیاری (پریپریٹری)	9 سال سے 11 سال	3 سال	درجہ 3 سے 5 تک
وسطانیہ (مڈل)	12 سال سے 14 سال	3 سال	درجہ 6 سے 8 تک
ثانوی (سیکنڈری)	15 سال سے 18 سال	4 سال	درجہ 9 سے 12 تک

اسکولی تعلیم کے مختلف مراحل (تیاری، وسطانیہ، ثانوی) پر زبان کی تدریس کے تعلق سے حکمت عملیوں کا بیان اس دستاویز کے حصہ C نکتہ 2.6.1 میں کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

1. **تیاری (پریپریٹری) مرحلہ:** اسکولی تعلیم کا یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس میں 9 سال سے 11 سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ یہ درجہ 3 سے درجہ 5 تک کی تعلیم کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر زبان R1 اور R2 کی تدریس کے تعلق سے حکمت عملیوں کا بیان اس دستاویز کے حصہ C نکتہ 2.6.1.1 میں کیا گیا ہے۔

i. **زبان دانی کی تعلیم:** متنوع متن اور ادبی اصناف کی سماعت سے طلبا کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے، جس سے زبان بولنے میں مہارت پیدا ہوتی ہے۔ طلبا اپنی زبانی مہارتوں اور صلاحیتوں میں اُس وقت اضافہ کرتے ہیں جب وہ باقاعدگی سے اپنے تجربات، جو وہ سنتے یا پڑھتے ہیں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اسی طرح، خبریں (ریڈیو/ٹی وی)، فلمیں، سیریل، سب ٹائٹل کے ساتھ تعلیمی چینل، اور آڈیو- ویڈیو مواد سننے/دیکھنے والے طلبا کو اس بات کا فعال احساس دلاتا ہے کہ کیسے بولنا اور سننا ہے۔ ان آلات سے طلبا جو کچھ سنتے ہیں اس کے ذریعے انہیں جواب دینا، بیان کرنا، وضاحت کرنا، خلاصہ کرنا، بحث کرنا اور کردار ادا کرنا سکھایا جانا چاہیے۔

ii. **سمجھ کر پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا:** اس عمل میں الفاظ کے معنی اخذ کرنے سے لے کر تخیل اور تجربات کو مربوط کرکے متن کے مکمل مفہوم کو سمجھنے تک، مختلف مراحل شامل ہیں۔ سمجھ کر پڑھنے کے لیے ان تمام مراحل کو منظّم طریقے سے سکھایا جانا چاہیے۔ مختلف متون کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اساتذہ کو پڑھنے کی سرگرمیوں کو آسان بنانا چاہیے۔ اس سے طلبا پڑھنے کا لطف حاصل کریں گے اور

پڑھنے کی مختلف انواع کو تلاش کرتے رہیں گے۔ وقف شدہ لائبریری کے اوقات اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ طالب علم مختلف موضوعات پر مختلف کتابوں کے ساتھ مشغول رہیں۔ پڑھنے کی فہم پیدا کرنے کے لیے اونچی آواز میں پڑھنا، جو پڑھا گیا اس پر بحث کرنا، روانی کے لیے بار بار پڑھنا، مشترکہ مطالعہ کرنا، ہدایتی مطالعہ کرنا، آزاد مطالعہ کرنا، مطالعے کو سابقہ معلومات سے مربوط کرنا، اور خلاصہ کرنا وغیرہ حکمت عملیوں کا کمرہ جماعت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

iii. **تحریری مہارتوں کو فروغ دینا:** تحریری سرگرمیوں میں کسی بھی اہم اصلاح یا بہتری کے لیے کمرہ جماعت میں مستقل، دانستہ اور منظم مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحریری سرگرمیاں جو کہ دیے گئے متن کی نقل کرنے، سوالات کے جوابات کاپی پر لکھنے، اور جو کچھ یاد کیا گیا ہے اسے دوبارہ پیش کرنے تک محدود ہیں۔ مذکورہ سرگرمیاں تحریری مہارتوں کی حقیقی نشوونما میں مدد نہیں کرتی ہیں، اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ سب سے پہلے بامقصد بولنے کے ذریعے تحریر کو مؤثر طریقے سے سکھائیں اس کے بعد وہ طلبا کے سامنے تحریری اشکال اور طرز کے مختلف نمونوں کو پیش کریں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو اپنی رہنمائی میں لکھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ آزادانہ طور پر لکھنے کی جانب مائل کریں۔

iv. **ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا:** نئے الفاظ سیکھنا اور ان کے استعمال کو دوسری زبان کی مہارتوں کے ساتھ ضم کرنا، روزانہ کی تدریس کا حصہ ہونا چاہیے۔ طلبا کو لفظوں کے کھیلوں، لفظ سازی کی سرگرمیوں، لغت کا وسیع پیمانے پر استعمال کرنا سکھانا چاہیے۔ سیکھے گئے نئے الفاظ کا استعمال تقریر اور تحریر میں کرنے کی ترغیب دینا چاہیے۔ طلبا کتب خانے کی کتابوں کے ساتھ مشغول ہو کر بھی اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

2. **وسطانیہ (مڈل) مرحلہ:** اسکولی تعلیم کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس میں 12 سال سے 14 سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ یہ درجہ 6 سے درجہ 8 تک کی تعلیم کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر زبان R1 اور R2 کی تدریس کے تعلق سے حکمت عملیوں کا بیان اس دستاویز کے حصہ C نکتے 2.6.1.2 میں کیا گیا ہے۔

i. **تنقیدی سماعت اور زبانی پیش کش کی مہارتیں سکھانا:** وسطانیہ مرحلے کے طلبا تیاری مرحلہ کے طلبا کی بہ نسبت زبان کو زیادہ رسمی طور پر استعمال کرنا سیکھتے ہیں، اس لیے اس مرحلے پر زبان کی تدریس زبان کے عملی اور ادبی پہلوؤں پر مرکوز ہونی چاہیے۔ سماعت کی تنقیدی مہارتوں کی نشوونما، متنوع متن، سیاق وسباق، اور مختلف قسم کے ادب کی سماعت سے ممکن ہے۔ اس سے طلبا کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں کا فروغ ہوتا ہے۔ سننے اور بولنے کی سرگرمیاں کمرہ جماعت میں ایک ساتھ ہونی چاہئیں۔ اس میں کچھ مخصوص سرگرمیوں جیسے: پینل مباحثہ، گروہی مباحثہ، انٹرویو، اینکرنگ، عوامی تقاریر، فلموں، ڈراموں یا مختصر فلموں کے جائزے شامل ہوسکتے ہیں۔

ii. **مطالعہ کی مہارتوں کو فروغ دینا:** یہ وہ مرحلہ ہے جہاں 'سیکھنے کے لیے مطالعے' پر زور دیا جاتا ہے۔ اس میں درج ذیل سرگرمیاں شامل کی جاسکتی ہیں؛

❖ درخواستوں، خطوط، رپورٹ، دعوت نامے، ای میل، مضامین، پوسٹر اور سرکلر کے نمونوں کے ذریعے عملی مطالعے کی مہارتیں سکھائی جاسکتی ہیں۔ سوال و جواب کے ذریعے طلبا معلم کی مدد سے ان کے مقاصد کی شناخت اور تفہیم کرسکتے ہیں۔

❖ اس مرحلے میں ادبی مطالعے کی مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے، اساتذہ ادب سے متعلق مختلف سرگرمیاں؛ مثلاً، ہفتے کے لیے ایک صنف، یا ہفتے کے لیے ایک خیال لیے کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں، طلبا کو استعمال شدہ الفاظ کے اثرات بیان کرنا، بنیادی ادبی آلات کی شناخت کرنا، اور متن پڑھنے کے اپنے مجموعی تجربات کا اشتراک کرنا ضروری ہے۔

❖ تنقیدی مطالعے کی مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے، اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو افسانوی یا غیر افسانوی متن کا آزادانہ مطالعہ کرنے کی حوصلہ افزائی کریں اور مصنف کے زاویۂ نظر پر بات کرنے، سیاق وسباق کو سمجھنے، بنیادی مواد کی شناخت کرنے، اور ممکنہ معنی کی تشریح کرنے کے لیے مواقع فراہم کریں۔

طلبا کو لفظوں کے کھیلوں، لفظ سازی کی سرگرمیوں، لغت کا وسیع پیمانے پر استعمال کرنا سکھانا چاہیے۔ سیکھے گئے نئے الفاظ کا استعمال تقریر اور تحریر میں کرنے کی ترغیب دینا چاہیے۔ طلبا کتب خانے کی کتابوں کے ساتھ مشغول ہو کر بھی اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

❖ اسکولوں میں دلچسپ سرگرمیوں کے ذریعے طلبا میں مطالعے کے تئیں دلچسپی پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ سرگرمیاں زبان کی تدریس کا باقاعدہ حصہ ہونی چاہئیں۔ مثال کے طور پر، 'بک آف دی ڈے' (جہاں کسی منتخب کتاب سے اقتباسات کو کمرہ جماعت میں پڑھا جاتا ہے، طلبا کتاب میں پلاٹ لائن، کرداروں اور موضوعات پر بحث کرتے ہیں)، 'آتھر آف دی ڈے' (جہاں طلبا ایک ہی مصنف کی مختلف تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے انداز اور وسیع تر خدشات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں)، مقامی کتب خانے کا دورہ (جہاں طلبا کتابوں کی فہرست سازی، کتاب کی تلاش، اور کتب خانے کی دیکھ بھال کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں)، ادبی میلے کا اہتمام (جہاں کتابوں پر گفتگو، کتابوں کی نمائش، تخلیقی تحریری مقابلے، زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے مصنفین کے بارے میں نمائش ہوتی ہے)، جیسی سرگرمیوں کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔

iii. **تحریری صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے سرگرمیاں:** تحریری صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے دستاویز میں درج ذیل حکمت عملیاں بیان کی گئی ہیں۔

❖ عملی زبان لکھنے کی مہارتوں کا فروغ کرنے کے لیے طلبا کو مختلف قسم کی تحریریں بشمول مضامین، رپورٹس، ای میلز، بلاگز، اور سوشل میڈیا تبصرے اور پوسٹس لکھنے کے مواقع فراہم کرنا چاہیے۔ طلبا کو آزادانہ طور پر سوچنے اور لکھنے کی ترغیب دینا اور اپنی تحریر کی پروف ریڈنگ اور نظر ثانی کا موقع بھی فراہم کرنا چاہیے۔

❖ ادبی زبان لکھنے کی مہارتوں کا فروغ کرنے کے لیے تجرباتی تحریر یعنی جہاں طلبا کو ان کے اپنے تجربات اور ادبی کاموں کی تعریف یا تنقید کی بنیاد پر لکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے شامل ہونی چاہیے۔ یہاں تدریس میں اساتذہ کو نمونے فراہم کرنے، صفات اور حکمت عملیوں کی وضاحت کرنے، طلبا کو آزادانہ طور پر لکھنے کی ترغیب

دینے کے ساتھ ساتھ اپنے کام کی پروف ریڈنگ اور نظر ثانی کرنا بھی شامل ہونا چاہیے۔ ادب کی تنقید کے لیے طلبا کو، بعض اوقات اساتذہ کی مدد سے متن کو غور سے اور اکثر بار بار پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

3. **ثانوی مرحلہ:** اسکولی تعلیم کا یہ تیسرا اور آخری مرحلہ ہے۔ اس میں 15 سال سے 17 سال کی عمر تک کے بچوں کو تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ یہ درجہ 9 سے درجہ 12 تک کی تعلیم کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر زبان R1 اور R2 کی تدریس کے تعلق سے حکمت عملیوں کا بیان اس دستاویز کے حصہ C نکتہ 2.6.1.3 میں کیا گیا ہے۔

i. **زبانی پیشکش:** طلبا کو اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر شیئر کرنے اور دوسروں کے نقطہ نظر کو سننے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ انہیں سوالات بھی کرنے چاہئیں، اپنے خیالات پر بحث کرنا چاہیے اور دوسروں کے خیالات کو مناسب جواز کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ طلبا کو توجہ مرکوز مکالمے اور گفتگو کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ بہتر وضاحت کے لیے ان کے تصورات کو منظم کرنا، متعلقہ سوالات اٹھانے کا فن، ذہن سازی، اور بلند آواز میں سوچنا، فعال شرکت، اور ادبی تعریف کی مہارت کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کو رول پلے، بحث ومباحثہ، گروہی مباحثہ، اوپن ہاؤس مکالمہ، اور انٹرویو جیسے طریقے استعمال کرنا چاہیے تا کہ طلبا میں سوالات پوچھنے اور فوری جواب دینے کی مہارتوں کا فروغ ہو سکے۔ کلب پر مبنی سرگرمیاں، اسمبلی کے اجتماعات، اور اسکول میں تقریبات کو ان طریقوں پر عمل کرنے کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے اور اسے ایک الگ مشق کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ اساتذہ کو یہ سکھانے کے طریقے بھی تلاش کرنے چاہئیں کہ طلبا کی سننے کی مہارت اور روزمرہ زندگی میں اس کا استعمال کرنے (تفصیلات پر توجہ دینا، خلاصہ کرنا) پر کیسے کام کیا جائے۔

ii. **پڑھنے کی مہارتوں کا فروغ:** پڑھنے کی مہارتوں کے فروغ کے لیے دستاویز میں درج ذیل حکمت عملیاں بیان کی گئی ہیں۔

- ادبی زبان کی مہارتوں کا فروغ کرنے کے لیے ثانوی مرحلے پر، طلبا کو کمرہ جماعت میں کسی ادبی متن کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے لیے گروہی سرگرمیوں جیسے؛ اسکول ادبی کلب، شاعری گھر، اور افسانہ پڑھنے والے گروپس میں حصہ لینے کی ترغیب دی جانی چاہیے۔
- تنقیدی مطالعے کی مہارتوں کا فروغ کرنے کے لیے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو متنوع متن پر مبنی سوالات پوچھ کر معنی اخذ کرنے کے قابل بنانے پر توجہ مرکوز کریں۔
- کثیر ثقافتی تحریروں کو پڑھنے کی مشق کے لیے اساتذہ کو مختلف خطوں اور زبانوں سے متنوع متن لانا چاہیے اور طلبا کو پڑھنے اور پھر ان پر خیالات کا اشتراک کرنے کی ترغیب دینا چاہیے۔ دو مختلف مصنفین کے ادبی کاموں کا موازنہ جیسی سرگرمیاں؛ مصنف کی لفظیات، ثقافتی پس منظر اور کام کے سیاق وسباق کے بارے میں پوچھ گچھ کرکے اور اس صنف میں اسی طرح کے دیگر کاموں کے بارے میں بات کرکے مؤثر طریقے سے کی جاسکتی ہیں۔ پروجیکٹ، ڈرامے، لوک موسیقی پرفارمنس اور پوسٹرز اہم طریقے ہیں جن کے ذریعے اس مرحلے میں طلبا کو ایک مختلف دور کی تحریروں سے متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ کثیر ثقافتی تحریریں کتب خانوں میں دستیاب ہونی چاہئیں تا کہ طلبا فارغ وقت میں پڑھ سکیں۔

iii. **لکھنے کی مہارتوں کو فروغ دینا:** لکھنے کی مہارتوں کے فروغ کے لیے دستاویز میں درج ذیل حکمت عملیاں بیان کی گئی ہیں۔

- عملی زبان لکھنے کی مہارتوں کے فروغ کے لیے طلبا کو رپورٹس، مضامین، درخواستیں، ایڈیٹر کو خطوط، اشتہارات اور نوٹس لکھنے کی مشق کرنے کا کافی موقع دیا جانا چاہیے۔ طلبا کو رسائل، خبرنامے، اخبارات اور بلاگز لکھنے کی بھی ترغیب دی جانی چاہیے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو اچھی طرح سے منصوبہ بند اور اسکرپٹیڈ ویڈیوز بنانے، تعلیمی یوٹیوب چینل اور پوڈکاسٹ کے لیے منصوبہ بندی کرنے کی ترغیب دیں، اور طلبا کو ان ذرائع کے لیے صحیح قسم کا مواد چننے کے لیے رہنمائی فراہم کریں۔
- ادبی زبان لکھنے کی مہارتوں کے فروغ کے لیے طلبا کو اس مرحلے میں آزاد اور تخلیقی تحریر کی جانب رہنمائی کرنی چاہیے۔ انھیں ادب کا تجزیہ کرنے اور اسے تنہائی میں پڑھنے کے بجائے اس کے تاریخی، سماجی اور اقتصادی پہلوؤں سے مربوط کرنے کی صلاحیتیں سکھائی جائیں، تحریروں کا تنقیدی جائزہ کرنے کے قابل بنایا جائے۔ اساتذہ کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ طلبا ادبی آلات (مثال کے طور پر، تشبیہات، استعارے، مبالغہ، طنز، تضاد) کے ساتھ نظمیں، کہانیاں، یا ڈرامے لکھنے کی مشق کریں۔ طلبا جو پڑھتے ہیں اس کے مصنف کی آواز اور اسلوب کی شناخت کرنا سکھانا، اس سے اشارے لیتے ہوئے انہیں اپنی آواز تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو اپنی تحریروں کو بہتر بنانے میں مدد کرنے کے لیے مستقل بازرسی فراہم کریں۔ اس میں طلبا کی ادبی مہارتوں کی سطح، قواعد میں مہارت، اور تحریر میں اسلوب کی درستگی سے متعلق بازرسی شامل ہے۔

عملی زبان لکھنے کی مہارتوں کے فروغ کے لیے طلبا کو رپورٹس، مضامین، درخواستیں، ایڈیٹر کو خطوط، اشتہارات اور نوٹس لکھنے کی مشق کرنے کا کافی موقع دیا جانا چاہیے۔

کتابیات/ حوالہ جات

- National Curriculum Framework (School Education) 2023-NCERT, New Delhi.
- قومی تعلیمی پالیسی 2020، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند، اردو ترجمہ، شعبہ نشر واشاعت امارات شرعیہ پھلواری شریف، بہار
- ریاض احمد، تعلیم وتدریس کے عصری مباحث، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2022
- نجم السحر، صابرہ سعید، تدریس اردو، پریمیئر پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، 2006
- محی الدین قادری زور، تدریس اردو، یونک بک میڈیا، سرینگر، 2006
- بھارت کا آئین، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی، 2010

■

Dr. Afaque Nadeem Khan
Department of Educational Studies, Faculty of Education
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025
Mob.: 9981995549
akhan28@jmi.ac.in

اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی

عارفہ بشریٰ

اسکولی طلبا و طالبات ملک وقوم کی امانت ہیں لیکن اس امانت کی حفاظت اور ترقی کے معاملے میں ہم اردو اساتذہ کتنی دیانت داری سے کام لے رہے ہیں؟ اور خود ہمارے اندر اپنا فرض منصبی ادا کرنے کی کتنی صلاحیت (Experties,Qualities) ہے، یہ سوال ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سے وابستہ ہم تمام اساتذہ کے لیے ایک 'چیلنج' کا حکم رکھتا ہے۔

آج کی تاریخ میں اپنی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے صرف اردو ہی نہیں بلکہ دوسری دیسی اور مغربی زبانوں میں ہونے والے ریسرچ اور زبان وادب سے متعلق نئی اور غیر روایتی معلومات کی واقفیت بھی لازمی ہے۔اس سلسلے میں، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اساتذہ کی صلاحیتوں میں اسی وقت اضافہ ممکن ہوگا جب وہ مطالعے اور تدریس میں روایتی طریقہ کار کے بجائے تازہ ترین وسائل کمپیوٹر، گوگل، یوٹیوب، فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام اور دیگر سائنسی اور تکنیکی اجتہادی ذرائع اور طریقہ کار اپنائیں۔

آج کی ایک بڑی سچائی یہ بھی ہے کہ لوگ اونچی سے اونچی ڈگریاں لے کر اسکول اور کالج میں استاد کے منصب پر فائز تو ہو جاتے ہیں لیکن ایسے اردو اساتذہ کی کمی نہیں ہے جو اپنی 'ڈگری کو Justify کرنے کی بھی تشفی بخش صلاحیت نہیں رکھتے۔اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، کچھ تلخ بھی اور تیز بھی۔ چونکہ ''بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی''، لیکن دور تک جا کر ہی ہم اردو زبان اور ادب کے حوالے سے اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی کے لیے عملی اقدامات کر سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس موضوع کے بارے میں ہم سب مل جل کر غور و فکر کریں۔ یہاں ایک بات سے تو ہر شخص اتفاق کرے گا کہ علم و ادب ہو یا سائنس اور ٹکنالوجی یا اور بھی کوئی شعبہ علم، کوئی بھی شخص نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا۔ بڑے سے بڑے ماہر فن میں بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین کہیں آسماں نہیں ملتا

لہٰذا تعلیم کے میدان میں بھی کوئی شخص اپنے مضمون (Subject) میں کتنا بھی بے مثال کیوں نہ ہو، اسے بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی معلومات اور مہارت کو 'اپ ٹو ڈیٹ' (Up to Date) کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو صلاحیت سازی کی ضرورت صرف اسکول کے اردو اساتذہ کو ہی نہیں کالج اور یونیورسٹی کے تمام موضوعات کے اساتذہ کے لیے بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہر بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ زندگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے تقاضے بدل جاتے ہیں، قدریں بدل جاتی ہیں' ڈسکورس' اور آئیڈیالوجیز (Ideologies) بدل جاتی ہیں۔ مثلاً اردو زبان اور ادب کے آغاز وارتقا کے بارے میں سر سید، حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد سے لے کر رام بابو سکسینہ، عبدالقادر سروری تک نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کی بہت ساری معلومات پرانی ہو چکی ہیں۔ ان کی جگہ جمیل جالبی، تبسم کاشمیری اور سلیم احمد سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک نے جو نئی اور تازہ ترین معلومات فراہم کی ہیں وہ نئی اور اضافی تحقیق پر مبنی ہیں اور ان کے مطالعے سے اردو اساتذہ اردو زبان و ادب کے بارے میں اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ 'زبان' کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہر زمانے میں الگ الگ معنیٰ مطلب اور وضاحتیں پیش کی گئی ہیں مثلاً بیسویں صدی کے وسط تک 'زبان'' کے معانی بات چیت، بول چال، قول، بیان وغیرہ بتائے جاتے تھے۔ بعد میں لفظ زبان کی بناوٹ کے بارے میں کہا گیا کہ چند حروف کے بامعنی مجموعے کو 'لفظ' کہتے ہیں، لفظوں کے مجموعے کو جملہ اور جملوں کی ترتیب کو 'زبان' یا کلام کہتے ہیں۔ پھر بعد میں یہ کہا گیا کہ 'زبان' انسان کے دہن یا مُنھ سے نکلنے والی بامعنی آوازوں Sounds کے مجموعے کا نام ہے یہ بھی کہا گیا کہ ہر لفظ کسی نہ کسی چیز کے بدلے میں لکھا یا بولا جانے والا ایک نشان ہوتا ہے اور 'زبان' ان نشانات کے مجموعے کا ہی نام ہے۔' یہ ساری باتیں اپنے اپنے وقت کے حساب سے اپنی جگہ درست ہیں لیکن 1960 کے بعد زبان کے بارے میں فرانسیسی ماہر لسانیات اور دانشور سوسئیر (Ferdinand De Saussure) نے 'زبان' کے بارے میں ایسے سارے تصورات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ زبان کوئی مستقل اور قائم بالذات (Substantive) چیز نہیں ہے۔ اس کے بجائے سوسئیر نے زبان کا 'نسبتی' (Relational) تصور پیش کیا جس کے مطابق کہ زبان چیزوں کو نام دینے والا یعنی (Nomenclature) کا نظام نہیں ہے بلکہ معنیٰ اور مطلب میں فرق (Difference) پیدا کرنے والے نظام کا نام ہے۔ سوسئیر کا یہ تصور زبان' اس کی مشہور کتاب 'عام لسانیات' (A General Course In Linguistic) میں ملتا ہے جو پہلی بار 1960 میں انگریزی میں اور پھر دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی جن میں ہندوستانی زبانیں بھی شامل ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کے صفحات 59,60,61 پر اس کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اردو کے دوسرے ناقدین جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی اور ناصر عباس نیر بھی شامل ہیں زبان کے اسی تصور کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ لیکن

کیا پتہ کہ آنے والے وقت میں زبان کے اس تصور کو بھی بدل دیا جائے لیکن یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ زبان کے بارے میں صلاحیت سازی کے لیے مشرقی ماہرین لسانیات کے علاوہ مغرب کے دانشوروں سوسئیر، چامسکی، رومن جیکوبسن اور جولیا کرسٹیوا وغیرہ کے تصورات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

اسی طرح ادب کیا ہے؟ اس کے بارے میں عربی، فارسی اور مغربی زبانوں میں مختلف اور متضاد، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ادب کا تعلق 'ادبی ذوق' اور وجدان (Intution) سے ہوتا ہے اس لیے دو اور دو چار کی طرح ادب کی کوئی ٹھوس، مستقل اور سب کے لیے قابل قبول تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ اردو میں ان سب کا نچوڑ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کسی بھی بیش قیمت جذبہ یا احساس تجربہ یا مشاہدہ کو 'معنوی' اور 'صوری' اعتبار سے حسین اور بااثر الفاظ میں ادبی اصولوں کے مطابق بیان کیا جاتا ہے تو اس بیان کو 'ادب' کہا جاتا ہے۔ ادب جب بھی لکھا جائے گا وہ یا تو نظم یعنی شاعری کی شکل میں ہوگا یا نثر کی صورت میں۔ لیکن نظم اور نثر میں کیا فرق ہے؟ اس کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ 'کلام موزوں نظم (شعر) ہے اور کلام غیر موزوں 'نثر'۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنی کتاب 'شعر غیر شعر اور نثر' میں اس خیال کو رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ شعر میں نثر کی اور نثر میں شعر کی خوبیاں ہوسکتی ہیں بلکہ ہوتی ہیں مثلاً رجب علی بیگ سرور کے نثری قصے 'فسانۂ عجائب' میں اور کرشن چندر کے افسانوں میں شاعرانہ خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ اسی طرح میر حسن کی مثنوی 'سحرالبیان اور مرزا شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' میں اور علامہ اقبال کے بعض اشعار میں نثر کے عناصر ملتے ہیں۔ مثلاً

بہانے سے جا جا کے رونے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی

....

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

اور اقبال کے اس طرح کے شعر ۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

اس طرح کی مثالوں کی روشنی میں اساتذہ کو اپنی صلاحیت نکھارنے کے لیے یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ 'شعر کسے کہتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ

''شعر محض ہئیت ہے نہ تکنیک، صرف تجربہ ہے نہ مشاہدہ بلکہ ماہرانہ لسانی وعروضی ترتیب و تنظیم کے ساتھ مافی الضمیر یعنی من کی بات کے تخلیقی، بامعنی اور اثر انگیز بیان کا کون سا پہلو تحریر یا کلام کو شعر بنا دے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دوسری بات یہ کہ آپ سب کو پتہ ہے کہ اردو میں شعر و شاعری عربی اور فارسی سے ہو کر آئی، عرب میں 'دور جاہلیت' میں شاعری تو ہوتی تھی لیکن شاعری کی ہئیتیں یا شکلیں (Form) مقرر نہیں تھیں۔ دوسری بات یہ کہ امرؤالقیس جیسے بڑے شعرا فحش شاعری کرتے تھے۔ دین اسلام کے عروج کے بعد شاعری

> **اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی کے لیے ضروری ہے کہ انہیں بہترین اور تربیت یافتہ اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہو اور ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم اسکول کے اساتذہ کی تربیت کے معاملے میں کھرے نہیں اتر رہے ہیں۔**

میں اصلاح ہوئی، ایسی شاعری کی رسول اللہؐ نے مذمت کی تھی اور کہا تھا کہ ایسے شعر کہنے سے بہتر ہے کہ آدمی 'قے' سے اپنا پیٹ بھرے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اخلاق بگاڑنے والی شاعری اور فحش شاعری کرنے والے شعرا جہنم میں جائیں گے اور امرؤالقیس جیسا شاعر ان کی سرداری کرے گا۔ شعر کیا ہے اس کی سب سے جامع تعریف عربی دانشور قدامہ بن جعفر نے اپنی کتاب 'نقدالشعر' میں اس طرح پیش کی ہے کہ:

''شعر وہ کلام موزوں و مقفٰی ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے اور بالقصد لکھا جائے۔''

قدامہ بن جعفر نے 'بالقصد' کی شرط اس لیے لگائی کہ قران پاک کی آیات نثر میں تو ہیں لیکن ان میں شعریت اور غنائیت کے بھی بھرپور عناصر ہیں، لیکن قران پاک کلام ربانی ہے، قصداً کہا گیا انسانی کلام نہیں ہے۔ اردو میں آج تک شعر کی اسی تعریف کو مستند مانا جاتا ہے۔

دوسری مثال یہ دیکھیے کہ شاعری کی مقبول ترین صنف 'غزل' ہے۔ پہلے کہا اور پڑھایا جاتا تھا کہ ''غزل کے معنی عورتوں سے یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے' اگر آج یہ بات مان لی جائے تو علامہ اقبال، فیض، شہریار، فاروق نازکی اور حکیم منظور سے لے کر رفیق راز اور شفق سوپوری تک سیکڑوں شاعروں کی غزلیں، غزل کے دائرے سے باہر ہو جائیں گی۔ اسی لیے آج یہ کہا جاتا ہے کہ'' ہر وہ شعر غزل کا شعر ہو سکتا ہے جس میں کسی بھی مضمون کو عروض و بلاغت کی شرطوں کے مطابق نفاست، لطافت اور نزاکت کے ساتھ پرکشش انداز میں پیش کیا جائے۔ اسی طرح نثر اور نثری اصناف مثلاً افسانہ ناول، انشائیہ وغیرہ کے بارے میں بہت ساری نئی کتابیں آئی ہیں اور اساتذہ ان کے مطالعے سے بھی اپنی صلاحیت سازی کر سکتے ہیں۔ اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی کے لیے ضروری ہے کہ انھیں بہترین اور تربیت یافتہ اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہو اور ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم اسکول کے اساتذہ کی تربیت کے معاملے میں کھرے نہیں اتر رہے ہیں۔ اسکول کے اردو اساتذہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی صلاحیت سازی کی جائے۔ لیکن یہ فرض کون ادا کرے؟ اس سوال کا جواب بے حد دشوار ہے، اس لیے کہ آج کی تاریخ میں اعلیٰ تعلیم سے وابستہ ایسے اساتذہ کی بڑی کمی ہے جو واقعی اسکول کے اساتذہ کی صلاحیت سازی کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری تعلیمی پالیسی میں کوئی کمی ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ حکومت، یونیورسٹی یا بورڈ کی جانب سے معیاری تعلیم (Quality Education) کو بڑھاوا دینے میں کوئی کمی رکھی جاتی ہے۔ پھر بھی شہریار کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۔

گھر کی تعمیر، تصور ہی میں ہوسکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

لیکن اس کے باوجود بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت اور یونیورسٹی کی جانب سے تعلیم اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ U.G.C اور کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کئی طرح کے تعلیمی اور تحقیقی منصوبے اور پیشکش خاص طور پر 'صلاحیت سازی کے لیے بھی موجود ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔

Prof. Arifa Bushra
University of Kashmir
Sringar- 190006 (J&K)
Mob.:9469018998

محمد نور اسلام

زبان کی تدریس میں تخلیق کا دائرۂ عمل

بنی نوع انسان کو جتنی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں ان میں تخلیق بہت اہمیت کی حامل ہے، زندگی کے ہر پہلو پر تخلیقی عمل کا اثر بہت کارگر ہوتا ہے، جدت پسندی میں وہ قوت ہے جو ہر انسان کی توجہ کا مرکز بنتی ہے، انوکھا پن انسان کو محظوظ کرتا ہے، فطرتاً ہر انسان، شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کا طلب گار رہتا ہے، عربی کا بہت مشہور مقولہ ہے 'کل جدید لذیذ' ہر نئی چیز لذت بخش ہوتی ہے۔ نیا پن ہر میدان پر راج کرتا ہے، چاہے ادب ہو یا سیاست یا مختلف ایجادات واختراعات، نئی چیز کا پتہ لگتے ہی لوگ اسے دیکھنے اور اپنانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایک عظیم انسان کی عظمت کا دار و مدار اس کی تخلیقات ہیں، جو اس کو بلندیوں تک پہنچاتی ہیں۔ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی نے ضروریات زندگی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے، انھیں ضروریات نے ایجادات وتخلیقات کا احاطہ کشادہ کر دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ایک طرف تخلیقات میں مدد کرتی ہے تو دوسری طرف عوام تک ان تخلیقات کی ترسیل میں برق رفتاری سے کام لیتی ہے، نتیجتاً ہر میدان میں دن رات جدید مواد عوام کے حوالے ہو رہے ہیں، تخلیقات، نئے نئے طریقے اور جدید ٹیکنالوجی کے پر اثر استعمال نے درس وتدریس کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ وہ اساتذہ جن کے پاس تخلیقی صلاحیت ہے وہ آفاقی شہرت کے مالک ہوتے ہیں۔ ادب کا مقصد ہی انسان کی روحانی اور ذہنی صلاحیت کو ابھارنا ہے، بر ایں سبب ادب کی تدریس سے بھی اس صلاحیت کو جلا ملنی چاہیے۔

تخلیق کیا ہے؟

تخلیق کا اطلاق وسیع طور پر انسان کی خود ساختہ صلاحیتوں پر ہوتا ہے، اس کے دائرہ اثر گوناگوں ہیں۔ جیسے موسیقی، ڈرامہ، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی، یہاں تک کہ تجارت وحرفت اور معاشرت بھی اس میں شامل ہیں۔ (ٹوملنسن)1

درس وتدریس کا اصل مقصد انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ بنی نوع انساں کو جن صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے ان میں سب سے اعلیٰ تخلیقی صلاحیت ہی ہے، یہ ایک فطری صلاحیت ہے اور ہر ایک کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے مالک نسبتاً اعلیٰ یا ادنیٰ ہو سکتے ہیں، استاد درس وتدریس کے ذریعے ادنیٰ صلاحیتوں کے مالک کو اعلیٰ اور اعلیٰ تر بنانے کی سعی کرتے ہیں ہے۔

ذیل میں تخلیق کی مختلف جہات کا جائزہ لیا جا رہا ہے:

- نیا پن، اصلیت، اختراع، جدت، ابداع، ایجاد، انوکھا پن، غیر معمولی، نرالا پن۔
- ماضی کے واقعات سے مستقبل کے لیے ایک نیا نقش تیار کرنے کا نام تخلیق ہے۔ (ٹوملنسن)
- فوراً، بلا تاخیر، اضطراری، غیر ارادی، از خود، بیرونی تحریک کے بغیر۔
- تخلیق کار کہتے ہیں کہ ان کے اندر بصیرت اچانک آتی ہے (ٹوملنسن)
- تلاش، جستجو، تفتیش، تجسس، باطنی قوت۔
- نا قابل تصور کو تصور میں لانے کی صلاحیت تخلیق ہے۔ (ٹوملنسن)
- خداداد، القا، وجدان، کشف، بصیرت، وہبی تحریک، زندہ دلی۔ (ٹوملنسن)

تخلیق کو خداداد صلاحیت مان لینے سے ذہن صرف اور صرف چند مخصوص لوگوں کی طرف مائل ہوتا ہے، حالانکہ یہ صلاحیت ہر ایک کے اندر موجود ہوتی ہے، کسی کے اندر کم اور کسی کے اندر زیادہ۔

دو الگ الگ چیزوں کے درمیان تعلق قائم کرنے کا نام تخلیق ہے، ایک اچھا فن کار دو بعید اشیا کو اپنی تخلیقی قوت سے منسلک کر دیتا ہے۔ (ٹوملنسن)

استبصار (Visualization)

آئندہ ہونے والے واقعات کو ایک طالب علم پہلے ہی سے متصور کر سکتا ہے، ایک اچھا مقرر تقریر کرنے سے پہلے ہی تمام چیزیں متصور کر لیتا ہے، جن سے وہ عملی طور پر تقریر کرتے وقت روبرو ہونے والے ہیں۔

منوج واسودیو ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں آئندہ واقع ہونے والے ایک ایک فعل کا استبصار کرنے لگا، میں جیت حاصل کرنے کا استبصار کرنے لگا، میری تقریر کو لوگ کس قدر توجہ سے سنیں گے، لوگ میرے بارے میں کیا بات کریں گے، لوگوں کی تالیوں سے گونج اٹھنے کا استبصار کرنے لگا، میں اپنے ہاتھ میں ٹرافی (انعام) کو کس طرح پکڑوں گا، یہاں تک کہ ٹرافی کے وزن کو بھی محسوس کرنے لگا۔''

ایک اچھا مقرر عملی طور پر تقریر کرنے سے پہلے ہی اپنے ذہن میں پوری محفل سجا لیتا ہے، جیسے سامعین کی تعداد، نشست و برخاست، ان کے اندر پنپنے والے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے طریقے وغیرہ۔ وہ عملی تقریر کرنے سے پہلے ہزاروں بار تصوری تقریر کر چکا ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو مقابلے میں کامیاب ہونے سے کون

1. برین ٹوملنسن Anahein University USA میں شعبۂ لسانیات (TESOL) کے پروفیسر ہیں، ان کی اہم تصنیف ڈیلپوپنگ مٹریل فار لینگوتج ٹیچنگ ہے۔

روک سکتا ہے۔اسی طرح عظیم مصنف و شاعر، صدیوں بعد ہونے والے ممکنہ واقعات کواپنی بصیرت سے محسوس کر کے ان کا انکشاف کر لیتے ہیں۔

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

علامہ اقبال نے مردمومن یعنیSuper man کے پاور کا تصور کر کے اس کی تصویر کشی کی تھی اور بعد میں بعینہٖ ایسا ہی واقع ہوا۔اس شعر میں کہا گیا ہے کہ بڑے بڑے بھاری پتھر اس کے ہاتھوں آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کی ضرب کاری سے پہاڑ بالو کی طرح باریک ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ ایسا کس نے کیا؟ چھینی اور ہتھوڑے سے پہاڑ کاٹ کر راستہ کس نے بنایا؟ علامہ اقبال نے تصویر کشی کی اور دشرتھ مانجھی (The mountain man) نے سچ کر دکھایا۔

کلاس روم میں اس طرح کے باریک مسائل کو پیش کر کے طلبہ کے اندر استبصار کے متعلق باریک بینی پیدا کی جاسکتی ہے نیز ان کو عملی طور پر آس پاس ہونے والی اشیا کی عکاسی کرنے کی تلقین کی جاسکتی ہے۔ان کو فرضی طور پر کبھی پبلک اسپیکر، تو کبھی وزیر اعظم، کبھی ٹیچر، اور کبھی سماجی کارکن بنایا جائے، اور پھر ان سے تقریر کرائی جائے۔سماج کو اچھے اساتذہ، سیاست داں، مصنف، مقرر اور سماجی کارکن، ہر ایک کی ضرورت ہے۔ عملی طور پر یہ سب بننے سے پہلے کلاس روم میں ذہنی طور پر قابلیت کے لحاظ سے اس طرح کی شخصیت سازی ضروری ہے۔

سماج کو اچھے اساتذہ، سیاست داں، مصنف، مقرر اور سماجی کارکن، ہر ایک کی ضرورت ہے۔عملی طور پر یہ سب بننے سے پہلے کلاس روم میں ذہنی طور پر قابلیت کے لحاظ سے اس طرح کی شخصیت سازی ضروری ہے۔

تصوراتی نظام قائم کرنے کا دلچسپ طریقہ

خدائے سخن میر تقی میر ایک طرف عوام وخواص کے شاعر ہیں اور دوسری طرف شاعروں کے شاعر ہیں، ان کے والد نے ان کو عشق کرنے کی تلقین کی تھی، ان کے یہاں تجربات عشق کی ایک دنیا آباد ہے، وہ عشق کو دنیا کے معاملات سے الگ دیکھتے، بلکہ ان میں سمو دینا چاہتے ہیں:

”اے بیٹے عشق اختیار کر کہ (دنیا کے) اس کارخانے میں اسی کا تصرف ہے، اگر عشق نہ ہو، تو نظم کل کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی، عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ دل باختۂ عشق ہونا کمال کی علامت ہے، سوز و ساز دونوں عشق سے ہیں، عالم میں جو کچھ ہے، وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔“ (تاریخ ادب اردو (جلد دوم)، ڈاکٹر جمیل جالبی)

میر تقی میر کو یہ سکھایا گیا کہ دل باختۂ عشق ہونا کمال کی علامت ہے۔ دنیا کے اس کارخانے میں اسی کا تصرف ہے، جو کچھ بھی ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔ جب کوئی عشق کرتا ہے، چاہے عشق حقیقی یا عشق مجازی دونوں صورتوں میں معشوق سے متعلق خیالات کا ایک نظام قائم کرتا ہے، تصوراتی طور پر معشوق سے باتیں، سیر و تفریح کرنا، اٹھنا بیٹھنا، ناراض کرنا، منانا اور خیالوں میں گم ہو کر ایک نئی دنیا قائم کرتا ہے، یہ تضیع اوقات نہیں ہے، یہ وقت کا صحیح استعمال ہے، اس کے ذریعے ذہنی گوشے وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں، نتیجتاً عاشق کسی بھی مسئلے پر غور وفکر کرتا ہے، تو ایک جہاں آباد کر دیتا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

علامہ اقبال کا یہ شعر بھی اسی طرح کے نکتے کی غمازی کرتا ہے۔ یہ بات بھی زیر غور ہے کہ جب کوئی انسان رومانس کی دنیا میں کچھ دیر تک سیر نہیں کر سکتا، تو پھر کسی پیچیدہ مسئلے پر غور وفکر اور اس کے تمام پہلوؤں کو کیسے حل کر سکتا ہے۔

مسائل کا حل

ہمارے نظام تعلیم میں جس طرح کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ محض نمبرات و الفاظ کے ہیر پھیر ہیں۔ جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ملک میں ایک اچھی خاصی تعداد ان طلبہ کی ہے، جو مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں اسی طرح کے مسائل کو حل کرنے میں اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں۔اب تو ان مسائل کو حل کرنا بھی خود اپنے آپ میں ایک مسئلہ ہے۔

اصل مسائل تو حقیقی زندگی کے مسائل ہیں، جن پر مہارت حاصل کر کے خود اپنی اور ملک وملت کی ترقی ہو سکتی ہے، مثلاً دست کاری، فنون لطیفہ پر مہارت، سماج کے مختلف مسائل پر غور وفکر کرنے کے بعد بولنے، لکھنے اور انھیں حل کرنے کی مہارتیں اس میں شامل ہیں۔

لیکن حقیقی مسائل تو وہ تصوراتی مسائل ہیں، جو بظاہر کوئی مسئلہ ہی نہیں مثلاً بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے، کوئی یہ کہے کہ فضا میں گھر ہونا چاہیے اور اس مسئلے کو جو بظاہر کوئی مسئلہ ہی نہیں، غور کریں تو بہت سارے امکانات نظر آتے ہیں، مثلاً یہ کہ بادل لاکھوں ٹن وزنی ہونے کے باوجود فضا میں معلق ہے، تو سوکلو کا انسان ایک گھر بنا کر کیوں نہیں رہ سکتا۔ نیز بادل میں بغیر کسی پائپ کے اتنا پانی جمع ہوتا ہے، اور ہوائی جہاز بادل کے کلیجے کو چیرتے ہوئے نکل جاتا ہے، پھر بھی ایک قطرہ تک نہیں گرتا، لیکن جب بارش ہونی ہوتی ہے اور جہاں ہونی ہوتی ہے، ہو جاتی ہے، تو جب فضا میں اتنے سارے عوامل سرگرم عمل ہیں تو پھر وہاں انسان کے بسنے کے امکانات کیوں نہیں؟۔ان مسائل پر بات کرنا ایک ادیب کا کام ہے اور سائنس داں کی ذمے داری حقیقت میں عمل کر دکھانا ہے۔

اشکال ستہ کی مشق

ق،م،ر، ایک مادہ ہے اب اگر اسے ہیئت ممکنہ کی طرف تبدیل کرتے جائیں تو چھ صورتیں بنتی ہیں:

الفاظ	معنی	عام معانی	توضیح
قمر		بہ آہستگی ظاہر ہونا	چاند میں آہستہ آہستہ روشنی کا بڑھنا
			اور گھٹنا ظاہر ہے۔
قرم	سردار قوم		سردار تک پہنچنا تدریج کو بتاتا ہے
رمق	تھوڑی سی جان		سانس یا نبض آہستہ آہستہ چل کر
	جو باقی رہ گئی ہو		اس کی حیات کو ظاہر کرتی ہے

رقم	لکھنا		حروف کا نقش بن کر لفظ اور لفظوں سے جملے بنانا
مقر	زہر قاتل		زہر کا جسم میں اثر کرنا اور موت کو ظاہر ہونا
مرق	شوربا		آہستہ آہستہ تیار ہوتا ہے

ان چھ الفاظ میں سے ہر لفظ بامعنی ہے اور ساتویں ہیئت کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی کے ساتھ اگر گہری نظر سے معانی ستہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ ستہ کے عام معانی ایسے قرار دیے جا سکتے ہیں، جو ہر ایک میں قدر مشترک کا حکم رکھتے ہوں، مثلاً بہ آہستگی ظاہر ہونا۔

اسی طرح نالج کے لیے اردو میں علم کا استعمال ہوتا ہے، اسے اگر ہیئت ممکنہ کی طرف تبدیل کرتے جائیں تو۔

علم: جاننا
عمل: کام کرنا
لعم: لعاب دہن
لمع: چمکنا یا روشن ہونا
ملع: تیز وسبک چلنا
معل: کام میں جلدی کرنا

اس عمل سے کلاس میں کھیل کھیل میں بچے الفاظ کی ذخیرہ اندوزی کر سکتے ہیں، نیز باریک بینی سے معانی کے درمیان تعلقات قائم کر سکتے ہیں، ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ باطنی معانی پر بھی غور وفکر کر سکتے ہیں۔ (المبین: علامہ سلیمان اشرف بہاری)

مزاحیہ عنصر

آج کل بیشتر لوگ جذباتی، ذہنی تناؤ اور مشقتوں سے دوچار ہیں، ان کے اضمحلال کو دور کرنے کے لیے ملک کے مختلف مقامات پر لافٹر تھراپی کلب کا انتظام ہے، جہاں ہنسنے کی تربیت دی جاتی ہے، اس کے علاوہ تفریح کے ذرائع فلم، ڈرامے ،موسیقی، سونگ، مختلف ریڈیو پروگرام، سوشل میڈیا وغیرہ اسی نوعیت کے ہیں، لیکن ان سب سے وقتی خوشی کی حصولیابی کے بعد انسان مغموم ہو جاتا ہے، یہ Allopathy دوا کی طرح ہے جس کا سائڈ افیکٹ بہت زیادہ ہے، اس لیے اس طرح کی محفل میں شامل ہونے کے بجائے اپنے کام کو ہنسی کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ ہر کام کو کھیل کھیل میں کیا جا سکتا ہے اور ہر کوئی کر سکتا ہے۔

''ہنسی آنے کا سبب دو متضاد اشیا کا ایک جگہ جمع ہونا ہے، جو توقع اور امر واقع کے درمیان ہو اور اچانک نظر کے سامنے آجائے۔''

''مزاح زندگی کی ناہمواریوں پر ہمدردانہ غور وفکر کرنے اور ان کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔''

''انسان جس نہج سے سوچ رہا ہے اسے بار بار پلٹا دینا، اسے تعجب میں ڈال دینا اور نتیجتاً بار بار ہنسا دینا یقیناً ایک تخلیقی عمل ہے۔''

(اردو کی مزاحیہ صحافت: ڈاکٹر فوزیہ چودھری)

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب — بڑھا اور جس سے میرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں — اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال — قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی — تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے — دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں — خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر — مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا — دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں — مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں
جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار — پروتی ہوں ہر روز اشکوں کا ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی — گئے چھوڑ اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب — دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی میری — نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی میری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا — دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے ؟ — تیرے آنسوؤں نے بجھایا اسے !

طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے مذکورہ بالا نظم کی تدریس میں بہت ساری سرگرمیاں ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

بلند خوانی

- نظم عورت کی آواز میں پڑھی جائے۔
- مختلف اوقات اور مختلف اشیا کی وجہ سے آواز ہونی چاہیے۔

تصویر کشی

- منفرد تصاویر، مثلاً پسر اور قدم وغیرہ کی تصاویر۔
- متحرک تصاویر مثلاً چلنا، دیا جلنا، اشک بہانا، کہنا، رونا، لرزنا۔
- اجتماعی تصاویر مثلاً جماعت، لڑکوں کی قطار۔

ڈرامائی کیفیت

نظم کا پلاٹ کلاس روم میں عملی طور پر ڈرامائی انداز میں پیش کیا جائے۔ مثلاً خواب سنانا، لڑکوں کو قطار میں کھڑا کرنا، سب کے ہاتھوں میں دیا جلتا ہوا دکھانا، لڑکے کا جماعت میں سب سے پیچھے ہونا اور ہاتھ میں دیا کا نہ جلنا۔

فکری عنصر

اس نظم میں دیا نہ جلنے کی وجہ ماں کے آنسو کو کیوں بتایا گیا ہے؟

احساسات

کلاس روم کا ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ نظم میں جو کچھ کہا گیا ہے، بچے اسے خود اپنی ذات میں محسوس کریں۔ مثلاً اضطراب کی کیفیت، دہشت، اندھیری رات اور راستہ بھی نہیں معلوم، اچانک پسر کی تمثیل کر رہے لڑکے کا نظر آجانا، جدائی کی وجہ سے رونے کی کیفیت۔

■

Mohd Noor Islam
Research Scholar, Dept of Educational Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Cell.:8802933134
nooremisbahi786@gmail.com

شیخ عقیل احمد

پیاس کی بازگشت

قدیم سنسکرت سے جدید اردو تک کا ایک ادبی سفر

'پیاس کی بازگشت: قدیم سنسکرت سے جدید اردو تک کا ایک ادبی سفر' مختلف زبانوں اور ثقافتوں میں شاعری کی بھرپور روایت کو بیان کرتا ہے، جو پانی کے تحفظ کے اہم موضوع کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ مضمون پانی کی کمی سے نمٹنے کی فوری ضرورت پر زور دیتا ہے، خاص طور پر بھارت میں شدید گرمی کی لہروں اور زیر زمین پانی کی گرتی ہوئی سطح کی روشنی میں، اور آبی وسائل پر مستقبل میں تنازعات کے امکانات۔ ریسرچ کا آغاز سنسکرت شاعری سے ہوتا ہے، جہاں کالیداس کے کام پانی کی زندگی کو برقرار رکھنے والی خصوصیات کو مناتے ہیں اور اس کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔ ہندی شاعری کے ذریعے یہ سفر جاری ہے، رامدھاری سنگھ دنکر، اٹل بہاری واجپائی، سمترانندن پنت، اور ہری ونش رائے بچن جیسے شاعروں نے فصاحت کے ساتھ پانی کے جوہر اور اسے محفوظ کرنے کی ضرورت کو بیان کیا۔ بنگالی شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے پانی کو روشن خیالی اور روحانی پرورش سے جوڑ کر اس داستان کو مزید تقویت بخشی۔ اردو شاعری، جس کی نمائندگی علامہ اقبال، فیض احمد فیض، اور پروین شاکر جیسے روشن خیالوں نے کی ہے، پانی کی روحانی اور وجودی اہمیت کی عکاسی کرتی ہے، اور اس کی احتیاط پر زور دیتی ہے۔ ان ادبی عکاسیوں کے ذریعے یہ مضمون واضح کرتا ہے کہ کس طرح مختلف ادوار اور خطوں کے شاعروں نے پانی کے تحفظ کی اہمیت کو مسلسل اجاگر کیا ہے۔ ان کی لازوال بصیرت اس اہم وسائل کی حفاظت کے لیے ہماری اجتماعی ذمے داری کی ایک طاقتور یاددہانی کے طور پر کام کرتی ہے۔ مضمون میں پانی کے پائیدار انتظام کے طریقوں کو اپنانے، عوامی بیداری میں اضافہ اور پانی کے تحفظ کو فروغ دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے اس قیمتی وسائل کی دستیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ 'پیاس کی بازگشت' ان شاعروں کی پائیدار حکمت کو خراج تحسین ہے جنھوں نے طویل عرصے سے پانی کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے، انسانیت پر زور دیا ہے کہ وہ اسے ایک انمول تحفے کے طور پر پالیں اور اسے محفوظ رکھیں۔

اس سال، بھارت نے تمام تاریخی ریکارڈ توڑتے ہوئے بے مثال گرمی کی لہروں کا تجربہ کیا ہے۔ انتہائی درجہ حرارت کی وجہ سے سیکڑوں ہلاکتیں ہوئیں، جو انسانی زندگیوں پر موسمیاتی تبدیلی کے شدید اثرات کو واضح کرتی ہے۔ اس تناظر میں ملک کے مختلف حصوں میں پینے کے پانی کی قلت ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ زیر زمین پانی کی سطح تیزی سے کم ہو رہی ہے، بحران کو بڑھا رہا ہے۔ آبی وسائل پر مستقبل کے تنازعات کا تصور تیزی سے حقیقت پسندانہ ہے، ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ تیسری عالمی جنگ پانی پر لڑی جا سکتی ہے، اس کے بعد ممکنہ طور پر چوتھی جنگ۔ یہ خطرناک امکان پانی کے تحفظ کی مؤثر حکمت عملیوں کی فوری ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔ پانی زندگی کی تمام اقسام کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کمی سے انسانی بقا، زرعی پیداواری صلاحیت اور ماحولیاتی نظام کی پائیداری کو خطرہ ہے۔ چونکہ آبادی میں اضافے اور معاشی ترقی کی وجہ سے پانی کی طلب میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس اہم وسائل کو محفوظ کرنے اور اس کا نظم ونسق کرنے کی ناگزیر ضرورت ہے۔

پانی کی اہمیت پر غور کرتے ہوئے، سنسکرت، ہندی اور اردو شاعروں کی لازوال بصیرت کو یاد کرنے کے علاوہ کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ان شاعروں نے طویل عرصے سے پانی کی کمی اور تحفظ کی ضرورت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا ہے۔ قدرتی دنیا کے بارے میں ان کی حساسیت اور پانی کے تحفظ کے بارے میں ان کے بصیرت افروز خیالات اس نازک مسئلے کے بارے میں گہری آگاہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ آج ان کے الفاظ ہمیں آنے والی نسلوں کے لیے پانی کی حفاظت کی اجتماعی ذمہ داری کی یاد دلاتے ہیں۔ سنسکرت ادب کے مشہور شاعروں اور ڈرامہ نگاروں میں سے ایک کالیداس نے اکثر اپنی تخلیقات میں فطرت اور اس کے عناصر خصوصاً پانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس قیمتی وسائل کے تحفظ کی اہمیت پر بھی واضح طور پر زور دیا ہے۔ ہندی ادب میں، رامدھاری سنگھ دنکر، اٹل بہاری واجپائی، سمترانندن پنت، اور ہری ونش رائے بچن جیسے شاعروں نے پانی کے اہم کردار اور اس کے تحفظ کی اشد ضرورت کو فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری پانی کے ہر قطرے کی باطنی قدر اور اس کے تحفظ

کی ذمے داری کی ایک پُر جوش یاد دہانی کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح اردو ادب میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور پروین شاکر جیسے نامور شاعروں نے اپنی شاعری میں پانی کے جوہر کی عکاسی کی ہے۔ زندگی اورفطرت کو برقرار رکھنے میں اس کے ناگزیر کردار کو اجاگر کیا ہے۔ ان ادبی شراکتوں کو تلاش کرنے سے، ہم پانی کےتحفظ کی ثقافتی اور جذباتی جہتوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ شاعرانہ عکاسی نہ صرف ایک تاریخی تناظر فراہم کرتی ہے بلکہ عمل کی ایک لازوال دعوت بھی دیتی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ہم پانی کے انتظام کے جامع طریقوں کو اپنائیں، پانی کے پائیدار استعمال کو فروغ دیں، اور پانی کےتحفظ کی اہمیت کے بارے میں عوامی بیداری کو بڑھائیں۔ایسا کرنے سے ہم انسانیت اور کرۂ ارض کی بھلائی کے لیے ان قیمتی وسائل کی دستیابی کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ آیئے بیرون ہند پانی کے معاصر مسائل کے تناظر میں 'کالیداس نے میگھ دوت، رتوسمہار، رگھونش کمارسمبھو میں جو کہا ہے' اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

میگھ دوت میں اشلوک ہے:

''خوش قسمت ہے وہ جو بادل کے ذریعے لے جانے والے پیغام کو حاصل کرے گا، جو دور دراز کی زمینوں پر گہری سانس لیتا ہے، وندھیا پہاڑوں سے الٰہی پانی پیتا ہے اور راما گیری کی بلند چوٹیوں پر آرام کرتا ہے۔''

اس اشلوک میں، کالیداسا نے خوبصورتی سے بادل کو ایک پیغامبر کے طور پر ظاہر کیا ہے جو زندگی کو برقرار رکھنے والا پانی وسیع فاصلے تک لے جاتا ہے۔ وندھیا پہاڑوں سے آنے والے الٰہی پانی اور بلند چوٹیوں پر آرام کرنے والے بادل کا حوالہ قدرتی عناصر کے باہم مربوط ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ تصویر پہاڑی علاقوں اور پانی کے ذرائع کے تحفظ کی اہمیت کو واضح کرتی ہے، جو ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے اور پانی کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے اہم ہیں۔ ہندوستان اور دنیا کے دیگر حصوں میں، پہاڑی علاقوں اور ان کے آبی ذرائع کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ یہ علاقے اکثر واٹرشیڈ کے طور پر کام کرتے ہیں، جو نیچے دھارے والے علاقوں کو ضروری میٹھا پانی فراہم کرتے ہیں۔اشلوک صاف صاف پانی کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے قدرتی پانی کے سائیکل کے احترام اور قدرتی مناظر کے تحفظ کی اہمیت کی ترغیب دیتا ہے۔

رتوسمہار میں کالیداس کہتے ہیں:

''زمین نئی گھاس سے کھلتی ہے اور بہت زیادہ بارش کے ساتھ بہتی ہے، زندگی کا ذریعہ بنتی ہے، تمام جانداروں کے لیے ٹھنڈک اور سکون لاتی ہے۔''

'رتوسمہار' کا یہ بند مون سون کے موسم کا جشن مناتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ بارش کس طرح زمین کو پھر سے جوان کرتی ہے۔ یہ سرسبز اور ہرا ہے۔ وافر بارش سے بہہ جانے والی زمین کا حوالہ پانی کی زندگی بخش اور جوان کرنے والی طاقت کی عکاسی کرتا ہے، جو نباتات اور حیوانات کو یکساں طور پر برقرار رکھتا ہے۔ بھارت سمیت دنیا کے کئی حصوں میں مون سون کا موسم زراعت اور پانی کی فراہمی کے لیے اہم ہے۔ تاہم، موسمیاتی تبدیلی اور جنگلات کی کٹائی ان قدرتی سائیکلوں میں خلل ڈال رہی ہے، جس کی وجہ سے یا تو زیادہ بارشیں اور سیلاب یا شدید خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اشلوک قدرتی رہائش گاہوں کو برقرار رکھنے اور ان تبدیلیوں سے نمٹنے اور آبی وسائل کی حفاظت کے لیے پانی کے پائیدار انتظام کو یقینی بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

رگھوونش میں دیکھیے کالیداس نے کتنی خوب صورتی سے پانی کے بارے میں لکھا ہے:

''جس طرح بارش دینے والا بادل بوجھ سے لدا ہوا ہے، لیکن زمین کو خوشی دیتا ہے، اسی طرح بادشاہ اپنی کوششوں سے اپنی رعایا کو خوشی دیتا ہے۔''

کالیداسا بادل کے پانی کے بوجھ اور بادشاہ کی ذمہ داریوں میں مشابہت کی تصویر کھینچی ہے، تصور کریں کہ دونوں، اپنے بوجھ کے باوجود، خوشی اور زندگی لاتے ہیں۔ اس اشلوک کا مطلب یہ ہے کہ بڑی طاقت اور وسائل کے ساتھ یہ ذمے داری بھی آتی ہے کہ وہ سب کے فائدے کے لیے ان کو دانشمندی سے استعمال کریں۔ اس مشابہت کو جدید گورننس اور پائیدار پانی کے انتظام کی پالیسیوں کی اہمیت تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ حکومتوں اور حکام کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود کو بڑھانے کے لیے آبی وسائل کی منصفانہ تقسیم اور تحفظ کو یقینی بنائیں۔

کمارسمبھام کے اشلوک میں پانی کے حوالے سے کہا گیا ہے:

''جیسے پانی خشک زمین میں زندگی لاتا ہے، اسی طرح بارش خشک جھیل میں زندگی لاتی ہے۔''

یہ اشلوک پانی کو زندہ کرنے والی قوت کے طور پر پیش کرتا ہے جو خشک جھیل کو زندہ کرتا ہے، ایکولوجی پانی کو برقرار رکھنے میں پانی کی ضروری نوعیت پر زور دیتی ہے۔

خشک سالی اور آبی ذخائر کے سکڑنے کی وجہ سے پانی کے عالمی بحران نے پانی کے تحفظ اور پائیدار استعمال کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے اور آنے والی نسلوں کے لیے پانی کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے تحفظ کی کوششوں اور پائیدار طریقوں کے ذریعے قدرتی آبی ذخائر کو زندہ کرنا اور محفوظ کرنا ضروری ہے۔ کالیداس کے اشلوک زندگی اور قدرتی ماحول کو برقرار رکھنے میں پانی کے اہم کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ پانی کا ان کا شاعرانہ جشن اس کے تحفظ کی ضرورت کی لازوال یاد دہانی ہے۔ ان شاعرانہ بصیرت پر غور کرنے سے، ہم ہندوستان اور عالمی سطح پر پانی کے جدید چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے اہم سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ پانی کا پائیدار انتظام، قدرتی پانی کا تحفظ اور ذمے دار حکمراں پانی کی کمی کو دور کرنے اور سب کے لیے پائیدار مستقبل کو یقینی بنانے کی کلید ہیں۔ کالیداس کی لازوال حکمت ہمیں پانی جیسے قیمتی وسائل کا احترام اور تحفظ کرنے کی ترغیب دیتی رہتی ہے۔

ہندی شاعری سماجی اور ماحولیاتی مسائل کے بارے میں علم کی دولت سے بھری پڑی ہے، جن میں پانی کا تحفظ ایک اہم موضوع ہے۔ ہندی کے مشہور شاعروں نے پانی کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی فوری ضرورت کا بہت مؤثر انداز میں اظہار کیا ہے۔ رام دھاری سنگھ دنکر، اٹل بہاری واجپائی، سمترا انندن پنت اور ہری ونش رائے بچن کی ہندی نظموں میں پانی کے تحفظ کی اہم ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ان کی بصیرت ہندوستان اور عالمی سطح پر درپیش پانی کے مسائل کے ساتھ گہری گونجتی ہے۔ عصری آبی چیلنجوں کے تناظر میں ہر بند کا تجزیہ حسب ذیل ہے:

رامدھاری سنگھ دنکر کویتا میں پانی کے بارے میں کہتے ہیں:

''ہر قطرہ برتن کو بھرتا ہے، یہ کہاوت سچ ہے، امرت کا یہ قطرہ زمین کی پیاس بجھاتا ہے، پانی کو ضائع

مت کرو، کیونکہ ہر قطرے میں زندگی ہے۔ پانی کے بغیر یہی زندگی ہے اور دنیا کا وجود۔'ناممکن') دنکر کی نظمیں پانی کے ہر قطرے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں، اور ان ریاستوں میں پانی کے ضیاع کو روکنے کے لیے دنکر کی طرف سے دی گئی شدید قلت کے مسائل کی عکاسی کرتی ہے۔ جہاں ہندوستان میں 600 ملین سے زیادہ لوگ پانی کے شدید تناؤ کا سامنا کر رہے ہیں، یہ بارش کے پانی کی ذخیرہ اندوزی، موثر آبپاشی کی تکنیکوں اور زیر زمین پانی کے ریچارج کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے جو پانی کے محدود وسائل کو مؤثر طریقے سے منظّم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

اٹل بہاری واجپائی پانی کو زندگی کا جوہر کہتے ہیں۔ دیکھیے یہ کویتا:

''پانی زندگی کا جوہر ہے، پانی زندگی کی امید ہے،
اگر ہو سکے تو اسے بچائیں، کیونکہ ہر قطرے میں دنیا ہے۔''

واجپائی کی کویتا زندگی کے لیے پانی کے جوہر کو بہت ہی پُر جوش انداز میں پیش کرتی ہیں۔ پانی کا عالمی بحران، جو ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں ممالک کو متاثر کر رہا ہے، پانی کے پائیدار انتظام کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ ہر قطرے کو بچانے کی ان کی اپیل ہندوستان کے علاوہ کیپ ٹاؤن، کیلیفورنیا اور آسٹریلیا کے کچھ حصوں میں گونجتی ہے، جو شدید خشک سالی کا شکار ہیں۔ یہ عالمی تناظر پانی کے تحفظ کی کوششوں کی فوری ضرورت کو اجاگر کرتا ہے، بشمول پانی کے ضیاع کو کم کرنا، قدرتی آبی ذخائر کی حفاظت کرنا، اور پانی کی کمی کو مؤثر طریقے سے دور کرنے کے لیے پانی کی بچت کی ٹیکنالوجیز کو نافذ کرنا۔

سمترا نندن پنت ندیوں کے جل کو امرت کے مانند قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''دریاؤں کا پانی امرت کی مانند ہے، ہو سکے تو اس کا احترام کریں، اسے آلودگی سے بچائیں، ہر قطرے کو نعمت بنائیں۔''

پنت کی نظم دریا کے پانی کی پاکیزگی اور قدر اور اسے آلودگی سے بچانے کی ضرورت پر روشنی ڈالتی ہے۔ بھارت کے بڑے دریا جیسے گنگا اور یمنا شدید آلودگی کا شکار ہیں، جس سے لاکھوں لوگ متاثر ہوتے ہیں جو پینے، نہانے اور آبپاشی کے لیے ان پر انحصار کرتے ہیں۔ عالمی سطح پر، آبی ذخائر کو صنعتی فضلے، زرعی بہاؤ اور شہری سیورتج سے اسی طرح کے خطرات کا

اُردو شاعری میں پانی کے تحفظ سمیت سماجی اور ماحولیاتی مسائل کو حل کرنے کی ایک بھرپور روایت ہے۔ اردو کے کئی مشہور شاعروں نے پانی کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

سامنا ہے۔ احترام اور تحفظ کے لیے پنت کی کال کلین گنگا مشن اور بین الاقوامی کوششوں جیسے اقدامات کے مطابق ہے جس کا مقصد پانی کی آلودگی کو کم کرنا ہے، اس طرح اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ دریا اور جھیلیں صاف پانی کے اہم ذرائع رہیں۔

ہریونش رائے بچن نے اپنی ایک نظم میں پانی کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ہے:

''ہر قطرے کی قدر کو سمجھو، سمجھو کہ پانی زندگی کی اصل ہے، ہو سکے تو اسے بچاؤ، کیونکہ یہ زندگی کا دھارا ہے۔''

ہریونش رائے بچن کی نظمیں پانی کے ہر قطرے کی اندرونی قدر پر زور دیتی ہیں، زندگی کو برقرار رکھنے میں اس کے بنیادی کردار کو اجاگر کرتی ہیں۔ زندگی کا یہ نقطہ نظر ان علاقوں میں اہم ہے جہاں پانی کی شدید قلت ہے، جیسے کہ سب صحارا افریقہ اور ہندوستان کے کچھ حصے۔ پانی کی قدر کرنے اور بچانے کے لیے ان کی شاعرانہ یاد دہانی پانی کے تحفظ اور پائیدار استعمال کے طریقوں کے لیے عالمی کوششوں سے گونجتی ہے۔ ان میں موثر زرعی طریقوں، شہری پانی کا انتظام، اور کمیونٹی سے چلنے والے پانی کے تحفظ کے اقدامات شامل ہیں، جو پانی کی کمی کو کم کرنے اور پانی کی پائیدار دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ ان شاعرانہ بصیرت پر غور کرنے سے افراد اور پالیسی سازوں کو پانی کے مزید پائیدار طریقوں کو اپنانے کی ترغیب مل سکتی ہے، اس طرح ہمارے لوگوں کی فلاح و بہبود کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے پانی فراہم کر سکتے ہیں۔ ان شاعروں کے پیغامات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پانی ایک مشترکہ وسیلہ ہے جس کے لیے اجتماعی ذمے داری اور کارگر عمل کی ضرورت ہے، جو ہندوستان اور بیرون ملک پانی کے مسائل کی باہم مربوط نوعیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ہندی شاعری سے آگے بڑھتے ہوئے، بنگالی ادب بھی پانی کی اہمیت کے بارے میں گہری بصیرت فراہم کرتا ہے، رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شاعروں نے اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اپنی نظم 'نماز' (دعا) میں ٹیگور نے خوبصورتی سے پانی کے جوہر اور اس کی زندگی بخش خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔

''جہاں منطق کا واضح دھارا اپنا راستہ نہیں کھو گیا ہے۔
مردہ عادت کی ویران صحرا کی ریت میں؛
جہاں دماغ آپ کی رہنمائی کرتا ہے
ہمیشہ سوچ اور عمل میں اضافہ''

یہاں ٹیگور نے پروان چڑھانے والی زندگی اور فکر میں پانی کی پاکیزگی اور ضرورت پر نہایت باریک بینی سے زور دیا ہے، پانی کے صاف دھارے کو روشن خیال منطق اور ترقی پسند فکر سے جوڑ دیا ہے۔

'گولڈن بوٹ' میں ٹیگور نے انسانوں اور پانی کے درمیان تعلق کا اظہار کیا ہے:

''سنہری دن کے اختتام پر سنہری کشتی غروب ہوتی ہے اور سورج غم کے دریا میں غروب ہوتا ہے۔ میں نیلے آسمان کو دیکھ کر ساحل پر انتظار کرتا ہوں، اور سنہری کشتی دریا میں چلی جاتی ہے۔'' یہ منظر کشی زندگی کی عارضی نوعیت اور ایک پائیدار قوت کے طور پر پانی کی لازوال اہمیت کی عکاسی کرتی ہے، اس کی قدر کرنے اور اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

اردو شاعری میں پانی کے تحفظ سمیت سماجی اور ماحولیاتی مسائل کو حل کرنے کی ایک بھرپور روایت ہے۔ اردو کے کئی مشہور شاعروں نے پانی کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آیئے ہم اردو کے ممتاز شاعروں کی تین نظموں کا جائزہ لیں اور ان کا تجزیہ کریں جو پانی کے تحفظ پر مرکوز ہیں۔

علامہ اقبال کی نظم 'آب حیات' بھی پانی کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کرتی ہے۔

پانی کے قطروں میں ہے چھپی ہوئی حقیقت
اک بوند میں سمندر کی ہے وسعت
حفاظت کرو اس دولت کی، یہ آبِ حیات
زندگی کی ہر بوند ہے اہم، کرو حفاظت

علامہ اقبال کی نظم 'آب حیات' پانی کی باطنی قدر کو اجاگر کرتی ہے اور اسے زندگی کے جوہر کے طور پر

پیش کرتی ہے۔ وہ استعاراتی طور پر کہتا ہے کہ پانی کے ہر قطرے میں سمندر کی وسعت موجود ہے جو کہ پانی کی معمولی مقدار کی بھی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک اہم وسیلے کے طور پر پانی کے تحفظ کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

احمد فراز 'قطرہ قطرہ' میں کہتے ہیں۔

قطرہ قطرہ زندگی، قطرہ قطرہ پانی
سنبھال کر رکھنا، یہ خزانہ ہے زندگانی
گر برباد کیا، تو پچھتاوگے تم
ہر بوند میں ہے زندگی، یہ سمجھے گا زمانہ

'قطرہ قطرہ' میں احمد فراز، زندگی کا موازنہ پانی کے قطروں سے کرتے ہیں، اور اسے احتیاط سے سنبھالنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ پانی کو خزانہ قرار دے کر، وہ زندگی کو برقرار رکھنے میں اس کے ناگزیر کردار کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ پانی کے ضیاع پر احتیاط اور اس کے نتیجے میں پچھتاوے محتاط استعمال اور تحفظ کے طریقوں کی ضرورت کی ایک طاقتور یاد دہانی ہے۔

اسی طرح پروین شاکر کی نظم 'آب کا نوحہ' ہے، جس میں وہ پانی کے قطروں کو انمول کہتی ہیں۔

کی جڑوں سے نکلتی تھی جو روانی
وہ چشمے خشک ہو گئے، پانی کا نوحہ سنا دو
یہ بوندیں قیمتی ہیں، سونا ہے یہ خزانہ
بچا لو اس کو، ورنہ خواب بن جائے گا یہ فسانہ

پروین شاکر کا 'آب کا نوحہ' شاعرانہ طور پر چشموں اور ندیوں کے خشک ہونے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے جو قدرتی پانی کے ذرائع کی کمی کی علامت ہے۔ ان قطروں کو انمول کہہ کر اور انھیں سونے کی طرح بیان کرتے ہوئے، وہ ان کی قدر پر زور دیتی ہے۔ اس کا انتباہ کہ پانی کے تحفظ کو نظر انداز کرنا پانی کی دستیابی کی حقیقت کو ختم کر دے گا، اس اہم وسائل کی حفاظت اور تحفظ کے لیے محض ایک خواب ایک سنجیدہ کال (دعوت) کے طور پر کام کرتا ہے۔

علامہ اقبال، احمد فراز اور پروین شاکر کے منتخب اشعار پانی کے تحفظ کے اہم مسئلے کو مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ شعرا پانی کی اہمیت اور اسے بچانے کی اشد ضرورت کے اظہار کے لیے وشد نقش و نگار اور استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ہندوستان اور عالمی سطح پر پانی کے موجودہ مسائل کے تناظر میں گہرائی سے گونجتی ہیں، زندگی کو برقرار رکھنے میں پانی کے ضروری کردار اور اس کی بربادی کے سنگین نتائج کو اجاگر کرتی ہیں۔ اپنی شاعرانہ بصیرت کے ذریعے، یہ اردو شاعر پانی کے لیے زیادہ سے زیادہ تعریف اور اس کے تحفظ کے لیے وابستگی کی ترغیب دیتے ہیں، اور ہمیں آنے والی نسلوں کے لیے اس قیمتی وسائل کی حفاظت کے لیے ہماری اجتماعی ذمے داری کی یاد دلاتی ہیں۔

ان شاعروں نے اپنی نظموں کے ذریعے زندگی اور ماحولیاتی نظام کو برقرار رکھنے میں پانی کے اہم کردار کو واضح طور پر پیش کیا ہے اور انسانیت پر زور دیا ہے کہ وہ اس انمول وسیلے کی قدر کریں اور اسے محفوظ رکھیں۔ اس کے الفاظ اردو کی نظمیں نسل در نسل نغمہ سرا رہیں گی، اور ہمیں موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بھلائی کے لیے پانی کی حفاظت کرنے کی ہماری ذمے داری یاد دلاتی ہیں۔ مختلف زبانوں اور ثقافتوں میں ان ادبی شراکتوں کی کھوج کرتے ہوئے، ہم پانی کے تحفظ کی ثقافتی اور جذباتی جہتوں کا گہرا ادراک کرتے ہیں، بڑھتے ہوئے ماحولیاتی چیلنجوں کے پیش نظر ان کی نظموں میں موجود حکمت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ پائیدار طریقوں کو اپنانا اور ایک ایسے مستقبل کے لیے کام کرنا جہاں پانی کی قدر، تحفظ اور سب کے لیے قابل رسائی ہو۔ پیاس کی ان لازوال بازگشتوں پر توجہ دے کر، ہم انسانیت اور کرۂ ارض کی بھلائی کے لیے ان قیمتی وسائل کی دستیابی کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

کتب اور حوالہ جات

1. اقبال، علامہ، بانگ درا
یہ علامہ اقبال کی اردو شاعری کا مجموعہ ہے جو فلسفیانہ، روحانی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری اکثر قدرت اور پانی کی اہمیت پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور انسانیت کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگی میں رہنے کی تلقین کرتی ہے۔

2. بچن، ہری ونش رائے، مدھوشالا
ہری ونش رائے بچن کی مدھوشالا مشہور ہندی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کے استعاراتی انداز کی وجہ سے یہ کام مختلف انسانی تجربات اور زندگی کے گہری جوہر پر روشنی ڈالتا ہے، جس میں قدرت اور اس کے عناصر، جیسے پانی کا ذکر بھی شامل ہے۔

3. دنکر، رامدھاری سنگھ، رشمرتھی
رشمرتھی رامدھاری سنگھ دنکر کا ایک اہم کام ہے جو مہابھارت کے کرن کی مہاکاوی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ دنکر کی قدرت کے بارے میں شاندار تصویریں اور معاشرتی اور ماحولیاتی توازن کے لیے ان کی وکالت قدرتی وسائل، بشمول پانی، کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

4. کالی داس، میگھ دوت
میگھ دوت کالی داس کی ایک کلاسیکی سنسکرت نظم ہے جس میں ایک محبت بھرے یکشا نے بادل کے ذریعے پیغام بھیجا ہے۔ یہ نظم قدرتی مناظر کو شاندار طریقے سے بیان کرتی ہے، جو پانی کی زندگی دینے والی خصوصیات اور اس قیمتی وسیلے کو عزیز رکھنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

5. پنت، سُمترا نندن، پلاو
پلاو سُمترا نندن پنت کی قدرت سے متاثر شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کا کام اپنی گیتا کی خوبصورتی اور قدرت کی گہری تعریف کے لیے جانا جاتا ہے، جس میں زندگی کے برقرار رکھنے میں پانی کے اہم کردار کی تشہیر شامل ہے۔

6. شاکر، پروین، خوشبو
خوشبو پروین شاکر کی مشہور اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کا کام جدید موضوعات کو روایتی نقشوں کے ساتھ ملا کر، قدرتی دنیا پر غور کرتا ہے اور اس کی پاکیزگی، بشمول پانی، کی حفاظت کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔

7. ٹیگور، رابندر ناتھ، گیتا نجلی
گیتا نجلی رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کا مجموعہ ہے جس نے انھیں ادب میں نوبل انعام دلایا۔ یہ نظمیں قدرت، روحانیت، اور انسانی تعلق کے موضوعات کو بیان کرتی ہیں، اکثر پانی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے۔

8. واجپائی، اٹل بہاری، میری اکیاون کویتائیں
یہ سابق بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی شاعری کا مجموعہ ہے اس کی نظمیں مختلف معاشرتی اور سیاسی مسائل پر ان کے خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔ اکثر قدرتی وسائل کی اہمیت پر زور دیتی ہیں اور پانی کے تحفظ کی حمایت کرتی ہیں۔

■

Prof. Shaikh Aquil Ahmad
42, Shipra Sun City, Indirapuram
Ghaziabad- 201014 (UP)
Mob.: 9911796525,8851448754
Email.: aquilahmad2@gmail.com

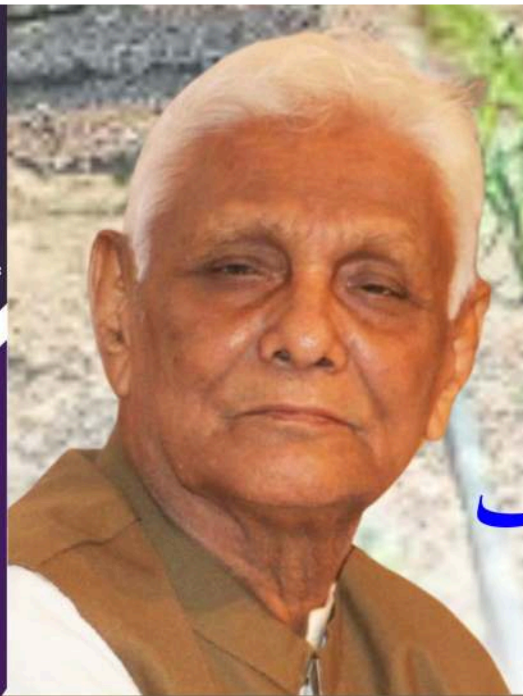

اشتیاق سعید

ظفر گورکھپوری

کی شخصیت اور شاعری میں مٹی کی مہک

ظفر گورکھپوری.. درمیانہ قد، دھان پان جسم، کشادہ پیشانی، سوچتی آنکھیں، بے لوث دِل، خوش مزاج طبیعت اور مکر وفریب سے عاری چہرہ رکھنے والے ایک ایسے بلند حوصلہ انسان کا نام ہے جو ضلع گورکھپور کا افتخار ہے۔

جی ہاں! ظفر گورکھپوری کی ولادت 5 مئی 1935 کو ضلع گورکھپور کی تحصیل بانس گاؤں کے ایک موضع بیدولی بابو میں ہوئی۔ گھرانہ امیر کبیر نہ تھا۔ ہاتھ کرگھے پر کپڑا بُننے والا اور کاشتکاری کرنے والا ایک افلاس زدہ خاندان تھا۔ جہاں جہالت کی تاریکی کے ساتھ ساتھ مسائل کے بے شمار ایسے اندھے کنویں بھی تھے، جنھیں تنہا پاٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ غرض کہ کئی پُشتیں جیسے تیسے زندگی کر کے انھیں کنوؤں کو اپنا آخری قیام گاہ بنایا اور اسی مٹی تلے دب کر سو رہے۔ لیکن ظفر صاحب کے والد ماجد جیسے تیسے زندگی گزارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ کیونکہ وہ بھلی بھانتی سمجھ چکے تھے کہ بھوک جنم کی ہوک ہے۔ چنانچہ وہ مسائل کے اندھے کنویں سے نجات چاہتے تھے۔ کافی غور وخوض کے بعد انھوں نے اس اندھے کنویں کو خیر باد کہہ دینے کی ٹھانی اور شہر کی جانب کوچ کرنے کا تہیہ کیا۔ گاؤں گراؤں کے دو ایک لوگ ممبئی میں چاکری کرتے تھے۔ اِن کی آس اور ممبئی شہر کی غریب پروری انہیں ممبئی کھینچ لے گئی۔ ہفتہ عشرہ ٹھاؤں ٹھاؤں بھٹکا کیے۔ کام تو بہتیرے تھے مگر من بھاتے نہ تھے۔ یوں بھی بے دام کی غلامی انھیں پسند نہ تھی۔ بہرحال! کافی تگ ودو کے بعد کُرلا کی ایک کپڑا مِل میں بحیثیت بُنکر ملازمت طے ہوگئی۔

ظفر گورکھپوری کا بچپن گاؤں کے پُر فضا ماحول میں اٹکھیلیاں کرتے، لہلہاتے کھیتوں میں جھومتے، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مٹر گشتی کرتے، ہر بھری چراگاہوں میں گائے بکریوں کے درمیان قلانچیں بھرتے، انگڑائی لیتی ندی کے بدن پر چھپاکے مارتے گزرا ہے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ اس زمانے میں مکتب آبادی سے دور کسی گھنے درخت کے زیر سایہ ہوا کرتا تھا۔ اطراف کے دوسرے گاؤں

> ظفر گورکھپوری کا بچپن گاؤں کے پُر فضا ماحول میں اٹکھیلیاں کرتے، لہلہاتے کھیتوں میں جھومتے، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مٹر گشتی کرتے، ہر بھری چراگاہوں میں گائے بکریوں کے درمیان قلانچیں بھرتے، انگڑائی لیتی ندی کے بدن پر چھپاکے مارتے گزرا ہے۔

کے بھی بچے وہاں اِکٹھا ہوا کرتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ معلم کی خدمت بھی گویا نصاب میں شامل تھی۔ مثلاً اِن کی گائے بکریاں چرانا، اِن کے کھیتوں میں کام کرنا، جنگل سے سوکھی لکڑیاں چننا، کھیتوں سے سبزی ترکاری لا کر پکانے میں مدد کرنا، کنویں سے پانی کھینچنا وغیرہ۔۔۔ یہ تمام کام دوسرے طلبہ کی بہ نسبت ظفر گورکھپوری انتہائی خوش دِلی سے بلکہ ایک اہم فریضہ سمجھ کر انجام دیا کرتے تھے۔ انھیں اپنے کھیتوں میں بھی کام کرنے میں خاصا لطف آتا تھا۔ بالخصوص آب پاشی کے وقت کھیت میں کیاریاں بنانا، کیاریوں کے درمیان نالیاں بنانا اور کنویں پر چل رہے رہٹ پر بیلوں کو ہانکنا۔ انھیں رہٹ کی پُر لطف آوازیں اور بیلوں کے گلے میں بندھے گھنگروؤں کی چھم چھم بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اِن آوازوں سے اِس قدر محظوظ ہوتے کہ اکثر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔

ظفر گورکھپوری کے ساتھ گاؤں میں رہنے والے غیر مسلموں کے بچے بھی مکتب میں اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گاؤں کی فضا میں تعصب کی بادِ سموم نہیں بلکہ یکجہتی اور بھائی چارگی کی پروائیاں بہا کرتی تھیں۔ ہندو، مسلم سبھی مل جل کر رہا کرتے تھے۔ ہولی، دیوالی، عید اور محرم ساتھ ساتھ منایا کرتے تھے۔ ظفر گورکھپوری بھی اپنے ہم جولیوں کے ساتھ دیوالی پر دیپ جلاتے اور ہولی پر پھاگ گاتے ہوئے گلال اڑاتے اور رنگ کھیلتے۔ غرض کہ گاؤں کے ملے جلے نفرت و تعصب سے پاک ماحول کا اِن کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اسی باعث ان کا مزاج مشترکہ تہذیب، یکجہتی اور انسانی قدروں کا دِلدادہ ہوتا گیا۔

ظفر گورکھپوری 1944 میں ممبئی آئے۔ تب سے دمِ آخر تک یہیں رہے۔ اب ایسا بھی نہیں کہ انھوں نے گاؤں سے بالکل ہی رشتہ توڑ دیا تھا۔ گاؤں سے

وابستگی ہی کی خاطر انھوں نے شادی وہیں کی لڑکی سے کی۔ تاکہ اِس تعلق سے کبھی کبھار آنا جانا ہوتا رہے۔ کہتے ہیں عورت عمر کی چاہے جس منزل پر ہو وہ سب کچھ بھول سکتی ہے لیکن اپنا میکا یعنی بابل کا دیس نہیں بھولتی۔ اگر چہ ظفر گورکھپوری مرد تھے لیکن عورتوں والی یہ خصلت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنے اجداد کے گھر کو، کھیت کھلیان کو کبھی بھول نہ سکے وہ ممبئی کے شہری ماحول سے بیزار تھے۔ وہ یہاں سے رہائی چاہتے تھے۔ ہزار ہا کوششوں کے باوجود وہ اِس زنداں سے آزاد نہ ہوسکے۔ شاید اسی لیے کہا تھا۔

آدھی صدی سزا کی طرح کاٹ کے ظفر
اب بمبئی سے اُٹھ کے کدھر جایئے گا آپ
سالم تھا اپنے گاؤں کی کچّی سڑک پہ میں
ٹکڑوں میں کس نے بانٹ دیا بمبئی سے پوچھ

ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود اِن کے اندر جب کبھی گاؤں کی مٹی کلبلاتی ہے تو وہ شدتِ غم سے بے ساختہ پُکار اُٹھتے ہیں۔

ارے خاکِ وطن، او ارضِ گورکھپور کی مٹی
مجھے پردیس کے غم سے چھڑا لیتی تو اچھا تھا
میں اک چلتا ہوا لاشہ ہوں اِن انجان گلیوں میں
کہ اِس لاشے کو چھاتی سے لگا لیتی تو اچھا تھا

ظفر گورکھپوری سرزمین کرلا سے تقریباً چالیس برس وابستہ رہے۔ ثانوی تعلیم انجمن اسلام کرلا ہائی اسکول سے حاصل کی۔ جیسے تیسے آٹھویں جماعت تک پہنچ پائے اور تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ چند سال یوں ہی بیکار بھٹکا کیے۔ پھر قصائی باڑہ، کُرلا مشرق کے میونسپل اسکول میں بطور چپراسی ملازمت اختیار کرلی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک شباب پر تھی۔ اس تحریک نے ظفر گورکھپوری کو کیفی اعظمی اور سردار جعفری سے قریب کیا۔ ظفر گورکھپوری ہی کے ایما پر 1958 میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد کرلا میں ڈالی گئی، اور انھیں سکریٹری کا عہدہ دیا گیا۔ ظفر گورکھپوری اپنی ذمے داری انتہائی دیانت داری اور خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ دوسرے بہت سے شعرا ادبا کو اس انجمن سے جوڑا۔ ہفتہ عشرہ میں کسی نہ کسی کے مکان پر نشستیں منعقد کرتے۔ اِن نشستوں میں کبھی مجروح سلطانپوری، کبھی سردار جعفری، کبھی مہندر ناتھ تو کبھی کیفی اعظمی مہمانِ خصوصی ہوتے۔ کیفی ظفر گورکھپوری کی اس کارکردگی سے خوش تھے مگر انھیں جب یہ پتا چلا کہ ظفر اسکول میں چپراسی کی حیثیت سے ملازم ہیں تو انہیں کافی ملال ہوا۔ انہوں نے دوسرے ہی دن اپنے جیب خاص سے ظفر گورکھپوری کی فیس جمع کروائی اور انھیں میٹرک امتحان کی تیاری کرنے کو کہا۔ ظفر نے جیسے تیسے میٹرک امتحان پاس کرلیا۔ غلام نبی خان ان دنوں کرلا کے کارپوریٹر ہوا کرتے تھے ان سے کیفی صاحب نے سفارش کی اور ظفر گورکھپوری کو اسی اسکول میں بحیثیت مدرس لگوا دیا جس میں وہ چپراسی تھے۔

ظفر گورکھپوری یوں تو پندرہ برس کی عمر سے ہی مصرعے موزوں کرنے لگے تھے لیکن باقاعدہ شاعری کی ابتدا 1952 میں کی۔ پہلا قابلِ قبول شعر جو کہا تھا ملاحظہ فرمائیں۔

ماہِ لقا یہ کیسا ہے اِضطراب تیرا
ڈھلتا ہی جارہا ہے کیونکر شباب تیرا

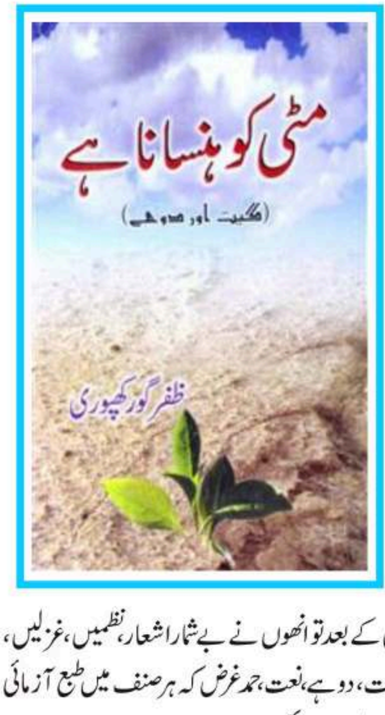

اس کے بعد تو انھوں نے بے شمار اشعار، نظمیں، غزلیں، گیت، دوہے، نعت، حمد غرض کہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی رہے۔

ظفر گورکھپوری کا پہلا شعری مجموعہ 'تیشہ' 1962 میں شائع ہوا۔ جس نے نوجوان لکھنے والوں کے ذہن پر خاصہ خوشگوار اثر مرتب کیا۔ نتیجتاً ایک سہ ماہی میں پہلا ایڈیشن یعنی ہزار نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے۔ ہوتا بھی کیوں نا؟ پانچ سو نسخوں کی قیمتیں پیشگی لے لی گئی تھیں اور انھیں ایک رسید عنایت کردی گئی تھی کہ کتاب کی اشاعت کے بعد رسید دِکھانے پر کتاب کی وصولیابی ممکن ہوگی۔ یہ عمل کامیاب ہوا۔ بعد کو دوسرے

وہ اپنے اجداد کے گھر کو، کھیت کھلیان کو کبھی بھول نہ سکے وہ ممبئی کے شہری ماحول سے بیزار تھے۔ وہ یہاں سے رہائی چاہتے تھے۔ ہزار ہا کوششوں کے باوجود وہ اِس زنداں سے آزاد نہ ہوسکے۔

احباب اور اہلِ کُرلا نے بھی کتابیں خریدیں۔ اس دور میں گھر گھر کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ عوام میں ادب فہمی تھی۔ معاشرے میں شعر و ادب کا ماحول تھا۔

فراق گورکھپوری نے 'تیشہ' کے تعلق سے لکھا تھا کہ

''حال میں کوئی مجموعہ نظم مشکل سے اتنا مقبول ہوا ہوگا جتنا کہ 'تیشہ'۔ اگر ہمارا ملک اتنا بدنصیب نہ ہوتا تو 'تیشہ' کی پچاسوں ہزار کاپیاں اہلِ ذوق کے ہاتھ میں ہوتیں۔ 'تیشہ' کی نظمیں فن کے معیار پر پوری اُترتی ہیں جسے پڑھ کر ہزار ہا آدمیوں کے دِل کی چوٹیں اُبھر آتی ہیں۔''

'تیشہ' کی مقبولیت نے ایک اثر یہ دِکھایا کہ کئی شاعر (خصوصاً کُرلا میں) ظفر گورکھپوری کے لہجے اور اسلوب کی نقل کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اِن کے افکار کے چراغوں سے اپنے چراغ جلانے لگے۔ میرے نزدیک یہ خوش آئند امر ہے۔

کتنی صدیوں کی آگ میں تپ کر
تیری دہلیز تک میں آیا ہوں
ایک پرچھائیں، جس کا نام اُمید
ساتھ اپنے بچا کے لایا ہوں

'تیشہ' کے بعد 'وادیِ سنگ'، 'گوکھرو کے پھول'، 'چراغِ چشمِ تر'، 'ناچ ری گڑیا' (بچوں کے لیے) اور زمین سے قریب شائع ہوئیں۔ 'چراغ چشمِ تر' اِن کے جواں سال بیٹے جاوید ظفر کی موت پر ایک بدنصیب باپ کی آہِ جگر سوز ہے۔ روح کی ایک دِلدوز پکار ہے، شاعری نہیں۔

'چراغِ چشمِ تر' کے تعلق سے سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس سے پہلے کسی نے کسی کی موت پر ایسی خوبصورت کتاب نہیں لکھی۔ خوبصورت اور اثر انگیز... ظفر نے ذاتی غم کو کائناتی غم بنا دیا ہے۔ یہی اچھی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اس طرح درد کا اظہار انسان کو

درد سے بلند کر دیتا ہے۔''

ظفر گورکھپوری جھوٹ، منافقت، ریاکاری سے کافی حد تک محفوظ تھے۔ کسی کو گرا کر یا دھکیل کر آگے بڑھنے والی سیاست کے قطعی قائل نہیں رہے۔ مزاج درویشانہ تھا۔ سادگی اِن کی شخصیت کا خاص عنصر تھی۔ اِن کی سادگی سے متاثر ہوکر کرناٹک کے ایک شاعر برق بنگلوری نے لکھا ہے:

''ظفر گورکھپوری جیسے قدآور شاعر کی سادگی دیکھ کر میں حیران رہ گیا''

واقعی انھیں اچھے لباس یا سوٹ بوٹ کی زیبائش کا قطعی شوق نہیں تھا.. نمائش سے تو گناہ کی حد تک پرہیز رکھتے تھے۔ بڑی بڑی فلمی اور غیر فلمی پارٹیوں میں نہایت سادگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ پتلون بشرٹ یا کُرتا پاجامہ پاؤں میں سادی چپل بس!۔ ان کی اس سادگی کے کارن لوگ باگ اِن سے بلا تکلف اپنی پریشانیاں، دکھ تکلیف بیان کر دیتے تھے اور وہ کافی حد تک اِن کی پریشانیوں کو رفع کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری سے، بہت سی سیاسی شخصیتیں بھی متاثر تھیں۔ اسی وجہ سے ہر کس و ناکس کا کام وہ بڑی آسانی سے کروادیتے تھے۔ ان کی اسی مقبولیت نے انھیں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کے کوٹے سے محض دس فیصد رقم کی ادائیگی میں شہر کے مہنگے اور پوش علاقے میں ایک شاندار فلیٹ کا مالک بنا دیا۔ جس میں وہ اپنی آخری سانس تک قیام پذیر رہے۔

کرلا مغرب میں محمود درّانی چوک کے بنیاد گزاروں میں ظفر گورکھپوری سرفہرست رہے۔ پائپ روڈ، کرلا میں ایک چال کا نام 'اردو باغ' رکھوایا۔ کرلا میں رہنے بسنے والے بہت سے احباب کے کئی سیاسی معاملات حل کروائے۔ میونسپل اسکولوں کے بہت سے ٹیچروں کے مسائل کا ازالہ کروایا۔ اِن کے اِس طرح کے کاموں کا ہدیہ محض آدھا کپ چائے، ایک پناما سگریٹ اور ایک پان ہوا کرتا تھا۔

کرلا اور اطراف کے بہت سے شعرا فلموں میں نغمہ نگاری کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے۔ لیکن ظفر گورکھپوری نے کبھی اس جانب توجہ نہیں کی باوجود اس کے موسیقار اور فلمساز اِن کے پاس چلے آتے اور اپنی فلم میں نغمہ لکھنے کی گزارش کرتے۔ ظفر صاحب ایسے میں اُن شعرا کا نام تجویز کرتے جو فلموں میں نغمہ نگاری کے لیے در در بھٹکا کرتے تھے، کافی منّت سماجت کے بعد اگر راضی ہوتے تو پہلے فلم کی کہانی سنتے۔ کہانی لائقِ قدر ہوتی تب سچویشن پوچھتے۔ پھر دوسرے دِن اُنہیں بُلوا کر گیت اُن کے حوالے کر دیتے۔ ہاں! معاوضے کے معاملے میں رعایت بالکل نہ کرتے۔ گزشتہ صدی کی 11 ستمبر 1995 کو پلس چینل کے 'سنگیت ستارہ' پروگرام میں دورانِ انٹرویو جب اِن سے پوچھا گیا کہ فلموں میں بھر پور پیسہ ملتا ہے اِس کے باوجود آپ فلموں کو وقت کم دیتے ہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا تھا: ''دُنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں۔ دِل کا سکون بھی کوئی چیز ہے۔''

فلموں سے کہیں زیادہ مقبولیت انھیں غزل سنگرس سے ملی۔ پنکج اُدھاس، انوپ جلوٹا، جگجیت سنگھ چترا سنگھ، بھوپیندر سنگھ، پیناز مسانی وغیرہ نے اِن کی کئی غزلیں

> ظفر گورکھپوری ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کے شاعر تھے۔ ہندوستان کی مٹی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مہک رہی ہے۔

گائیں جو مشہور بھی ہوئیں۔ غزلوں سے قبل قوالوں نے بھی ان کے کلام خوب گائے۔ ان کے کلام آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے بہت سے ممالک میں مقبول ہیں۔ اتنی شہرت کے باوجود تکبر اِن کے پاس سے بھی نہیں گزرا تھا۔

ظفر گورکھپوری نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ کرلا ممبئی کی جھوپڑ پٹیوں میں گزارا۔ عمر کے آخری ایام میں قسمت نے اندھیری (مغرب) کے پوش کالونی میں ایک عالیشان فلیٹ عطا کر دیا تھا۔ یہ فلیٹ کافی قیمتی اور کشادہ تھا تاہم وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ فلیٹوں کو ایک ایسے خوبصورت مقبرے کے مشابہ سمجھتے تھے، جہاں زندگی تو ہے لیکن بے کیف! بے رنگ!! کیونکہ فلیٹوں کے دروازے ہمہ وقت بند رہتے ہیں۔ یہاں پڑوسیوں کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے فلیٹ میں داخل ہوتا ہے اور دروازہ بند۔ یعنی آدمی گھر کا قیدی ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے تھے۔ ''یار! ممبئی میں میرے نصیب میں گھر کہاں؟ گھر تو میں گاؤں میں چھوڑ آیا، جہاں سردیوں کی نرم دھوپ میں گھر کے باہر پوال پر بیٹھ کر بھنے ہوئے مٹر چبانے اور گنے کا رس پینے کا اپنا ایک الگ ہی مزہ ملتا تھا۔''

ظفر گورکھپوری ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کے شاعر تھے۔ ہندوستان کی مٹی اِن کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مہک رہی ہے۔ اِس تعلق سے ڈاکٹر افضال الدین خان (ریڈر گورکھپور یونیورسٹی) نے لکھا تھا کہ ''ظفر کی شاعری گاؤں اور شہر کے درمیان بس جانے والے فرد کی شاعری ہے۔ گاؤں جس کا احساس اُردو غزل میں نہیں کے برابر ہے، ظفر صاحب کی شاعری میں ایک بڑا اور مستقل موضوع بن کر سامنے آیا ہے۔ یہ ظفر کے لیے نہیں، اردو شاعری کے لیے بھی نیک فال ہے''۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی بھی ظفر گورکھپوری کی شاعری میں ہندوستانی مٹی کی مہک سے متاثر ہوکر بے ساختہ کہتی ہیں۔

''ظفر وہ شاعر ہیں جن کے لفظ لفظ میں ہندوستان کی مٹّی کی بو آتی ہے۔''

بے شک ظفر گورکھپوری جاں نثار اختر کے بعد وہ واحد شاعر تھے، جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ جدید شاعری سے لفظ و خیال کا رشتہ جوڑ کر اردو شاعری کو مخصوص اِزم سے نکال کر خالص ہندوستانی فضا اور ہندوستانی دھرتی پر لانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ وہ زندگی کی سچائیوں کے شاعر تھے۔ اس لیے اِن کی شاعری بھی سچ کی طرح ہمیشہ زندہ جاوید رہے گی، اور انھیں بھی فراق گورکھپوری کی مانند گورکھپور کا اعتبار سمجھا جائے گا۔ آج ان کی غیر موجودگی کانوں میں سرگوشی کرتی معلوم ہورہی ہے، ایسا گمان ہوتا ہے گویا کہہ رہی ہو۔

گاؤں، گلی، یہ کنج، یہ سائے کل سپنے ہوجائیں گے
پل بھر ان سے لپٹ کر رو لیں، رُک جا گاڑی بان تنِک
اِس میں میری ماں کے ہاتھ مہکتے ہیں
رہنے دے مٹی کا غازہ میرے ساتھ

■

Ishtiyaque Saeed
B-01, New Mira Paradise
Geeta Nagar Phase-2
Mira Road-401107 (Thane)
Cell.: 9930211461
ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

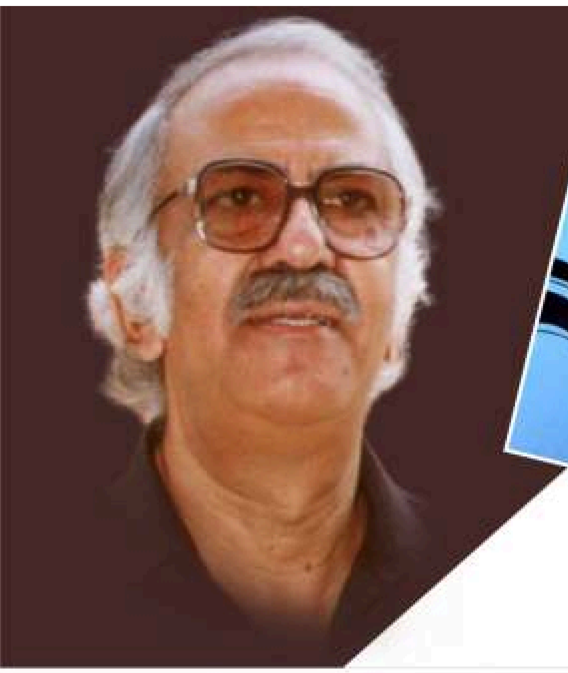

انور ندیم کے قلمی خاکے

'جلتے توے کی مسکراہٹ' کے حوالے سے

محمد اویس سنبھلی

اردو

زبان وادب میں لکھنؤ کو دبستانی حیثیت حاصل ہے اوراس حوالے سے یہاں کے باکمالوں کے نام کئی اوّلیات ہیں۔ جواردوادب کی تاریخ میں یادرکھی جائیں گی۔لکھنؤ کے تہذیبی، تاریخی اورادبی سلسلۃ الذہب کومزید آب دینے والوں میں ایک نام انور کمال خاں آفریدی قیصر باری یعنی انور ندیم (22/اکتوبر 2017-1937) کا ہے، جنھوں نے جوش کے وطن ملیح آباد میں آنکھیں کھولیں اور کارگاہ ادب لکھنؤ کے دیکھے:

''ندیم خوب لانبے، مگر مائک کے سامنے اداکاری کے ہاتھوں خمیدہ، بال کچھ ہلکے، مگر لمبے، قلمیں سفیدی مائل، مونچھیں چوڑی، آنکھیں بڑی، ناک اُونچی مگر موٹی اور کچھ عجیب سی، ہونٹ اچھے اوراُن کے نیچے ایک تل بھی، آواز کبھی تیز، کبھی مدھم۔''

(جلتے توے کی مسکراہٹ، انور ندیم،ص199-200)

یہ ہے لکھنؤ کے انور ندیم کا تعارف، خوداُن کے اپنے لفظوں میں۔ ایک اور جگہ اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گھر کے محبت ناآشنا ماحول نے انور کہہ کے پکارا۔ پہلی درسگاہ نے انور کمال خاں کو برتا، اور یونیورسٹی کی سطح پر نام کے آخر میں آفریدی کا لاحقہ بھی جڑ گیا۔ پچاس برس کی قلمی کاوشوں کوانور ندیم کی رفاقتیں حاصل رہیں۔مگر آج عمر کے 70 سال بھوگنے کے بعد ماں قیصر، باپ باری کے ناموں میں خود کو گم کردینے کی خواہش بہت تیز ہوگئی ہے۔''

(The Enigmatic Anwar Nadeem, By Navras J. Aafreedi, Magzine " Cafe Dissensus Everyday" 22 Oct. 2020)

وہ اولاً ایک شاعر، بعدہٗ ایک اچھے نثر نگار ہیں۔ والی آسی کی بدولت آل انڈیا مشاعروں میں اپنی پہچان بنائی اور انڈو پاک کے کئی مشاعرے پڑھے۔شاعری نے ان کو شہرت عطا کی اور نثر نے ان کا وقار بڑھایا۔ اس مضمون میں ہم 'جلتے توے کی مسکراہٹ' کے حوالے سے ان کی نثر نگاری پر گفتگو کریں گے۔ سفرنامہ، میدان، اور'جے شری رام' وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔'ہمارے ہر اشارے میں محبت کارفرما ہے' کے نام سے مضامین کا مجموعہ اور'کرچیں' قلمی کہانی ہے۔'خانہ خراب' کے عنوان سے خودنوشت لکھ رہے تھے، جو شائع ہوگئی ہوتی تو خودنوشت سوانحی ادب میں یقیناً ایک بہترین اضافہ قرار پاتی۔ انور ندیم نے جو بھی تحریر کیا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، البتہ'جلتے توے کی مسکراہٹ' نثر نگاری میں ان کی شناخت کو استحکام بخشتی ہے۔ انور ندیم کا بے باکانہ اندازِ تحریر، جداگانہ لب ولہجہ اور منفرد طرزِ بیان، مختصر جملوں میں ایک پوری کیفیت کا اظہار، الفاظ کی دروبست اور چست فقرے ان کی نثر کو نیا کینوس عطا کرتے ہیں۔انور ندیم کا نثری اسلوب اُن کا اپنا تھا، جس کے وہ موجد تھے اور شاید خاتم بھی۔ جس کسی شخص نے اُن کو پڑھتے ہوئے نہیں سنا، اُن کے لیے ان کی نثر کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ وہ جس ڈرامائی انداز میں، اداکاری کے ساتھ اپنی تحریریں پڑھا کرتے تھے، وہ تحریریں بھی اسی اندازِ پیشکش کی متقاضی تھیں۔ان کی تحریر اور تقریر کا انداز ایک ہی ہوتا تھا۔

'جلتے توے کی مسکراہٹ' 288 صفحات پر مشتمل ہے اور 23 مئی 1981 سے 6 دسمبر 1982 کے درمیان ہونے والے 23 مشاعروں کے رپورتاژ ہے۔اس سلسلے کی دوسری جلد'وہائٹ پیپر' کے عنوان سے لکھی تھی، جو ہنوز شائع نہ ہوسکی۔'جلتے توے کی مسکراہٹ' کے محتویات کو'یہاں وہاں'، 'اِدھر اُدھر' کے نام سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور دہلی، لکھیم پور، آگرہ، سیتاپور، کلکتہ، گورکھپور، بہرائچ، پٹنہ، انبالہ، بنارس، حیدرآباد وغیرہ کے مشاعروں کی روداد پیش کی ہے۔ ابتدا میں اختر بستوی کا مکتوب'اس کتاب کا پر بیچ' کے عنوان سے شامل ہے اور آخر میں پروفیسر علی احمد فاطمی کا آگرہ کے مشاعرے پر انور ندیم کے لکھے گئے رپورتاژ کا جواب مکتوب کی شکل میں نقل کیا گیا ہے۔ پھر'کون کہاں' کے عنوان سے کتاب میں مذکور شہروں اور شاعروں کا اشاریہ بھی بہ اعتبار حروفِ تہجی 12 صفحات میں درج ہے۔

رپورتاژ نگاری میں کسی پروگرام، محفل، کانفرنس یا کسی حقیقی واقعے کی روداد کو افسانوی رنگ میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قاری اکتاہٹ محسوس نہ کرے اور خاکہ نگاری میں کسی شخص کے رنگ ڈھنگ کا نقشہ اس طور کھینچا جاتا ہے کہ اس کی تصویر قاری کے ذہن ونگاہ میں مرتسم ہو جائے اور مجسم ہوکر سامنے آجائے۔ 'جلتے توے کی مسکراہٹ' کے نام سے انور ندیم کی تحریروں کا یہ خوبصورت گلدستہ رپورتاژ نگاری اور خاکہ نگاری کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔مشاعرے میں شامل ہر شاعر کی اچھی بری باتیں اور عادتیں اوراس کے فکر و فن سے متعلق اپنے تاثر کو آسان زبان میں پیش کرنے کے ہنر سے وہ خوب واقف ہیں۔ یہ مجموعہ بیک وقت رپورتاژ نگاری اور خاکہ نگاری کے فن پر پورا اترتا ہے اور کہیں کہیں سفرنامے کا تاثر بھی چھوڑتا ہے۔انور ندیم کی کڑوی کسیلی باتیں اور تبصروں میں ادبی رنگ اپنے

عروج پر ہوتا ہے۔

’جلتے توے کی مسکراہٹ‘ میں طنز کی لطیف لکیریں محسوس کی جاسکتی ہیں، کتاب کے نام کی معنی آفرینی کا اصل لطف کتاب کے مطالعے میں ہی ہے۔ اس میں انسانوں کی چلتی پھرتی، دوڑتی بھاگتی، چلاتی اور گھسں پھساتی رنگا رنگ تصویریں سرگوشیاں اور اٹکھیلیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنے ملنے والوں پر انور ندیم کی ترچھی نظر اور گہری فکر کبھی دھوکہ نہیں کھاتی، وہ اپنے ملنے والوں کی تصویریں، نہ کم نہ زیادہ، منفرد انداز میں کمال دیانت سے لفظوں میں اُکیر دیتے ہیں۔ انور ندیم طویل جملوں اور فقروں کی بندشوں سے آزاد ہیں، مختصر سے مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے بلکہ ٹکڑے میں اپنی بات کہہ کر قاری کو حیرتی بنا دیتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو ’جلتے توے کی مسکراہٹ‘ کو مطالعے کی کتابوں میں ترجیحی طور پر رکھنا چاہیے۔

’ایک جشنِ آرزو ہے مگر سادگی کے ساتھ‘ اور ’نگر نگر میں ڈیرے اپنے، بستی بستی پھیرے ہیں‘ کے عنوان سے دو ابتدائی رپورتاژ میں جن شعرا کا انور ندیم تعارف کرایا ہے، وہی لوگ آنے والی تمام تحریروں میں نت نئے انداز اور رنگ وڈھنگ میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اضافہ ہوتا بھی ہے تو دو چار کچھ اہم اور کچھ غیر اہم رسمی سے افراد کا، جن کا خاکہ بھی بڑی خوبصورتی سے اڑھایا ہے۔ مشاعروں کے اسٹیج پر انور ندیم اور والی آسی کا خوب ساتھ رہا۔ انور ندیم نے اپنی کتاب ’جلتے توے کی مسکراہٹ‘ کے انتساب میں لکھا ہے:

’’جلتے توے کی مسکراہٹ بھائی والی آسی کی ان مہربان کوششوں کے نام، جو انور ندیم کو مشاعروں میں کھینچ لے گئیں۔‘‘

انور ندیم نے جن مشاعروں میں شرکت کی، ان کی روداد اس کتاب میں قلم بند کی ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں سفرنامے ہیں شاعروں کے، صدا بندیاں ہیں لطیفوں کی، خاکے ہیں اخلاقی رویوں کے اور جھلکیاں ہیں اسٹیج کی، جائزہ ہے شعر وحکمت کا، کہانیاں ہیں مختلف اردو سماجوں کی، ماحول ہے پس منظر کا، باتیں ہیں قصبوں، شہروں، مہانگروں کی، دائرے ہیں فکر ونظر کے۔ والی آسی اور انور ندیم ہر جگہ، ہر کہیں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں، وہ زندگی کی ریل ہو یا مشاعرے کا اسٹیج، تاریک شب میں کوئی سنسان سڑک ہو یا بھری، سجی کوئی محفل، ایک کو تلاش کر لیجیے، دوسرا آپ ہی مل جائے گا۔ ایسے ہی والی آسی کی شخصیت اور فن پر انھوں نے بہت خوبصورت جملے قلم بند کیے ہیں۔

’’والی آسی... فنکار ہیں غزل کے، غزل ان کا رجحان بھی ہے اور اُن کی زندگی بھی۔ غزل ان کی تمام دلچسپیوں کی جان ہے۔ وہ غزل کے شجرے سے خوب واقف ہیں۔ انھیں پرانی غزلوں کی خبر بھی ہے اور اُن کے پاس نئی غزل کی گہری سوجھ بوجھ بھی ہے۔

(جلتے توے کی مسکراہٹ، ص80)

اعظم گڑھ، اتر پردیش کا ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے، جس نے ہندوستان اور اردو ادب کو شبلی نعمانی، اقبال سہیل، احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، کیفی اعظمی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسی عبقری، ادبی اور سیاسی شخصیتیں عطا کیں ہیں۔ علم وفضل اس علاقے کا خاصہ ہے۔ یہاں کے علما اور فضلا نے ہر دور میں دین و مذہب، ملک وملت اور زبان وادب کی خدمت کی ہے اور اپنے افکار، نظریات اور ادبی خدمات کے ذریعہ عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اسی فہرست میں ایک نام معروف شاعر ساغر اعظمی کا ہے، جنھوں نے ہند اور بیرون ہند کے مشاعروں میں خود اپنے منفرد ترنم، لہجے کی غنائیت سے اپنی شناخت بنائی اور کم وبیش چالیس سال تک مشاعروں کے اسٹیج پر چھائے رہے۔ ساغر اعظمی کے اس شعر نے تو ان کو راتوں رات اردو کی نئی، پرانی کالونیوں کے نوجوانوں کا چہیتا شاعر بنا دیا۔

کشمیر کی وادی میں بے پردہ جو نکلے ہو
کیا آگ لگاؤ گے برفیلی چٹانوں میں

ساغر اعظمی مشاعروں سے پہچانے گئے، شاعری، آواز کی سحر کاری اور ندرت فکر وخیال سے ایک زمانے تک سامعین کے دل ودماغ پر حکومت کرتے رہے۔ بقول انور ندیم:

’’ساغر کی آواز غم نصیب انسانیت کی عجیب و غریب، دردناک دُہائیوں کا ترنم ہے۔‘‘

ڈاکٹر ساغر اعظمی کا تعارف کراتے ہوئے انور ندیم نے مزید لکھا ہے:

’’مشاعروں کی راتوں نے ساغر اعظمی کو شہرت بھی دی اور دولت بھی، ہلکے پھلکے بدن پر خوبصورت لباس، چہرہ ایسا کہ پیار کرنے والوں کو یاد رہ جائے۔ ساغر کا ترنم پہلے چیختا تھا مگر اب دلوں کے چور دروازے ٹٹولتا پھرتا ہے۔

چل پڑے ہو تو چلتے رہو، رُک گئے تو کچل جاؤ گے
اس زمانے کے حالات ہیں بھاگتے لشکروں کی طرح!

(ایضاً، صفحہ 221)

کلاسیکی لب ولہجے کے شہرت یافتہ خوش گلو شاعر حق کانپوری (1942-2019) رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور زندگی کا زیادہ حصہ کانپور میں گزارا، اس لیے نام کے ساتھ کانپوری لکھتے رہے۔ کانپور کے حوالے سے فنا نظامی کے بعد انھوں نے خوب شہرت پائی اور کم وبیش دو دہائیوں تک مشاعروں میں چھائے رہے۔ حق کانپوری کا ترنم بالکل منفرد تھا۔ انھوں نے کلاسیکی غزلوں کے ذریعے خوب مقبولیت حاصل کی۔ ان کی ایک غزل تو شاید سیکڑوں مشاعروں میں سنی گئی ہوگی۔

پہلے کبھی پوچھا تھا جواب پوچھ رہی ہے
دنیا مرے لٹنے کا سبب پوچھ رہی ہے

انور ندیم نے حق کانپوری کا قلمی خاکہ اس طرح کھینچا ہے:

’’مخملی ٹوپی، گورا رنگ، بہت بے ہودہ کالی داڑھی، آنکھ، ناک ہونٹ سب چھوٹے، آنکھ میں سرمہ، منھ میں پان، پائجامہ کے اُوپر بہت اُونچا کرتا اور کالا کوٹ۔ باتیں وہی جو نوخیز عمروں کو چھیڑ سکیں، مگر ترنم ہائے غضب!..... کم سن، چنچل، گہرا میٹھا۔ حق کا ترنم آندھی بن گیا اور داد وتحسین کے کچے پکے پھل سارے ہال میں بکھر گئے، حق نے اپنی جھولیاں بھر لیں.........!

(جلتے توے کی مسکراہٹ، ص103)

مشاعرہ اور نظامت لازم وملزوم ہیں۔ ہندوستان میں مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے کئی نام سامنے آتے ہیں، لیکن آزادی کے بعد اردو مشاعروں کی پوری تاریخ میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے پہلے کسی نے نظامت کو وہ راہیں نہیں دکھائی تھیں، جو ملک زادہ صاحب نے دکھائیں۔

نظامت کے حوالے سے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اتنے مشہور ہوئے کہ ان کی شاعری کہیں پیچھے رہ گئی۔ وہ ساری دنیا میں مشاعروں میں بلائے جاتے، لیکن شاعر کی حیثیت سے کم اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے زیادہ۔ وہ ایسے شاعر تھے کہ اگر وہ کامیاب ناظم مشاعرہ نہ بھی ہوتے تو بھی اُن کا تعارف ایک باکمال، معتبر شاعر کی حیثیت سے ضرور ہوتا، اُن کی حیات میں ہی نہ جانے ان کے کتنے اشعار زباں زد خاص

وعام ہو گئے تھے، یہ شعر بھی تو ان ہی کا ہے۔

چہرے پہ سارے شہر کے گردِ ملال ہے
جو دل کا حال ہے وہی دلّی کا حال ہے

لیکن حقیقت ہے کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی نظامت نے ان کی شاعری پر بہت ستم ڈھایا۔ پوری زندگی وہ مشاعروں کے ناظم کے طور پہچانے گئے۔ انور ندیم نے ان کے تعلق سے کئی واقعات قلم بند کیے ہیں، جن سے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی ادبی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

’’ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ملک گیر نظامت کے سلسلے میں پچھلے کئی برسوں سے پہلے پائیدان پر براجمان ہیں۔ کبھی کبھار سفر کی تھکن اور بیانیہ بے راہ روی سے بوجھل ہو کر گرے بھی تو تیسرے، چوتھے نہیں بلکہ دوسرے پائیدان پر، اور پھر جلدی ہی آ گئے اسی پہلے پائیدان پر...‘‘ (جلتے توے کی مسکراہٹ، ص 25)

’’ڈاکٹر ملک زادہ نے شاعروں کے منچ اور مشاعرہ سننے والوں کے پنڈال میں زندگی کو بیدار رکھنے کے خیال سے اپنی نظامت کو مشاعرے کے آخری لمحوں تک دل چسپ بنائے رکھا۔‘‘ (جلتے توے کی مسکراہٹ، ص 161)

کرشن بہاری نور کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول اور پر کیف فضا میں آنکھیں کھولیں اور اہل سخن کی صحبتوں نے شعری ذوق کو جلا بخشی۔ فضل نقوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور مشق سخن سے کلاسیکی شاعری میں امتیازی حیثیت کے حامل ہوئے اور پھر استاد شاعر قرار پائے اور اپنے پیچھے تلامذہ کی کثیر تعداد چھوڑی۔ انہوں نے لکھنؤ کی زبان و انداز سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے موضوع اور اسلوب کے حوالہ سے غزل میں اپنی انفرادیت باقی رکھی۔

منور رانا کو لوگ شاعر کے طور پر جانتے ہیں اور وہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی وہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ایک دور ایسا تھا کہ انھوں نے مشاعروں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے، یہ الگ بات کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ثقلین حیدر، عمر قریشی اور انور جلالپوری کی طرح ان کی نظامت کا ذکر نہیں ہوتا، حالانکہ 1980 اور 90 کی دہائی میں منور رانا نے مشاعروں کی خوب نظامت کی۔ 12/اپریل 1982 کو بہرائچ کے مشاعرے کا رپورتاژ لکھتے ہوئے انور ندیم نے منور رانا اور ان کی نظامت کے بارے میں لکھا ہے:

انور ندیم کی نثر میں پھول کی مہک، قوس قزح کی دلکشی، زبان کی مٹھاس، اور لھجے وفقروں کی کاٹ ملے گی۔ رپورتاژ نگاری کی اصل اور کامل تعریف انور ندیم کی تحریریں پڑھ کر سمجھ میں آتی ھیں، جس جگہ ان کے قدم پڑتے ھیں، وھاں کی تاریخی، تھذیبی اور ثقافتی خوبیوں اور خامیوں کا بھرپور تعارف کم لفظوں اور دلچسپ انداز میں پیش کرتے ھیں اور اس شھر یا قریے کا منظر نامہ دل ونگاہ میں بیٹھ جاتا ھے۔

’’اُتر پردیش، بنگال، بہار اور مدھیہ پردیش میں لوگ منور رانا کو جانتے ہیں، بہرائچ میں یہ ان کی پہلی آمد ہے، لوگ اُن کی نظامت کے انداز کو دیکھنے، سننے کے لیے بیتاب۔ فرحت علی صاحب کی خاصی طویل افتتاحی تقریر سمٹی تو گیارہ بجے مائک منور رانا کے ہاتھ لگا۔ چھوٹے بال، چوڑا ماتا، بہت گہری خوبصورت آنکھیں، اچھی ناک، خراب مونچھیں، رسیلے ہونٹ، قلمیں بالکل غائب، یہاں سے وہاں تک خوب پھولے پھالے گال، موٹی گردن، بھاری سینہ، نکلا ہوا پیٹ، چہرے پر نمک، بدن کے دوسرے حصے بالکل کالے، آواز بھاری اور خوب گٹھیلی، ہر موقع کے لیے اشعار کا خوبصورت انتخاب، کچھ لطیفے بھی، مگر سب کے سب معیاری۔
(جلتے توے کی مسکراہٹ، ص 218)

اسٹیج پر عرصے تک اپنی خوبصورت اور پرکشش شاعری کے ذریعے مقبولیت برقرار رکھنے والے نور اندوری نے مظلوموں کی حمایت میں اپنی غزل کے ذریعے آواز اُٹھائی اور عام انسان کے جذبات کی ترجمانی کی، وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی ان کا اثاثۂ کل ہے، جس میں ان کا ترنم آبِ زر کا کام کرتا تھا۔

انور ندیم نے نور اندوری کی غزل، ترنم اور مشاعرے میں ان کی موجودگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

’’نور اندوری، فکر و فن اور ترنم کے معاملے میں، خمار اور انور مرزاپوری کے درمیان کی کوئی صورت، جو آج کے مشاعرے کا ایک اٹوٹ انگ ہے۔ شراب کی مستی اور شباب کی تھوڑی سی میلی میلی سُرخی گالوں پر بہکنے اور بہکانے کے کام کو بڑھاوا دینے والی نابالغ، مگر دل چسپ غزلیں۔‘‘ (جلتے توے کی مسکراہٹ، ص 27)

مخمور سعیدی جدید غزل گو شعرا میں اپنی منفرد آواز اور لب و لہجے کے لیے معروف ہیں، متعدد کتابوں کے مترجم اور مرتب ہیں، ایک درجن سے زائد رسالوں کی ادارت کا فریضہ انجام دیا ہے اور اپنی شاعری اور اپنے انداز خاص کے سبب ملک و بیرون ملک کے مشاعروں میں مقبولیت حاصل کی۔ آئیے انور ندیم کی زبان میں مخمور سعیدی کو جانتے ہیں:

’’ناظم مشاعرہ نے مخمور سعیدی کو بلالیا... مخمور سعیدی بے مزہ زندگی کی الجھنوں کو شراب کی تلخیوں سے کاٹنے والا پٹھان، دودھیا بدن پر سرخیوں کی اجارہ داری، مردانہ شریر، مگر دانت کافی برے، صحافت اور اشاعتی تنظیموں سے وابستہ، اُردو غزل اور نئی غزل کے بہت اچھے شاعر...‘‘ (جلتے توے کی مسکراہٹ، ص 159)

انور ندیم نثر کو بھرپور توانائی کے ساتھ برتنے والے شاعر ہیں، ان کی قلمی صلاحیت نے نثر کو نئی جہتوں، البیلے انداز اور انوکھے تیکھے پن سے متعارف کرایا ہے، چست اور بندھے ٹکے جملے فقرے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھے کہ شاعری کر رہے ہیں، کھرا پن، طنز و مزاح، چلبلا پن، لفظوں کی دلکشی میں منظر نگاری کی چنگاریاں، زبان سہل، آسان و سادہ، جا بجا ہندی الفاظ کا خلاقانہ استعمال، غرض ہر شے ان کی نثر میں بسیرا کر لیتی ہے۔ حیدرآباد، کلکتہ، اُترولہ اور اَنبالہ کے مشاعروں کی روداد بطور خاص پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے بے باکانہ خاکوں پر جتنے تحسینی کلمات ادا کیے جائیں کم ہیں۔

انور ندیم کی نثر میں پھول کی مہک، قوس قزح کی دلکشی، زبان کی مٹھاس، اور لہجے و فقروں کی کاٹ ملے گی۔ رپورتاژ نگاری کی اصل اور کامل تعریف انور ندیم کی تحریریں پڑھ کر سمجھ میں آتی ہیں، جس جگہ ان کے قدم پڑتے ہیں، وہاں کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی خوبیوں اور خامیوں کا بھرپور تعارف کم لفظوں اور دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس شہر یا قریے کا منظر نامہ دل و نگاہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ انور ندیم کے اندر ایک کہانی کار چھپا ہوا ہے جو ’جلتے توے کی مسکراہٹ‘ میں اپنے قاری کو شامل رکھتا ہے۔

■

Mohd Ovais Sambhali
178/157, Barood Khana, Near Lal Masjid,
Lucknow - 226 018 (U.P.)
Mob.: 7905636448 Email:
ovais.sambhli@gmail.com

محمد مستمر

عزیز بانو داراب وفا

پرانی قدروں کی امین شاعرہ عزیز بانو داراب وفا 23/ اگست 1926 کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے جدِ امجد کا تعلق کشمیر کے دارابو خاندان سے تھا۔ 1801 میں ان کے پر دادا عزیز الدین آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے لکھنؤ آ کر بس گئے تھے۔ عزیز الدین کا فارسی زبان کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے دادا خواجہ وصی الدین ڈپٹی کلکٹر تھے اور والد شریف الدین داراب پیشے سے ایک ڈاکٹر تھے۔ حالانکہ ان کا گھر پرانی روایات کا پروردہ تھا۔ اس کے باوجود عزیز بانو اعلیٰ تعلیم سے مزین ہوئیں۔ موصوفہ نے تھبرن کالج سے بی اے اور لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ سے ایم اے کیا۔ بعدازاں ایک گرز کالج میں انگریزی کی لیکچرر ہو گئیں۔ بیگم سلطانہ حیات نے 1960 میں اندرا گاندھی کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد کرایا تھا جس میں عزیز بانو کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ موصوفہ کی شاعری کی تعریف خود اندرا جی نے بھی کی تھی۔ وقتاً فوقتاً عزیز بانو کے پروگرام ریڈیوں سے بھی نشر ہوتے رہے۔ ہندوستان کے علاوہ بیرون ممالک کے مشاعروں میں بھی شرکت کی لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ان کا انتقال 13/جنوری 2005 کو لکھنؤ میں ہوا۔ ان کا شعری مجموعہ 'گونج' کے نام سے ان کی وفات کے چار سال بعد 2009 میں سید معین الدین علوی نے ترتیب دیا جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ نے شائع کیا۔ فاضل مرتب نے عزیز بانو کی زندگی اور شاعری سے متعلق اس مجموعے پر مدلل اپنی رائے بھی قائم کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے حقیقی بھائی پروفیسر عزیز الدین طارق کا 'اظہارِ تشکر' بھی شامل ہے۔ انتقال سے قبل موصوفہ نے احباب کے اصرار پر اپنا کلام یکجا کر لیا تھا لیکن اسی درمیان موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین لیا اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئی تھیں کیوں کہ یہ سرمایہ انھیں ورثے میں ملا تھا۔ عزیز بانو صرف تفننِ طبع کے لیے شعر کہتی تھیں۔ بس شعر کہا اور بعد میں اسے نذرِ آتش کر دیا۔ ایسا وہ بہت عرصے تک کرتی رہیں۔ بعد میں دوستوں کے سمجھانے پر وہ باز آئیں، لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنے کلام کو سنبھال کر نہ رکھ سکیں۔ وہ اپنے اس مزاج کے تعلق سے اپنے شعری مجموعے کے صفحہ 17 پر 'آہنگِ وفا' کے زیرِ عنوان لکھتی ہیں:

''شروع میں میرا رجحان ادب کی طرف تھا۔ میں افسانے اور غزلیں لکھتی اور گھر کے اندھے کنویں میں ڈال دیتی۔ میں جو کچھ بھی لکھتی اپنی تشفی کے لیے لکھتی۔ مجھے شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے شعر کہنے لگی تھی۔ 1960 میں میں نے دو غزلیں کہیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔''

قرۃ العین حیدر سے عزیز بانو داراب وفا کے بہت گہرے مراسم تھے۔ عینی آپا نے اپنے ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' میں عزیز بانو کا ذکر بھی کیا ہے۔ موصوفہ کے شعری مجموعے 'گونج' میں بھی عینی آپا کی رائے بعنوان 'جو جھکوں تو شاخِ گلاب ہوں جو اٹھوں تو ابرِ بہار ہوں' درج ہے۔ اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کتنا گہرا ادبی اور دوستانہ رشتہ تھا۔

جہاں تک عزیز بانو کی شاعری کا تعلق ہے وہ کئی کشتیوں میں سوار رہی، شروع میں ان کی شاعری روایتی طرزِ فکر کی غمازی کرتی دکھائی دیتی ہے، جس کا اعتراف خود موصوفہ نے بھی اپنے مجموعے میں صفحہ 17 پر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''مگر اس مقبولیت کے باوجود میں اپنی شاعری سے مطمئن نہ تھی۔ میری شاعری روایتی شاعری تھی۔''

آگے چل کر وہ ترقی پسند تحریک کی گرویدہ رہیں، ترقی پسند شاعروں میں انھیں فیض نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ اپنے انتشارِ شعور کے تعلق سے آگے صفحہ 18 پر اِس طرح روشنی ڈالتی ہی:

''میری بے چین طبیعت کے لیے ٹھہراؤ ممکن نہ تھا، میرا ذہن اپنی منزل کی تلاش میں بے چین تھا، ایک دن ترقی پسندی کا سیلاب مجھے بھی تنکے کی طرح بہا لے گیا۔ خاص طور پر میں فیض سے بے حد متاثر تھی، اُس زمانے میں میں نے جو بھی شاعری کی اس پر ترقی پسندی کا رنگ غالب تھا۔''

مگر جلد ہی وہ ترقی پسند تحریک سے بھی منقطع ہو گئیں۔ ان کی جبلت میں ایک طرح کی بے چینی کارفرما رہی۔ ان کے انتشارِ نفس و شعور نے انھیں ہمیشہ مضطرب رکھا۔ بعدازاں جب جدیدیت نے اپنے پیر پھیلانے شروع کیے اور پورے ادب میں جدیدیت کا غلغلہ ہوا تو موصوفہ کا رجحان جدیدیت کی طرف مُڑ گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انتشارِ نفس نے ان کے مزاج کو سیمابی بنا دیا تھا، جس کو کسی طرح قرار نہیں تھا، سکون نہیں تھا، اطمینان نہیں تھا۔ مذکورہ صفحہ پر ہی وہ اپنی جبلی کیفیت کا اظہار یوں کرتی ہی:

''یہ زمانہ میرے لیے بڑے کرب اور مایوسی کا زمانہ تھا۔ عین اس وقت جب میں اپنے اندر ایک خارزار میں بھٹک رہی تھی مجھے ایک عجیب سا مقناطیسی کھنچاؤ محسوس ہوا۔ مجھ میں بھی ایک 'کوہِ ندا' تھا، جس کی

آواز مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یہ آواز جدید شاعری کی تھی، میں دیوانہ وار اس صدا کا پیچھا کرنے لگی، یہ سنہ 1970 کا زمانہ تھا، اس پہاڑ پر قدم رکھتے ہی میری شاعری کا لہجہ خود بخود بدل گیا۔''

یہ ہیں وہ تین پڑاؤ اور خیمے، جن میں داراب وفا کی شاعری سانس لیتی ہے اور اپنا فنی سفر طے کرتی ہے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے اپنا قیمتی سرمایہ خود ضائع کر دیا اور دوسرے تساہلی کے سبب جو باقی تھا وہ بھی پورا یکجا نہ ہو سکا۔ بہرکیف ہمیں 'گونج' میں شامل غزلیات کچھ قطعات اور متفرق اشعار پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا اور اسی مجموعے کی روشنی میں ان کی شاعری کی سمت و رفتار نیز شعری جہتوں کو منکشف کرنے کی سعی کریں گے۔

یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ داراب وفا کی زندگی اور جبلی تقاضوں میں ایک طرح کا خبط و مراق پیدا ہو گیا تھا، جس کے باعث ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں رہا تھا۔ جس 'کوہِ ندا' کا وہ ذکر کرتی ہیں، یہ ان کا انتشارِ شعور ہی تو تھا جو ان کو مختلف پگڈنڈیوں پر چلا رہا تھا۔ چنانچہ ان کی نفسیاتی کیفیت ان کے فن پر ہمیشہ غالب رہی۔ حتیٰ کہ آخری دور میں تو ان کی زندگی کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نرگسیت میں بھی مبتلا ہو گئی تھیں لیکن فنکار ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو ابنارمل ہونے نہیں دیا۔ جیسا کہ وہ خود معترف ہیں کہ ابتدائی دور میں وہ روایتی خول میں مقید رہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چاہے ان کا روایتی دور رہا ہو یا ترقی پسندی کا یا پھر جدیدیت کا، انھوں نے تینوں دور میں کس معیار کی شاعری کی ہے۔ ان کی زبان کس طرح کی رہی، ان کا اندازِ تخاطب اور اسلوب کس طرح کا رہا۔ ان کا تفحصِ الفاظ اور پروازِ تخیل قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے یا نہیں...؟ ان کا نسائی لب و لہجہ کس نوعیت کا ہے، یہ صرف نسائی لب و لہجہ ہے یا پھر ان کا کلام تانیثیت کا مظہر ہے۔ ان کے یہاں کس طرح کے جذبے جنم لیتے ہیں۔ ان کے اندر کے 'کوہِ ندا' کا صوتی آہنگ کیا گل کھلاتا ہے نیز ان کا رنگِ شاعری دلوں پر کیا دستک دیتا ہے۔ روایتی شاعری کے تعلق سے مندرجہ ذیل شعر دیکھیے۔

میں جمالِ فطرتِ حسن ہوں مری ہر ادا ہے حسین تر
جو جھکوں تو شاخِ گلاب ہوں جو اٹھوں تو ابرِ بہار ہوں

یہ ان کے ابتدائی دور کا شعر ہے جو شاید موصوفہ کو خود بھی بے حد پسند تھا اور عینی آپا کو بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نسائی لب و لہجے کا یہ شعر بہت خوب صورت ہے، خوبصورتی کے ساتھ معنی خیزی اور معنی آفرینی بھی لیے ہوئے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شعر 'وجودِ زن' کی بھرپور غمازی کر رہا ہے۔ اگر ہم اس شعر کی تہوں میں جانے کی کوشش کریں تو بہت سی پرتیں کھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت ذات 'جمالِ فطرتِ حسن' ہے۔ 'شاخِ گلاب' اور 'ابرِ بہار' کی ترکیب

و استعارے سے شعر جمالیاتی حسن کا مرقع بن گیا ہے۔ شعر میں صرف جذبات کی فراوانی نہیں بلکہ حقیقت کا عنصر بھی ہے۔ اب ذرا ترقی پسندی کے حوالے سے بھی ایک شعر دیکھ لیجیے جو انھیں بھی بہت پسند تھا۔

ساز ہر شاخ کو جب دستِ صبا دیتا ہے
درِ زنداں کی بھی زنجیر ہلا دیتا ہے

اس شعر میں فیض کا پرتو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اس شعر میں وہی گونج شامل ہے جو ترقی پسندی کا شیوہ اور طرۂ امتیاز تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں ہونی چاہیے کہ خواہ وہ شعر روایتی ہو یا ترقی پسندانہ ہو یا پھر کسی اور رجحان کے تحت خلق کیا گیا ہو، شاعری کا طرۂ امتیاز اور حسن یہ ہے کہ وہ علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کے بغیر آگے نہیں چل سکتی، فنکار کی فکر، اس کا رجحان، اس کا نقطۂ نگاہ اور اس کا مزاج ہی فن پارہ یا شعر کو اس خصوصیت کا حامل بناتا ہے، جس کا فن پارے پر اطلاق کیا جاتا ہے، اور اس معاملے میں کہ وہ شعر کس تحریک یا رجحان کی نمائندگی کرے گا بس تفحصِ الفاظ کا محتاج ہوتا ہے، کیوں کہ ڈکشن ہی وہ اساس ہے جو فن پارے یا شعر کو جہت و سمت عطا کرتا ہے اور اس کو نیا پیراہن زیب تن کراتا ہے۔ مذکورہ شعر میں دستِ صبا کے ساتھ درِ زنداں اور زنجیر نے شعر کو ترقی پسند تحریک کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

مجموعی طور پر عزیز بانو داراب وفا کے تعلق سے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نسائی لب و لہجے میں ایک خاص طرح کا درد و غم پایا جاتا ہے جسے درد و محبت کی ملی جُلی چاشنی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی وہ معنویت ان کے شعری ابعاد میں جنم لیتی ہے جس کا رشتہ عورت کی چہار دیواری اور جذبات کی نازک ڈور سے ہے۔ وہ علامتوں اور اشاروں سے بہت گہری باتیں کہہ جاتی ہیں ایسی گہری باتیں جو اپنے اندر بہت سی داستانیں مخفی رکھتی ہیں۔ جب ہم ان کی کائناتِ غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ عزیز بانو کا فن تہداری اور داخلیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں بلیغ اشارے ہیں، معنی خیز تمثیلیں اور علامتیں ہیں، مضمون آفرینی، استعارات و تشبیہات ہیں۔

ہر ایک شہرنگاراں سمجھ رہا ہے مجھے
نہ جانے کتنے زمانوں کی داستاں ہوں میں

میرے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ کرکے
وہ بھی ماضی کی طرح اپنی نشانی دے گا

روٹھ جائے گا تو مجھ سے اور کیا لے جائے گا
بس یہی ہوگا کہ جینے کا مزا لے جائے گا

خود میں اُتروں گی تو میں بھی لاپتہ ہو جاؤں گی
روشنی کے غار میں جا کر دِیا ہو جاؤں گی

کبھی گوکل کبھی رادھا کبھی موہن بن کے
میں خیالوں میں بھٹکتی رہی جوگن بن کے

مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ ان کے مجموعے میں اس قبیل کے اور بہت سے شعروں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان شعروں میں جدت و ندرت، معنی آفرینی، سہل پسندی مگر تہہ داری اور گہرائی، وسعتِ فکر، تجربات کا نچوڑ، مشاہدے کی گہرائی اور شاعرانہ دیدہ وری رچی بسی ہے۔

ماٰخذ:

1 تذکرہ خواتین مصنف: عبدالباری آسی
2 گونج شعری مجموعہ، شاعرہ: عزیز بانو داراب وفا
3 کارِ جہاں دراز ہے ناول، مصنفہ: قرۃ العین حیدر

■

Dr. Mohd Mustamir
Assistant Professor, Dept of Urdu
Zakir Husain Delhi College
Delhi-110002
Mob.:8920860709
drmohdmustamir@gmail.com

عزیز احمد خان

خواجہ حسن ثانی نظامی کا اسلوب

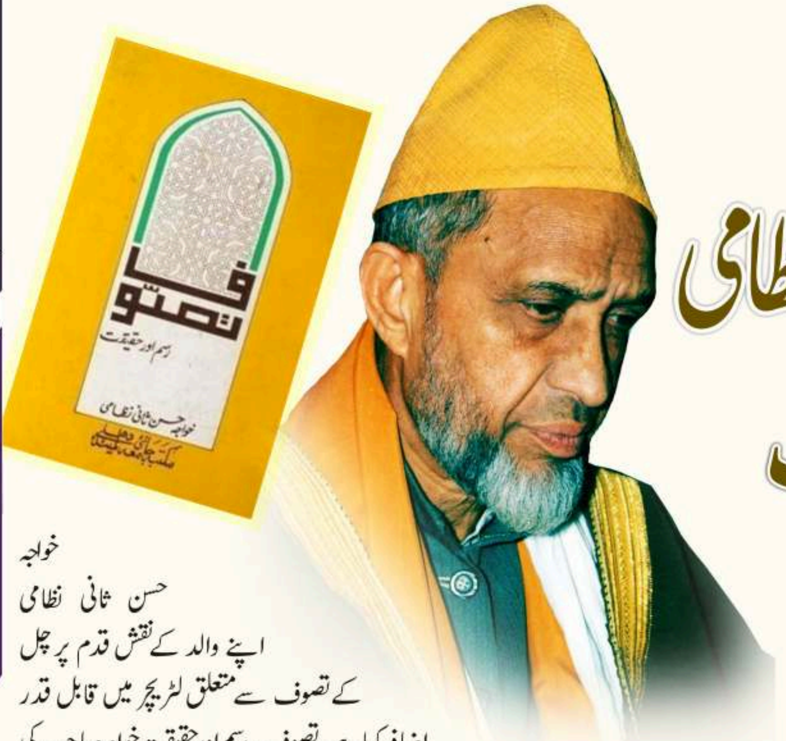

خواجہ حسن ثانی نظامی درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے سجادہ نشینوں میں سے تھے۔ان کی پیدائش 15 مئی 1931 کو ہوئی تھی۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔گریجویشن کی تعلیم انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے حاصل کی۔اس پر وہ فخر کرتے ہیں کہ پروفیسر مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا اسلم جیراج پوری جیسے اساتذہ سے انھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ان کے لیے فخر کی بات تھی کہ ان کی تربیت ان کی والدہ ماجدہ خواجہ بانو، والد ماجد خواجہ حسن نظامی نے کی۔خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے عظیم المرتبت باپ کے کمالات کا نہ صرف پرتو تھے بلکہ ثانی بھی تھے۔

خواجہ حسن نظامی کے رسوخ اپنے اپنے عہد کے تمام بڑے لوگوں سے تھے ان میں سب سے بڑا نام گاندھی جی کا تھا۔ جو اکثر خواجہ صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔اسی طرح اکبر الہ آبادی جب بھی دہلی آتے تو خواجہ صاحب کے یہاں ہی قیام کرتے۔خواجہ حسن ثانی نظامی کے اندر اس دور کے عظیم رہنما، ادیب، مفکر کے علاوہ اپنے والد کی شخصیت کی دلآویزی، گفتار کی شیرینی، علم ویقین کی توانائی، خدمت خلق کا جذبہ پوری طرح سمویا ہوا تھا۔خواجہ حسن نظامی نے تصوف کے بنیادی افکار اور تعلیمات کو جس دلکش انداز میں سلاست اور بلاغت کے ساتھ اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کے والد اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔انھیں مصور فطرت بھی کہا جاتا ہے اور شمس العلما کے خطاب سے بھی سرفراز تھے۔انھوں نے علم وادب کے میدان میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔خواجہ حسن ثانی نظامی کو بھی اپنے والد کی طرح زبان پر دسترس حاصل تھی۔جب وہ گفتگو کرتے یا کوئی مضمون لکھتے یا محفل کو خطاب کرتے تو واقعات کی اس طرح منظر کشی کرتے کہ لوگ محسوس کرتے کہ یہ تمام مناظر یا واقعات ان کے سامنے ہو رہے ہیں۔

خواجہ حسن ثانی نظامی دہلی کی ادبی، تہذیبی، ملی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ دہلی اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی کے فعال رکن تھے۔دس سال 2000 تا 2010 تک غالب اکیڈمی کے صدر بھی رہے۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی انھوں نے خود قائم کی جس کے وہ جنرل سکریٹری اور حکیم عبدالحمید صدر تھے۔ بعد میں علی محمد خسرو اور پھر سید شاہد مہدی اس کے صدر بنے۔اسی سوسائٹی کے تحت مختلف مواقع پر عرس کرتے اور امیر خسرو کی حیات وتعلیمات کے عنوان سے سمینار کراتے۔ اپنے والد ماجد کے عرس کے موقع پر خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات پر باقاعدہ سمینار کراتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی دو سال ذیابیطس اور امراض قلب کی تکالیف میں شدت سے مبتلا رہے اور اخیر میں دو مہینہ سخت علیل رہنے کے بعد 15 مارچ 2015 کو صبح سوا تین بجے اپنے گھر واقع بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور خواجہ ہال میں واقع ان کے والد خواجہ حسن نظامی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ان کے پسماندگان میں بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شادی نہیں کی تھی۔ان کے انتقال سے دبستان دہلی کی قدیم روایت کا خاتمہ ہوگیا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے والد کے نقش قدم پر چل کے تصوف سے متعلق لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔تصوف۔رسم اور حقیقت خواجہ صاحب کی مشہور کتاب ہے جس میں کئی توسیعی خطبے شامل ہیں جو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور گلبرگہ میں دیے گئے۔گلبرگہ میں جو خطبے کا عنوان تھا وہی کتاب کا عنوان بنا۔ اس کے متعلق خواجہ صاحب عرض حال میں لکھتے ہیں:

''اس خطبے نے ان حضرات کی غلط فہمیاں دور کردیں جو بغیر جانے بوجھے تصوف اور اہل تصوف کے مخالف بنے ہوئے تھے۔'' (تصوف: رسم اور حقیقت، ص 7)

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تصوف کے بنیادی افکار اور تعلیمات کو خواجہ حسن نظامی نے اس صدی میں جس دلکش انداز میں سلاست اور بلاغت کے ساتھ اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے وہ فقید المثال ہے۔خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے باپ کے نقش قدم پہ چل کے تصوف سے متعلق لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے... انھوں نے تصوف کی تاریخ، صوفیہ کے نظام حیات، اس کے مقصد ومنہاج، سلوک میں تعلیم وتربیت کی اہمیت، ہندوستانی سماج پر صوفیہ کے اثرات اور تنظیم سلاسل کی نوعیت پر جس بالغ نظری سے بحث کی ہے اس سے فکر ونظر کے نئے پہلو سامنے آگئے ہیں۔'' (ایضاً، ص 7)

خواجہ حسن نظامی کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں میں ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بازار سے کمیاب ہوتی گئیں۔خواجہ حسن ثانی نظامی نے ان کی کتابوں کی ازسرنو آفسیٹ پر چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے واقعی تصوف سے متعلق ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اپنے والد کے رسالے 'منادی' کو تاحیات جاری رکھا۔

جس میں خود بھی لکھتے رہے اور اپنے والد کی ڈائری کو بھی شائع کرتے رہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کو سادہ اور دلکش نثر نگاری کا فن ورثے میں ملا تھا۔ ان کی سادہ نثر کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے حسن اعلیٰ سجزی کی فارسی کتاب 'فوائدالفواد' کا ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس اردو میں کیا، ان سے پہلے یہ کام کسی اور سے نہ ہوسکا۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب نے یہ التزام رکھا ہے کہ ایک صفحے پر فارسی متن دیا اور اس کا اردو ترجمہ سامنے دے دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے تھے فارسی متن اس لیے دیا جارہا ہے کیونکہ یہ الفاظ نظام الدین اولیا کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ اردو کے ارتقا میں صوفیوں اور خانقاہوں کا اہم رول مانا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو خواجہ حسن ثانی نظامی نے نہ صرف اپنی تقریروں میں دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے بلکہ اپنی تحریروں سے اسے ثابت بھی کردیا ہے۔

اس کتاب میں شامل مضمون 'موڈرن صوفی: حکیم ہمدرد۔ ایک روپ جھلک' میں خواجہ حسن ثانی نظامی کا اسلوب تمام مضامین سے جدا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے حکیم عبدالحمید کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کے شروعات میں ہی انھوں نے حکیم صاحب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزم وارادے میں آسمان، تواضع وخاکساری میں زمین، محبت، خلوص اور بے غرضی میں ماں کی گود! اجلا رنگ، اجلا لباس، بڑا دماغ۔ سمائی والا دل۔ مروت و لحاظ کی آنکھ۔ کلائی میں طاقت۔ ہاتھ میں سخاوت، رفتار میں توازن وتیزی۔ گفتار میں ٹھہراؤ اور مٹھاس! بہت سنجیدہ ہیں۔ لیکن یہ سنجیدگی راہبوں والی خشک، روکھی پھیکی، سپاٹ اور اُجاڑ سنجیدگی نہیں ہے۔ اس میں رس ہے، تازگی ہے بھری پری بشریت والی زندگی ہے! ایک سچے صوفی کی پہچان!

طبیب دوا بن جائے، معالج علاج سمجھا جانے لگے، خدا ترسی اور انسان دوستی مجسم ہوجائیں اور آدمیت خالی خولی لفظ نہ رہے، معنی ومفہوم کی بہار بھی دکھائے عمل کی قوتیں ہمالہ پہاڑ بن کر سامنے آئیں تو انھیں حکیم عبدالحمید دہلوی کہا جاتا ہے۔'' (ایضاً،ص175)

حکیم عبدالحمید کی شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب حکیم تھے بلکہ دہلی میں انھیں وہی مقبولیت حاصل تھی جو حکیم اجمل خاں کو تھی۔ جسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ 1857 کے بعد اگر حکیم اجمل خاں کی دہلی تھی تو 1947 کے بعد حکیم عبدالحمید کی دہلی تھی۔ وہ ضرورت مندوں کا مفت میں علاج کرتے تھے لیکن ان کے نسخوں پر مفت، فری یا اس طرح کا کوئی ایسا لفظ نہیں لکھتے تھے بلکہ اس پر دستخط کچھ اس انداز سے کرتے کہ ان کے دواساز پہچان جاتے اور ایسے نسخوں سے قیمت لینے سے انکار کردیتے۔ حکیم صاحب جس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیتے صحت اس کے استقبال کے لیے بازو پھیلا دیتی۔ حکیم صاحب نے تقسیم ہند کے اندوہناک منظر کو دیکھا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے دہلی کو اپنا میدان عمل بنایا۔ انھوں نے بذات خود ایسے کام کیے جو حکومتیں اور انجمنیں بھی اتنی خوبی سے نہیں کرپاتی ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے حکیم عبدالحمید کی کاوشوں کو بہت خوبی کے ساتھ اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی محنت اور حق حلال کمائی عمارتیں بنانے میں بے دریغ خرچ کیا ہے۔ اور نئے زمانے کی دلی میں کسی شخص کو شاہ جہاں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ حکیم صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے... تاہم جو کچھ انھوں نے بنوایا ہے وہ دیکھنے دکھانے کے قابل عرصہ دراز تک رہے گا۔ میرے ایک افریقی دوست یوسف ہانسا صاحب نے تغلق آباد میں اسلامک انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو دیکھنے کے بعد بے ساختہ کہا تھا کہ یہ کام تو کسی بڑی حکومت کے کرنے کا تھا جو ایک فرد نے کیا ہے!'' (ایضاً،ص86-185)

ایک ایسا انسان جس کا سالانہ کاروبار کروڑوں میں ہو اس کی زندگی کتنی سادہ اور درویشانہ تھی اس کا بھی ذکر خواجہ صاحب نے بہت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ ایک مرتبہ بغیر اطلاع کیے خواجہ صاحب حکیم صاحب سے ملاقات کرنے ہمدرد دواخانے کے لال کنواں والے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں۔ اتفاق سے حکیم صاحب دفتر میں نہیں تھے، چونکہ ان کی وہاں لوگوں سے پہلے سے واقفیت تھی لہٰذا سکریٹری خواجہ صاحب کو حکیم صاحب سے ملاقات کرانے کی غرض سے چھت پر لے گئے۔ اس عجیب منظر کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''ایک چھوٹے سے تپتے ہوئے سائبان کے نیچے لکڑی کا معمولی سا تخت پڑا ہوا تھا اور اس پر ایک بوری (Gunnybag) بچھی ہوئی تھی اور اس پر براجمان یہ کروڑوں روپے سالانہ کاروبار کا مالک لکھنے پڑھنے میں محو تھا۔ حکیم صاحب نے ہم دونوں کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھ لیا اور دور سے پکارے اور تعظیم الدین سے بولے کہ ان کو اس دیہات میں کہاں لے آئے؟ تعظیم صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے جرأت کرکے کہا کہ یہ دیہات وہ دیہات ہے جس نے معلوم نہیں کتنے شہر بسا دیے! حکیم صاحب میرے اس فقرے پر مسکرائے اور خبر نہیں ''کل یوم ہو فی شان'' کا کون سا لمحہ تھا کہ انھوں نے سامنے شیلف پر سے ایک فائل اٹھا کر میرے سامنے ڈال دی۔ یہ ان کے ذاتی خرچ کی فائل تھی۔ میں نے پورے مہینے کے خرچ کا ٹوٹل پڑھا۔ پچاسی روپے! اسّی اور پانچ، پانچ کم نوے، صرف پچاسی روپے ہمدرد دواخانے کے مالک کا خرچ!'' (ص181)

خواجہ حسن ثانی نظامی نے 'تصوف: رسم اور حقیقت' میں بہت دلکش اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ مضامین شامل ہیں جن سے ان کا دلی لگاؤ ہے۔ چاہے وہ تصوف سے متعلق ہو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پیش کیا گیا پروفیسر محمد مجیب میموریل لکچر ہو یا حکیم عبدالحمید صاحب کی شخصیت پر پیش کیا گیا لکچر ہو۔ ان تمام مضامین میں ایک ایک جملہ اپنی دلکشی دکھاتا ہے۔ خواجہ صاحب اگر اپنے دور کی چند اور ہستیوں پر مضامین لکھتے تو وہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوتا۔ جامعہ سے جو ان کا لگاؤ تھا، جس کی وجہ سے اکثر جامعہ کے اساتذہ کا ذکر کرتے نظر آتے تھے۔ پروفیسر محمد مجیب میموریل لکچر کی تمہید میں انھوں نے جس طرح جامعہ کے تمام اساتذہ کا ذکر کیا ہے اگر سب پر فرداً فرداً ایک ایک مضمون لکھ کر کتابی شکل میں شائع کردیتے تو نہ صرف اس دور کی جامعہ سے ہم سب روشناس ہوجاتے بلکہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کے دلکش اسلوب سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا۔ پھر بھی خواجہ صاحب نے اردو ادب میں جو گراں قدر اضافہ کیا ہے وہ قابل ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔

■

Dr. Aziz Ahmad Khan
House No 9, 2nd Floor
Shadab Colony, Mahanagar,
Lucknow-226006
Mob-8684943650
khanaziz07@gmail.com

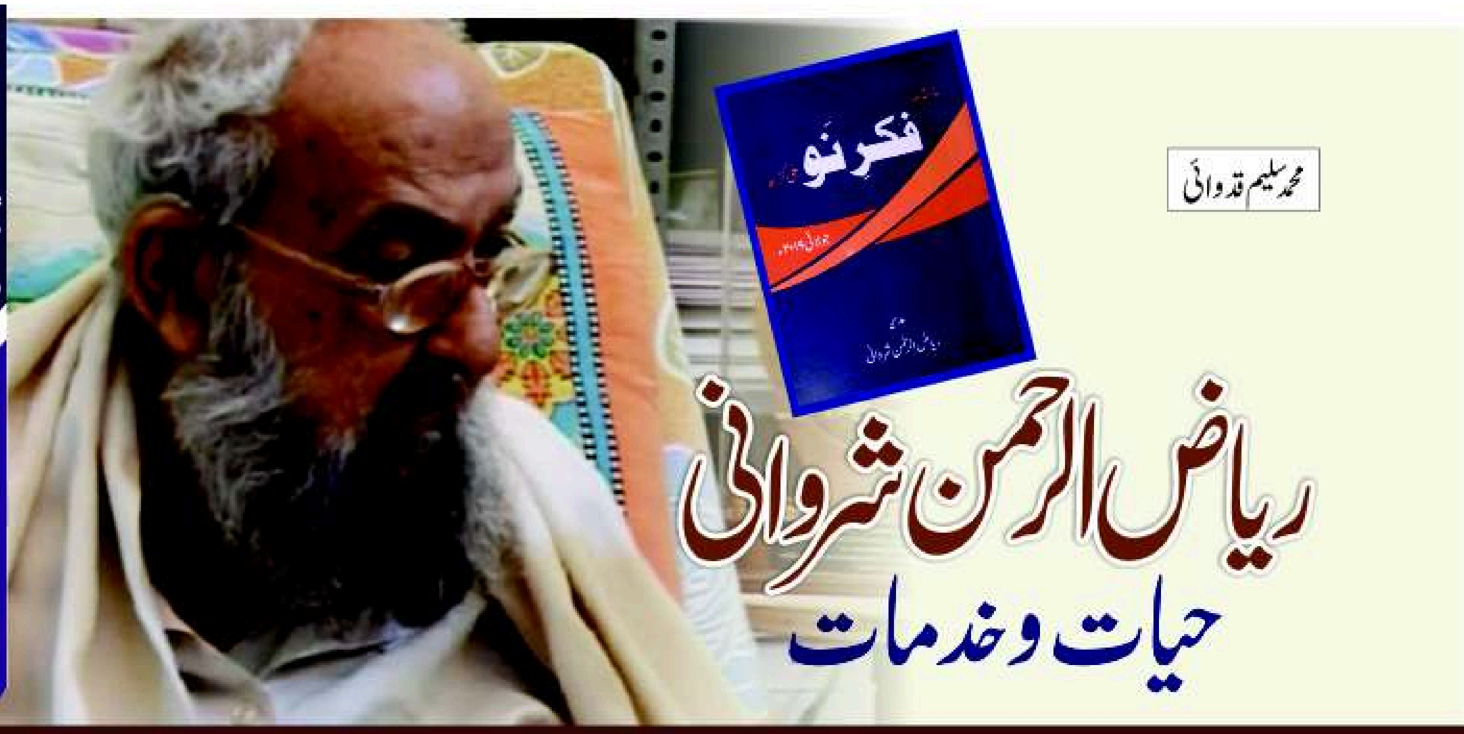

ریاض الرحمٰن شروانی
حیات و خدمات

محمد سلیم قدوائی

استاد مصنف، مبصر اور دانشور پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی (1924-2019) کا تعلق شمالی ہند کے معروف شروانی خاندان سے تھا۔ یہ خاندان جاگیردارانہ نظام سے وابستہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی روایات میں مذہب، علم اور سیاست کو بھی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ریاض الرحمٰن شیروانی کی پیدائش ان کے آبائی وطن حبیب گنج ضلع علی گڑھ میں 10 اپریل 1924 کو ہوئی تھی۔ ان کے دادا مشہور عالم دین اور مصنف صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت قدیم و جدید کا بہترین نمونہ تھی۔ پرائیویٹ طور پر انھوں نے مفتی عبداللطیف صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دینی علم، قرآن و حدیث، منطق و علم کلام کی تعلیم پائی۔ اسکول سے لے کر بی اے تک انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں کچھ ایسے حالات ہوگئے کہ ان کو عارضی طور پر پاکستان جانا پڑا جہاں انھوں نے اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی کی تکمیل کی۔ بعد میں علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عربی زبان کے مطالعے کے لیے وہ حکومت ہند کے وظیفے پر ایک سال کے لیے مصر گئے اور قاہرہ یونیورسٹی میں دکتورہ سہیر قلماوی کے زیر نگرانی جدید عربی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں معروف ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین قاہرہ یونیورسٹی میں تاریخ و ادب پر لیکچر دیتے تھے جس میں کوئی بھی شریک ہوسکتا تھا۔ پروفیسر شروانی ان لیکچروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور مستفید ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ قاہرہ میں مصر کی ایک تنظیم شبان المسلمین تھی جس میں مختلف اسکالرز لیکچر دیتے تھے، ان پروگراموں میں بھی پروفیسر شروانی پابندی سے شریک ہوتے تھے، وہاں انھوں نے ممتاز افسانہ نگار محمود تیمور کو سنا اور ان سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ دارالعلوم قاہرہ کے استاد الشیخ محمد یونس کے محاضرات میں بھی وہ پابندی سے شریک رہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ 1953 سے 1983 تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہے۔ 1983 سے 1988 تک کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں عربی کے پروفیسر و صدر شعبہ رہے۔ شعبے میں ریسرچ کی شروعات کی۔ ان سے پہلے شعبہ عربی میں ریسرچ کا کام نہیں ہوا تھا۔ عربی نصاب کی انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ دونوں سطحوں پر مکمل نظر ثانی کی اور وہاں کے نصاب میں عثمانی دور کے عربی ادب کو شامل کیا۔ تیسرا اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ وہاں شعبۂ اسلامیات قائم کیا جس کے وہ بانی صدر رہے۔ غرضیکہ تدریس کے شعبے میں ان کی نمایاں کارکردگی رہی۔ پہلے علی گڑھ اور پھر کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ عربی و اسلامیات کو انھوں نے علمی اعتبار و وقار بخشا۔ درس و تدریس کا یہ سلیقہ ان کو اپنے بہترین اساتذہ سے آیا جن میں سید محمد ٹونکی، مفتی عبداللطیف اور پروفیسر عبدالعزیز میمن خاص طور سے قابل ذکر ہیں جس کا اعتراف انھوں نے کھل کر اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

بحیثیت مصنف

تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ پروفیسر شروانی نے لکھنے کا شغل اپنی آخری سانس تک جاری رکھا اور نہایت بیباکی سے بے تکان لکھتے رہے۔ لکھنا ان کے لیے عبادت اور ریاضت کے درجے میں تھا۔ انھوں نے تعلیم، ادب، مذہب اور قومی سیاست جیسے موضوعات پر تحریروں کا خزانہ پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں روانی اور تسلسل کے ساتھ شگفتگی بھی تھی۔ تحریر کی نمایاں خصوصیت سلاست اور بے ساختگی تھی۔ الفاظ پر کمال کی دسترس تھی۔ کتابوں کے علاوہ انھوں نے بے شمار مقالات اور مضامین اردو اور انگریزی میں لکھے۔ ان گنت مراسلے لکھے اور متعدد کتابوں پر تبصرے کیے۔ پروفیسر شیروانی کی تصانیف میں ان کی نامکمل خودنوشت 'دھوپ چھاؤں' نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب 42ء سے 48ء تک کو محیط ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی کی ہے جس کو مصنف نے اپنی زندگی کا خوشگوار دور بتایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سب سے زیادہ پریشانیوں، فکروں، دکھوں اور مایوسیوں اور ناکامیوں سے پر بھی بتایا ہے۔ اس دور میں پروفیسر شروانی کی شخصیت کی تشکیل ہوئی اور دینی، سماجی اور سیاسی عقائد و نظریات مستحکم ہوئے۔ اس کا پہلا باب شروانی خاندان کے حسب و نسب سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی زندگی، یونیورسٹی میں ہاسٹل کی اقامتی زندگی یونین الیکشن، یونیورسٹی کے ماحول، منٹو سرکل اور یونیورسٹی کے اساتذہ پر اظہار خیال، پاکستان میں ڈیڑھ سالہ قیام کا

ذکر وہاں کے حالات پر پُرمغز گفتگو پڑھنے کو ملی ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم ہند اور ادارۂ سرسید پر روشنی پڑی ہے۔ پروفیسر شیروانی کے ہم خیال لوگوں کی تعداد بہت قلیل تھی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر نیشنلسٹ مسلم فیڈریشن بنائی تھی۔ اس تنظیم کی بنیاد ملک کی آزادی و سالمیت اور ہندو مسلم اتحاد پر تھی۔ اسی پلیٹ فارم سے طلبا میں 'مسلم نیشنلزم' کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایسا کرنے میں ان کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ ان کو بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑنا پڑی۔ ایک طرف برطانوی سامراج سے اور دوسری طرف مسلم فرقہ پرستی اور علاحدگی پسندی سے جو اس وقت کے ماحول میں آسان راہ نہیں تھی۔

پروفیسر شروانی کی دوسری اہم تصنیف 'میر کارواں' ہے۔ اس کتاب کا نام جواہر لعل نہرو کی تقریر سے مستعار لیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کے انتقال پر نہرو نے پارلیمنٹ میں اپنی تعزیتی تقریر میں آزاد کے لیے یہ خطاب استعمال کیا تھا۔ مولانا آزاد کی قائدانہ شخصیت کے لیے اس سے موزوں کوئی لفظ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ مولانا آزاد سے شیروانی کی عقیدت و محبت کی بنیاد آزاد کے سیاسی افکار و اعمال کی وجہ سے استوار ہوئی اور آزاد کے علاوہ کوئی اور سیاسی لیڈر ان کی نظر میں جچا ہی نہیں۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی زندگی اور ان کی خدمات کے اہم گوشوں کا احاطہ کرنے کے علاوہ ان کی اہمیت اور معنویت کو اجاگر کرتی ہے۔ آزاد فہمی کے سلسلے میں بہترین کاوش ہے۔ یہ نہ صرف مولانا آزاد کی شخصیت، فکر اور کارناموں کی تفہیم کرتی ہے بلکہ ان سے متعلق غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ اس کتاب میں شامل تحریریں ہندوستانی سیاست کے نشیب و فراز میں مولانا آزاد کی خدمات اور کردار کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ پروفیسر شروانی کے مطابق مولانا آزاد نے زندگی کے جس شعبے میں بھی قدم رکھا اس میں درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ سیاست کے علاوہ صحافت، خطابت، ادب، مذہب سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب مولانا آزاد جیسی عبقری شخصیت اور ان کی متنوع خدمات کے مطالعے پر مبنی ہے اور ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

'انسان کیسے کیسے' پروفیسر شیروانی کی یہ کتاب ان کی علمی و غیر علمی شخصیات کے ذکر پر مبنی ہے جن کو انھوں نے دیکھا اور جس سے وہ مستفید ہوئے، جن ہستیوں کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے ان میں علما بھی ہیں، سیاسی رہنما بھی ہیں، اساتذہ بھی ہیں، خاندانی بزرگ بھی ہیں، ادبا، شعرا اور احباب بھی۔ ان شخصیتوں کی خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں توازن و اعتدال برقرار رکھا گیا ہے۔ ان تذکروں میں نہ عقیدت میں غلو ہے اور نہ مخالفت میں شدت۔ انداز بیان ایسا ہے کہ قاری کے سامنے ان شخصیات کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ کتاب مضامین کا مجموعہ ہے خاکوں کا نہیں۔

'انڈیا ونس فریڈم' پروفیسر شروانی کی اس کتاب میں مولانا آزاد کی مشہور کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی دور اندیشی اور فکر و آگہی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد ہندوستان کے مستقبل کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور تدبر کی غماز ہے۔ پروفیسر شروانی نے حقائق اور دلائل کی روشنی میں اس کتاب کو مولانا آزاد کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ پروفیسر شروانی کی تصنیفات میں سیکولرازم کیوں اور مسلمانان ہند سے وقت کے تقاضے نام کے دو کتابچے ہیں جن میں ہندوستان اور مسلمانوں کے تعلق سے مفید پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ 'مقالات قومی سرسید سمینار' اور 'ڈاکٹر عبدالعلیم، ادیب عالم' کو پروفیسر شیروانی نے مرتب کیا ہے۔ 'مقالات ریاض شیروانی' کتابوں کے علاوہ پروفیسر شروانی نے بے شمار مقالات اور مضامین مختلف اخبارات، رسائل و جرائد کے لیے لکھے اور کچھ یادگاری مجموعوں میں بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر ابوذر متین نے پروفیسر شروانی کے بیشتر علمی و ادبی، تنقیدی، تحقیقی، تاریخی، تعلیمی، تبصرہ جاتی مقالات ہے، خطبات اور انٹرویو کو کتابی شکل میں یکجا کر دیا ہے، لیکن اس مجموعے میں سیاسی مضامین اور خاکوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کچھ مضامین دستیاب بھی نہیں ہوسکے۔ ان مقالات میں معلومات، وسعت مطالعہ، قوت یادداشت، معروضیت، تاریخی نقطۂ نظر اور قوت استدلال جلوہ فگن ہے۔ یہ اہم کتاب 7 حصوں میں تقسیم ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے سب سے پہلے قرآنی مضامین کو قرآنیات کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مضامین کا تعلق عربی زبان وادب کے معروف علما اور فضلا سے ہے۔ اردو داں طبقے کے لیے یہ مضامین یقیناً معلومات افزا ہیں۔ ادبیات اردو کے تحت 13 شخصیات موضوع بحث ہیں۔ ان میں مفکر، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار اور سوانح نگار شامل ہیں۔ ان کے فنی محاسن کا ذکر کرتے ہوئے تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں انگریزی ادب کے تحت انگریز شاعر ورڈسورتھ کے شاعرانہ شعور کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں حصہ تبصرہ جاتی کتب کے لیے مخصوص ہے۔ چھٹے حصے میں تعلیم سے متعلق مضامین شامل ہیں اور آخری حصہ خطبات اور انٹرویو پر مشتمل ہے۔

'پروفیسر شروانی اور صحافت' پروفیسر شروانی کا صحافت سے گہرا تعلق رہا۔ وہ کئی اخبارات اور رسائل سے بحیثیت مدیر اور اداریہ نویس منسلک رہے۔ انھوں نے سب سے پہلا اداریہ 1949 میں علی گڑھ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار 'نیا ہندوستان' کے لیے لکھا۔ 1952 میں عبدالستار خاں شیروانی کی مشترکہ ادارت میں 'جمہور' نام کا اخبار نکالا جو 1962 تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کے اداریے اور شذرات جو عام طور سے سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ شاہد شروانی اور پروفیسر شروانی دونوں لکھا کرتے تھے لیکن ان پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا۔ پروفیسر شروانی کا سب سے بڑا صحافتی کارنامہ رسالہ 'کانفرنس گزٹ' کی ادارت ہے۔ اس کا آغاز 1918 میں ہوا تھا، لیکن اس کی اشاعت درمیان میں کچھ وجوہات کی بنا پر وقفے کے ساتھ ہوتی رہی۔ پروفیسر شروانی نے اسے 2002 سے نکالنا شروع کیا اور ان کے بے باک اداریوں کی وجہ سے کانفرنس گزٹ نے علمی و ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ان کے اداریے، شذرات اور تبصرے نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اداریے تو اہم ہوتے ہی تھے۔ ان کے علاوہ اس میں شائع ہونے والے مضامین پر جو حواشی پروفیسر شروانی لکھا کرتے تھے وہ مختصر ہونے کے باوجود بڑے کارآمد اور معلوماتی ہوتے تھے۔ اس میں لکھے گئے اداریے کو ڈاکٹر فخر عالم ندوی نے 'شذرات شروانی' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب 5

ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلا باب کانفرنس گزٹ کے حوالے سے ہے۔ اس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ماضی و حال کی جامع داستان بیان کی گئی ہے۔ دوسرا باب مسلم یونیورسٹی سے متعلق ہے۔ اس میں تاریخ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر شروانی نے اپنے دور طالب علمی کے حالات اور واقعات کو پیش کیا ہے۔ تیسرا باب سرسید اور ان کی تحریک سے متعلق ہے۔ سرسید کے علمی کارناموں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور تحریک کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں سماجی اور مذہبی مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک صالح نظام کن اعمال سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آخری باب میں کچھ وفیات کا ذکر ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے رہا ہے۔ کانفرنس گزٹ کی ادارت کے علاوہ پروفیسر شروانی نے خود اپنا رسالہ 'فکر نو' کے نام سے نکالا جو ان کی زندگی کے آخری 3 سالوں تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کے اداریے اور تبصرے بھی نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے۔

بحیثیت تبصرہ نگار

پروفیسر شروانی نے متعدد کتابوں پر عالمانہ تبصرے کیے جن کی علمی و ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے پہلا تبصرہ مسلم یونیورسٹی گزٹ کے لیے کیا۔ اس کے بعد 'آجکل' مدیر 'جمہور' اور 'اردو بک ریویو' میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ باقاعدہ تبصرہ نگاری پروفیسر آل احمد سرور کی فرمائش پر 'ہماری زبان' کے لیے شروع کی جس کا سلسلہ برسوں چلا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ترجمان کانفرنس گزٹ کی ادارت سنبھالنے کے بعد اس رسالے میں تبصرہ نگاری پابندی سے 2004 میں شروع کی۔ تبصرہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ مبصر کا مطالعہ وسیع ہو اور اس میں بے لاگ تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور حق بات کہنے کا حوصلہ ہو۔ پروفیسر شروانی بلاشبہ ان تمام صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ کتاب کو پوری طرح پڑھ کر، غیر جانب دار ہوکر اور حاضر دماغی کے ساتھ، نہایت دلچسپ انداز میں کتاب کی روح کو بیان کردیتے۔ وہ تعارف و تبصرہ کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک تقریظ محض ثنا خوانی اور تبصرہ تجزیہ نگاری تھا۔ اردو کے سنجیدہ قارئین بے چینی سے ان کے تبصروں کا انتظار کرتے تھے۔ پروفیسر شروانی کے کارناموں میں ایک تابناک پہلو، ان کے تبصرے ہیں۔ ان تبصروں کو ڈاکٹر ابوذر متین نے 'کتابوں کے درمیان' نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے جو 1100 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ضخیم کتاب ایک قابل غور مجموعہ ہے جس میں مختلف موضوعات پر تصانیف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے میں تمام دستیاب مطبوعہ تبصرے مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد سے لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب موضوعاتی اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب میں تجزیہ نگاری، انصاف پسندی، غیر جانب داری اور وسعت نظر جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ تعارف و تجزیہ اور نقد و جرح کے اعتبار سے ان تبصروں کی اپنی اہمیت ہے۔ ان تبصروں میں علم وفکر کی دنیا آباد ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر شروانی نے پنے دادا اور والد کی طرح آل امنڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذمے داری بحیثیت سکریٹری سنبھالی اور اس بیمار ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ ان کی معاشرتی اور علمی خدمات میں کانفرنس کی سکریٹری شپ خاص اہمیت کی حامل ہے جو امانت و دیانت کے لحاظ سے ایک مثالی نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اپنا وجود کانفرنس کے لیے وقف کردیا۔ وہ کانفرنس کی خدمت اعزازی طور پر کرتے رہے۔ اس کے ملازمین کی مدد اپنی جیب خاص سے کرتے، اس کی عمارت کی دیکھ بھال اور مرمت کے مصارف اپنی جیب سے اٹھاتے۔ اس کے تحت قومی سمینار کرواتے اور ان کی روداد شائع کراتے، اس کے آرگن کانفرنس گزٹ کو پابندی سے شائع کرتے۔ کانفرنس کے سکریٹری اور مدیر گزٹ کی حیثیت سے پروفیسر شیروانی کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کا حلقہ احباب نہایت وسیع تھا اور وہ بہت مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ ان کی قیام گاہ حبیب منزل میں اہل علم کثرت سے آیا کرتے تھے، ان سے علمی مسائل پر گفتگو ہوتی، نئی مطبوعات موضوع بحث آتیں اور مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔

پروفیسر شروانی بلاشبہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مکمل ترین علیگ تھے۔ یونیورسٹی کے علاوہ منٹو سرکل میں تعلیم حاصل کرنے والے اور انگلش ہاؤس میں رہنے والے طلبا کو مکمل علیگ کہا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ سرسید اور ان کی تحریک سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ وہ سرسید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے معترف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مطالعے کی بنیاد پر ان کے کمزور پہلوؤں پر گرفت بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ کے سرسید شناسوں میں ان کو بلند مقام حاصل ہے۔ سرسید کے ساتھ ساتھ پروفیسر شروانی کو ماہر ابوالکلامیات کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ مطالعات آزاد پر ان کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ، قومی سیاست اور قومی تحریک پر ان کی خاص نظر تھی۔ وہ بنیادی طور پر عربی کے اسکالر تھے، لیکن انھوں نے اردو ادبیات، سیاسیات اور آزادیات پر بہت کچھ لکھا۔ وہ بلاشبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تہذیب اور روایات کے مثالی نمائندہ تھے۔ انھوں نے نہایت فعال اور بھرپور زندگی گزاری۔ سادگی، صدق گوئی، شرافت، شائستگی، وضع داری اور علم دوستی ان کی دلکش شخصیت کی اہم خصوصیات تھیں۔ استغنا، توکل اور بے نیازی ان کی شخصیت سے عبارت تھی۔ وہ قدیم و جدید کا حسین سنگم تھے۔ وہ مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہندوستان سے محبت کرتے تھے اور آئین ہند کے سیکولرازم پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ ان کو اپنا وطن اتنا عزیز تھا کہ وہ تقسیم کے بعد پاکستان جاکر ہندوستان واپس آگئے تھے۔ وہ زندگی بھر ہر قسم کی فرقہ پرستی کے خلاف لکھتے رہے لیکن آخر عمر میں فرقہ پرست طاقتوں سے ان کے یقین کو ٹھیس پہنچائی اور ان کے خوبصورت ہندوستان کو فرقہ پرست ہندوستان بنا دیا جس سے ان کو دلی تکلیف ہوئی۔ وہ ایسے دانشور تھے جن کا دل عصبیت اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ پروفیسر شروانی اپنے علمی و ادبی ذوق اور بے باک تحریروں کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے پروفیسر شروانی کو قریب سے دیکھا، ان کی محبتوں اور شفقتوں سے لطف اندوز ہوا اور ان کے ساتھ نشستوں میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ آج پروفیسر شیروانی جیسے دانشور کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

■

Prof. Mohd Saleem Qidwai
C-501, Rosw wood Apartment
Mayur Vihar
New Delhi-110091
Mob.: 9953529424
mskidwai@hotmail.com

چھوٹا کشمیر کا قد آور شاعر

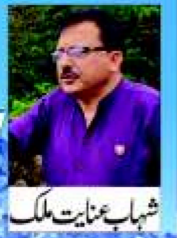

شہاب عنایت ملک

رسا جاودانی

خوبصورت وادی، چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ندی نالے، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑکیں، سرسبز و شاداب دھان کے کھیت، جائی، چنتہ، سپار دھار سیوج جیسے صحت افزا اور سیاحتی مقامات، حسین و جفاکش لوگ ان سب کا مجمعہ ہے بھدرواہ کی حسین و جمیل وادی جسے عرف عام میں چھوٹا کشمیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ وادی صدیوں سے بڑی زرخیز رہی ہے اور اس نے بڑے نامور شاعر، نقاد، مورخ اور سیاست دان پیدا کیے ہیں جنھوں نے اپنے کارہائے نمایاں انجام دے کر اس وادی کی چمک دمک میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اس وادی کو چھوٹا کشمیر تو کہا ہی جاتا ہے لیکن تعلیمی اعتبار سے اسے ریاست جموں و کشمیر کا کیرالہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں کے لوگ نہ صرف پڑھے لکھے ہیں بلکہ بڑے بڑے عہدوں پر تعینات ہو کر اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ اس وادی کو سائنس داں، پروفیسرز، سیاست داں، جج صاحبان اور وائس چانسلرز پیدا کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس خوبصورت وادی سے ایک خوبصورت شاعر رسا جاودانی بھی ابھرے جنھوں نے تقریباً ساٹھ سال شعر و ادب کی خدمات انجام دیں اور پورے برصغیر میں اپنی اردو اور کشمیری شاعری سے اپنے لیے تو الگ پہچان بنا ہی لی لیکن ساتھ ہی ساتھ بھدرواہ کے نام کو بھی عالمی سطح پر مزید منور کیا۔ کشمیری اور اردو زبان سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ بھدرواہ کی سب سے بڑی پہچان رسا جاودانی ہیں۔

خوبصورت وادی کے اس خوبصورت شاعر کے فن پر ریاست اور ریاست سے باہر کے ناقدین نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان سب کی آرا کو اس مضمون میں شامل کرنا مضمون کو طوالت دینے کے مترادف ہوگا۔ البتہ ہر ناقد نے انھیں اردو اور کشمیری کا دلنواز شاعر قرار دیا ہے اور ان کی شعر شناسی کی تعریف دوٹوک الفاظ میں کی ہے۔ ریاست کے نامور نقاد جناب محمد یوسف ٹینگ نے رسا جاودانی کو کشمیری غزل کا شہنشاہ قرار دیا ہے۔ ٹینگ کے مطابق کشمیری زبان میں فنی محاسن کے ساتھ غزل لکھنے والا واحد شاعر رسا جاودانی ہے۔ موتی لال ساقی کے مطابق رسا کشمیری زبان کا شہسوار ہے۔

رسا جاودانی کے آبا و اجداد اننت ناگ کشمیر سے ہجرت کر کے بھدرواہ آئے یہاں ان کی تجارت جب پھیل گئی تو انھوں نے بھدرواہ کو ہی اپنا مسکن بنایا۔ اس خاندان کا شمار اُس وقت کے بھدرواہ کے اعلیٰ ترین خاندانوں میں ہوتا تھا جو غریب پروری کے لیے مشہور تھا۔ رسا جاودانی کے والد خواجہ منور جو دیو کا شمار ریاست کے معزز ترین شہریوں میں ہوتا تھا جن کی دربار تک رسائی تھی اور جنھیں اس وقت کے مہاراجہ نے علم پروری کی وجہ سے انعامات سے بھی نوازا تھا۔ خواجہ منور جو دیو کے یہاں ہی رسا جاودانی 1901 میں پیدا ہوئے۔ جب رسا پیدا ہوئے تو ان کے والد خوشی سے پھولے نہیں سمائے انھوں نے پورے بھدرواہ میں بیٹے کی پیدائش پر مٹھائیاں تقسیم کیں۔ نام 'عبدالقدوس' رکھا جو بعد میں رسا جاودانی بن کر شعر و ادب کی محفلوں کو گرماتا رہا۔

رسا جاودانی کا بچپن بڑے ناز و دبدبے کے ساتھ گزرا۔ والد نے بچپن میں انھیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں۔ یہاں تک کہ انگریزی اور فارسی زبانیں سیکھنے کے لیے باضابطہ گھر پر استاد بھی تعینات کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسا جاودانی کو اردو اور کشمیری زبانوں کے علاوہ انگریزی اور فارسی زبان پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا اور انھوں نے شاعری کی شروعات اردو سے کی۔ وہ اردو زبان سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس زبان کو فخر ہندوستاں کہتے تھے۔ اردو سے ان کی محبت کا اندازہ اس نظم سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے اردو شعری مجموعے 'نظم ثریا' میں موجود ہے بعد میں کشتواڑ میں ایک بزرگ خواب میں آئے جنھوں نے اپنی مادری زبان یعنی کشمیری میں شعر کہنے کو کہا۔ اس کے بعد جب کشمیری شاعری کی شروعات کی تو آناً فاناً کشمیر کے طول و عرض میں رسا جاودانی کا نام گونجنے لگا۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں کشمیری عورتیں اپنی پر سوز آواز میں رسا جاودانی کی غزلوں کو موسیقی کا پیرہن عطا کر کے اس درد بھری شاعری کا لطف لینے لگیں۔ اس پر طرہ یہ کہ جب مشہور و معروف موسیقار 'صوفی غلام محمد' نے رسا جاودانی کی غزل 'ژہ لوگتھ سرمہ چشمن ژیوہ ماہ پروای ویسے' کو موسیقی کا پیرہن عطا کیا تو رسا ہمیشہ کے لیے جاوداں ہو گیا۔ راج بیگم شمیمہ دیو، کیلاش مہرہ، غلام نبی ڈولوال ریاست کے وہ مایہ ناز گلوکار ہیں جو رسا جاودانی کی

غزلوں کو گانا اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیری زبان کی لافانی گلوکارہ 'راج بیگم' اگر کچھ نہ گاتی تو بھی رسا جاودانی کی غزل 'مشہ روتھیس جاناں ژہ کر یاد پیائی بوانھیں فن کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔

رسا جاودانی کا بچپن عیش و عشرت میں گزرا لیکن جوانی کی دہلیز انھوں نے مصیبتیں اٹھا کر پار کی۔ کئی ایسی وجوہات تھیں کہ رسا مالی طور پر کمزور ہوئے لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود داری کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اپنی ذاتی خواہشوں پر قابو پا کر انھوں نے اپنے پورے خاندان کی نہ صرف پرورش کی بلکہ انھیں اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس خاندان کو پوری ریاست میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

رسا جاودانی کی شاعری کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انھیں انسانی قدریں بڑی عزیز تھیں وہ ایک انسان کو صحیح معنوں میں انسان دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے تو کہا ہے۔

نسل آدم سے جہاں سے معمور
آدمی اس جہاں میں تھوڑے ہیں
آدمیت کے روپ میں اکثر
ریچھ، بندر، گدھے ہیں، گھوڑے ہیں
ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انسان
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مسلمان کوئی
میں ایک مذہب وحدت کا یوں بنا ڈالوں
کہ لوحِ دل سے یہ نقشِ دوئی مٹا ڈالوں

رسا جاودانی کی طبیعت حساس تھی اگر میں انھیں سادگی اور صفائی کا مجسمہ کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ جب بات کرتے تھے تو حلیمانہ انداز کی گفتگو سے لگتا تھا کہ وہ لفظوں کے پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ وہ آپسی بھائی چارے کے زبردست حامی تھے۔ عمر کے آخری حصے تک وہ دیرینہ دوست نتھو شاہ کی دکان پر بیٹھ کر آپسی بھائی چارے کا درس دیتے رہے۔ یہ درس اُنھوں نے اپنی شاعری میں بھی دیا۔ کہتے ہیں۔

طواف کعبہ کو جاؤں، راہِ بنارس سے
خدا سے ملنے کی خاطر، بتوں سے ساز کروں
حاجی یہ رسا سے کہتے ہیں، امسال رسا کعبے کو چلو
وہ بت کا پجاری بے چارا کعبے کی دُنیا کیا جانے

لو یہ کوتاہ نظر یہاں تک پہنچے
کعبہ پہنچے تو کہا، تیرے مکاں تک پہنچے
میری شاعری، میری ساحری
ہے خیالِ الفت سے بھری
نہیں ہے یہ رجز کی فسوں گری
مگر آشتی کا پیام ہے

رسا نے جب شاعری کی شروعات کی تو انھوں نے اپنی چند غزلیں بغرض اصلاح علامہ سیماب اکبرآبادی اور پنڈت دتاتریہ کیفی کو بھیجیں لیکن دونوں استاد شعرا نے غزلیں یہ کہہ کر واپس لوٹا دیں کہ ان میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد رسا کی اردو شاعری 'رسالہ مخزن لاہور' اور 'زنبیر جموں' میں متواتر شائع ہوتی رہی جس کی وجہ سے برصغیر کے ادبی حلقوں میں اُن کی ایک الگ پہچان بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ جالندھری جیسے بلند قامت شاعر نے رسا جاودانی کو بھدرواہ کا ہیرا کہا ہے۔ محی الدین قادری زور کے مطابق رسا جاودانی کی غزلوں میں خواجہ میر درد اور مصحفی کا رنگ جھلکتا ہے اور نظموں میں وہ نظیر اکبرآبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔

کشمیری زبان میں رسا جاودانی کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں 'تحفہ کشمیر' اور 'نیرنگ غزل' جبکہ اردو میں 'لالہ صحرا' اور 'نظم ثریا' داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1947 میں رسا جاودانی نے اردو شاعری کے ایک ضخیم مجموعے 'شمستان' کے عنوان سے ترتیب دیا تھا ابھی وہ اشاعت کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ

رسا جاودانی کو قصیدہ نگاری کے فن پر بھی پوری دسترس حاصل ہے جس کا اندازہ اُس قصیدہ سے لگایا جاتا ہے جو انھوں نے بھدرواہ پر تصنیف کیا ہے اور جو ان کے دوسرے کشمیری شعری مجموعے 'نیرنگ غزل' میں شامل ہے۔

جموں میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوا اور یہ مجموعہ بھی فساد کی نذر ہو گیا۔ بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی ضائع ہو چکا ہے۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں ان کا شعری مواد اگرچہ کہ کم ہے لیکن معیاری اعتبار سے یہ کسی خزانے سے کم نہیں ہے۔ ان کی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ریاست کی کلچرل اکیڈمی نے انھیں خلعت سے بھی نوازا ہے۔ رسا جاودانی گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ انھوں نے متعدد ملکی سطح کے مشاعروں میں اپنی ترنم بھری آواز سے جادو جگا کر شعر و ادب کے شیدائیوں سے خوب داد وصول کی۔ ان کے ہم عصر شعرا میر غلام رسول نازکی، شہ زور کشمیری، مرزا عارف بیگ شوریدہ کاشمیری وغیرہ انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر ان سے فیض بھی حاصل کرتے تھے۔ اُس وقت کے ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد ان کی شاعری کے شیدائی تھے اور اکثر ان کے اشعار سننے کے لیے انھیں سرینگر مدعو کرتے تھے۔ اور اگر کبھی بھدرواہ آتے تو رسا سے ملے بغیر انھیں چین نہیں آتا تھا۔

رسا جاودانی کو قصیدہ نگاری کے فن پر بھی پوری دسترس حاصل ہے جس کا اندازہ اُس قصیدہ سے لگایا جاتا ہے جو انھوں نے بھدرواہ پر تصنیف کیا ہے اور جو ان کے دوسرے کشمیری شعری مجموعے 'نیرنگ غزل' میں شامل ہے۔ محمد یوسف ٹینگ کے مطابق رسا نے یہ قصیدہ سودا اور ذوق جیسے قصیدہ نگاروں کی زمین پر لکھ کر ریاست جموں و کشمیر میں قصیدہ نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔ یہ قصیدہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے وطن عزیز سے بے انتہا محبت ہے۔ وہ اس کے ندی نالوں، آبشاروں اور سرسبز وادیوں کی تعریف بہ بانگ دہل کرتے ہیں۔

رسا جاودانی بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ نفاست پسندی اور بے باکی ان کی شخصیت کے اہم جز ہیں۔ یہی خصوصیات ان کی شاعری کے اجزا بھی ہیں۔ انھیں اپنے لختِ جگر 'خیرات محمد ابن رسا' کی جب یاد تڑپاتی ہے تو وہ ''یہ ماگ سورتھی تہ پھالگنس منزا گرسو میون ٹوٹھ یار یٹھی'' جیسی غزل لکھ دیتے ہیں اور جب اس غزل کو ریاست کے نامور گلوکار غلام نبی ڈولوال ریڈیو پر اپنی مخصوص آواز میں گاتے ہیں تو سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے۔ اس

غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ رسا اپنے فرزند خیرات ابن رسا سے بے حد محبت کرتے تھے اور جب یہی لختِ جگر جدا ہو کر پاکستان جاتا ہے تو شاعر جدائی میں خون کے آنسو روتے ہوئے کہتا ہے کہ اے لختِ جگر کم از کم ملاقات کے لیے تو آجاؤ میرا دل تمھیں دیکھنے اور ملنے کے لیے ترس رہا ہے۔

رسا جاودانی ایک بہترین گلوکار بھی تھے اپنی اور کشمیری زبان کے شہرہ آفاق شاعر رسول میر کی غزلوں کو جب موسیقی کا پیرہن عطا کرتے تھے تو سننے والوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ابتدا میں ان کے والد رسا کے گانے بجانے کے سلسلے میں ناراض رہتے تھے لیکن بعد میں جب والد سے اجازت مل گئی تو وہ موسیقی کی محفلوں کی جان بن گئے۔ اس سلسلے میں بھدرواہ میں اردو اور کشمیری شاعر وفا بھدرواہی اُن کا ساتھ دیتے تھے۔ موسیقی کو اور زیادہ پر اثر بنانے کے لیے وہ گانے کے دوران تانبے کا گلاس بجانا پسند کرتے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ کشمیری موسیقی میں تانبے کا گلاس رسا ہی کی ایجاد ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ ریاست کے نامور گلوکار مرحوم غلام نبی ڈولوال سے اُن کے گہرے مراسم تھے اور جب رسا کشتواڑ جاتے تو ڈولوال صاحب موسیقی کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ جن میں ڈولوال کے ساتھ رسا بھی کشتواڑ کے سامعین کو اپنی رسیلی آواز سے محظوظ کرتے۔

1968 میں بھدرواہ ایک خوفناک طوفان کی زد میں آ گیا۔ اُس طوفان نے پوری بھدرواہ کی وادی کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ رسا جاودانی کا دل بھی تڑپ اٹھا اور انھوں نے 'طوفان' جیسی عمدہ نظم تحریر کی جسے پڑھ کر پورے طوفان کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شاعر اُس وقت ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر پورے طوفان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہ نظم منظر نگاری اور جذبات نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔

یہ کیا غضب خدایا، محشر یہ کیا دکھایا، طوفاں یہ کیسا آیا،
پانی کہاں سے چھوٹا، یہ کس کا بخت پھوٹا، یہ آسمان ٹوٹا
توبہ غضب کا پانی، یہ زور کی روانی، طوفان نوح ثانی
اشجار بہہ رہے ہیں، مینار بہہ رہے ہیں، گھر بار بہہ رہے ہیں
اِک کم نصیب بُڑھیا، اِک غم نصیب بُڑھیا ہے، بے غریب بُڑھیا
باہر کا شور سُن کر، نکلی جو گھر سے باہر، آغوش میں تھی دُختر
نکلی تھی بھاگ جائے، غم سے نجات پائے، معصوم کو بچائے
لہروں نے آکے گھیرا، لو چھا گیا اندھیرا

> رسا جاودانی ایک بہترین گلوکار بھی تھے اپنی اور کشمیری زبان کے شہرہ آفاق شاعر رسول میر کی غزلوں کو جب موسیقی کا پیرہن عطا کرتے تھے تو سننے والوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اسی طرح ان کی دوسری نظم بیتے دنوں کی یاد ہے جس میں شاعر ماضی کی خوشگوار یادوں میں کھو جاتا ہے اور حال کے واقعات سے تنگ آ کر ماضی کی شادمانیوں سے اپنے دِل کو بہلاتا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ شادمانی کا سماں، لوٹیں گے اب وہ دِن کہاں
کتنا حسیں وہ دور تھا، کچھ وہ زمانہ اور تھا
وہ چاند تارے اور تھے، سارے نظارے اور تھے

نظم ساون میں رسا نے ساون کے مہینے کی تعریف کی ہے دراصل یہ مہینہ عاشق اور معشوق کے لیے بڑا اہم مانا جاتا ہے۔ بہت سے شعرا نے اس مہینے کے تناظر میں عاشق اور معشوق کی تڑپ کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے مگر رسا جاودانی نے روایتی موضوع سے ہٹ کر ساون کے مہینے میں رونما ہونے والے نظامِ قدرت اور مناظرِ فطرت کی تبدیلیوں کو شعری قالب میں ڈھال کر ایک فطری سماں پیش کیا ہے۔

کیا رنگ ہیں گلوں کے
نغمے ہیں بُلبلوں کے
اے دل جلے پپیہے!
بے چین میرا جی ہے
ہے آگ سی لگائی
ساون کی رُت ہے آئی
تسکین دِل نے پائی
ساون کی رُت ہے آئی
ہر سو ہے خوشنوائی
ساون کی رُت ہے آئی

ہجر و وصال اور عشق کی تڑپ کے موضوع پر بھی رسا جاودانی نے بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں فراق کی تڑپ، تنہائی کا احساس اور وصال کی امید کی خواہش بھی ہے۔ کسی جگہ وہ معشوق سے نالاں بھی نظر آتے ہیں اور کسی جگہ محبت اور وصال کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عاشق کی بے چینی اور کرب کو بھی اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ذیل میں اُن کی غزلوں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گر آج وہ نہ آئے کل آئیں گے ضرور
دیتے فریب دِل کو ہم عمر بھر رہے
ہم بن کے تماشا تو گئے اُس کی گلی میں
وہ بہرِ تماشا بھی لبِ بام نہ آیا
ستارو، رات بیتی جا رہی ہے
وہ میرا مست خواب آئے نہ آئے
وہ سچ مچ بھی سامنے آئے
ہم سمجھتے ہیں خواب دیکھا ہے
آ کے مِل کے رویئے اے عندلیب
تو فدا گُل پر ہے میں گلفام پر!
کیا کرشمے ہیں نیازِ عشق کے
میں نے دی اُن کو دُعا دُشنام پر

رسا جاودانی کی شخصیت اور شاعری کا اس مختصر مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے لاتعداد صفحات کی ضرورت ہے۔ ان کی وفات کے بعد کلچرل اکیڈمی نے 'شیرازہ' کے اردو اور کشمیری نمبر شائع کر کے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی اور شعبہ اردو کشمیر یونی ورسٹی نے رسا جاودانی کے فن اور شخصیت پر مقالے تحریر کروا کر ایم فل کی ڈگریاں عطا کیں۔ جموں یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر امیتابھ مٹو نے شعبہ اردو کو تسلسل کے رسا جاودانی نمبر کے لیے خصوصی مالی تعاون دیا۔ یہ نمبر دو جلدوں میں شائع ہوا جس کی ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی۔

27 مئی 1989 کو ادب کا چمکتا ہوا یہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوا۔ کینسر کی مہلک بیماری نے ایسے اپنی زد میں لیا کہ علاج و معالجہ کے باوجود درد بڑھتا ہی گیا۔ 27 مئی کو ہزاروں اشک بار آنکھوں نے اپنے محبوب شاعر اور عظیم انسان کو ان کے بھدرواہ کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔

■

Prof. Shohab Inayat Malik
HOD Urdu
University of Jammu
Jammu - 180006 (J&K)
Mob.: 9419181351

مصنف: ڈی ڈی کوسمبی
مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

حیاتِ قدیمہ اور عصر ما قبل تاریخ

قدیم ترین اور خالص فطری زندگی کو جو ایک طرح کی حالتِ تکمیل نصیب تھی اس سے انسان کے انحطاط و محرومیت کی داستانیں متعدد مختلف ممالک و اقوام کے اساطیر میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ یہی حال ہندوستان کا بھی ہے۔ آج کل کے ہندو موجودہ زمانے کو نسلِ انسانی کا عہد تاریک (کل یگ) کہتے ہیں۔ مفروضہ طور پر اس سے پہلے تین بہتر دور گزر چکے ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے اعلیٰ زریں 'عہد صداقت' (ست یگ یا کرت یگ) تھا۔ اس زمانے میں انسانوں کو نہ کسی حاجت کا علم تھا اور نہ کسی بیماری کا۔ وہ نہ تو محنت کرتے تھے نہ کاتتے تھے کیونکہ یہ مہربان زمین خود بخود ہی بہ افراط چیزیں پیدا کرتی تھی۔ پُرامن و پُرسکون، سادہ و معصوم اور پاک باطن و نیک کردار مخلوق کی حیثیت سے ہر آدمی ہزاروں سال تک جیتا تھا۔ اس کے بعد انسانی حرص و طمع کی نشو و نما ہوئی۔ لوگ ذاتی املاک میں مسلسل اضافہ اور حاصل کردہ اشیا کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگے۔ ان معصیت آمیز سرگرمیوں نے انسان کو ترتیب وار 'ترت یگ'، 'دواپر یگ' اور 'کل یگ' پہنچا دیا جن میں سے ہر ایک زمانہ پہلے سے بدتر تھا۔ زندگی کے طول کم ہو گئے اور اپنی فطری و بے لوث پاکیزگی سے منحرف ہو جانے کے باعث نسل انسانی جنگ، بیماری، افلاس اور بھوک کے مصائب میں مبتلا ہو گئی۔ بدھ اور جین مذہب کی کتابوں میں بھی اسی طرح کے بیانات موجود ہیں۔ برہمنوں کی تحریروں میں جو سب سے زیادہ قریبی زمانے سے متعلق ہیں مسلسل گردشوں اور لامتناہی ادوار کا ایک مزید نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ 'عہد تاریک' (کل یگ) ایک عالمگیر طغیانی پر ختم ہوگا۔ اس سیلاب سے حیات کا تمام وجود تباہ ہو جانے کے بعد زمین سمندر سے پھر برآمد ہوگی اور ایک نیا سنہرا زمانہ شروع ہوگا۔ اس کے بعد اسی طرح ترقی پذیر انحطاط کے دوسرے تین دور گزریں گے اور ایک اور طغیانی پر ختم ہو جائیں گے۔ یہی کچھ ماضی میں ہوا اور یہی مستقبل کے ادوار میں ہوگا۔ تاریخ کی بے معنی تکرار کا یہ افسردہ نظریہ دراصل محض ایک عکس و پرتو ہے اس بے کیف ہندوستانی دیہی زندگی کا جو کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے موسم کی گردش اور تغیر و تبدل کے تحت گزرتی ہے، اکتوبر میں فصل کی کٹائی کے بعد خوشگوار سردی، صحت اور بہتات کا موسم آتا ہے۔ اس کے بعد ایک بڑھتی ہوئی قلت کا زمانہ شروع ہوتا ہے جس کا اختتام ہوتا ہے، ایک ایسے دور پر جب کہ خشک جھلسے ہوئے کھیتوں کو تخم ریزی کے لیے محض تیار کرنے کے لیے خراب حالات میں شدید مشقت کی ضرورت ہوتی ہے بالآخر ہولناک مانسونی بارش ساری زمین کو غرقاب کر دیتی ہے جس کے بعد موسموں کا یہی دور تسلسل ایسی ہی نوعیت کے ایک اور سال کے دوران خود کو دہراتا رہتا ہے۔

اس مشہور عام اساطیری افسانے باوجود زمانہ بعد کے شاعروں اور پروہتوں کے تخیلات سے باہر نسل انسانی کے کسی حقیقی عہد زریں کا کبھی کوئی وجود نہیں رہا۔ یہ بات ہمیں ان تاریخی دستاویزات کی براہِ راست تفہیم و تعبیر سے معلوم ہوئی ہے جو دو ہزار پانچ سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہیں اور ہندوستان سے باہر چند مقامات پر موجود ہیں۔ اس سے آگے ماضی کی عقدہ کشائی کے لیے آثار قدیمہ سے مدد لینی پڑتی ہے۔ آثار قدیمہ کا ماہر جب ایک ایسے مقام پر کھدائی کرتا ہے جہاں حالیہ زمانے میں زمین کو بہت زیادہ الٹا پلٹا نہیں گیا تو اسے واضح طور پر ایک دوسرے سے الگ اور غیر ہموار جمی ہوئی تہیں ملتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ قدیم تہیں وہ ہوتی ہیں جو زیادہ نیچے ہوتی ہیں اور اس طرح وقت کی ترتیب نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بہتوں میں انسانی حرکت و عمل کی علامات موجود ہوتی ہیں۔ یہ علامات جسمانی باقیات مثلاً ہڈیاں، کھوپڑی یا ایک واحد دانت کی شکل میں بھی ہو سکتی ہیں جو بڑی حد تک یہ بتا سکتی ہیں کہ ان اجزائے جسمانی کے مالک کس قسم کے انسان تھے۔ بعض خود آدمیوں کے ہڈیوں کے ساتھ اکثر ان جانوروں کی ہڈیاں بھی ملتی ہیں جن کا شکار آدمی کرتا تھا اسی طرح ان جانوروں کی ہڈیاں بھی دستیاب ہوتی ہیں جن کو وہ پالتا تھا۔ مثلاً کتا، مویشی، بھیڑ، گھوڑا، ان تہوں کا تقابل کر کے یہ بتانا ممکن ہوتا ہے کہ کتا، گھوڑے سے بہت پہلے پالا جاتا تھا اور مویشی اور بھیڑ کسی درمیانی زمانے میں۔ مٹی کے برتن، پتھر کے اوزان دھات کی سب چیزیں ان اشیا کی قبیل سے متعلق ہیں جن کو آدمی بناتا تھا اور اسی لیے ان کو 'حقائق مصنوعی' کہا جاتا ہے، اگر مصر کی طرح آب و ہوا خشک ہو تو کلری کے آلات ہڈیاں اور ہاتھی دانت کے ہتھیار، ٹوکریاں اونی اور سوتی یا کتانی ریشے فن سے کپڑا تیار کیا گیا ہو۔ اناج کے دانے اوراق پیپرس کے مخطوطات یا تصاویر قائم و محفوظ رہتی ہیں اور اس طرح ہم اندازاً یہ بتا سکتے ہیں کہ آدمی نے ان مختلف چیزوں کا بنانا کس ترتیب سے سیکھا۔ مزروعہ غلوں کو اگرچہ حقائق مصنوعی کی صف میں شامل نہیں کیا جاتا تاہم وہ بھی انسانی فعل و عمل کی ایسی تخلیق ہیں جیسے مٹی کے برتن۔ قدرتی گھاس کے موٹے سے موٹے بیج منتخب کر کے اور ان کو بار بار بو کر ہزاروں سال میں ان تمام نمکوں کو ارتقا یافتہ شکل میں لایا گیا تھا۔ فعل و عمل رک جاتا تو غلے کی تمام مزروعہ اقسام غائب ہو جاتیں یا پھر چند ہی نباتی نسلوں میں ان کے مضبوط تر جنگلی خودرو نمونے ان کی جگہ لے

لیتے۔ یہ طبق در طبق آثار ایک تاریخی سلسلے میں بعد میں اگر کوئی بھی الٹ پلٹ ہو مثلاً اوپر کی تہوں میں کوئی گڈھا کھودا گیا ہو۔ تو ایک تربیت یافتہ ماہر اس کو پہچان سکتا ہے اور نظر انداز کر سکتا ہے۔ مختلف مقامات پر دریافت ہونے والی اشیا کا تقابل یہ بتلاتا ہے کہ خاص قسم کا اوزار مٹی برتن یا اناج کتنی دور تک پہنچا تھا۔ آخری بات یہ کہ اشیا فلورین کی مقدار کوئلے اور ہڈی کی تابکاری۔ ارضی مقناطیسیت کے مشاہدات، درخت کے تنے میں پڑنے والے حلقوں کی بالیدگی میں موسمی فرق (تاریخ شجری) اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کی مدد سے تاریخوں کے تعین کا ایک اچھا خاصا نظام جدید تکنیک فراہم کرتا ہے۔ اس طرح از سر نو مرتب کیا ہوا ماضی (متعدد درمیانی خلا رکھتے ہوئے) سیکڑوں سال پیچھے تک چلا جاتا ہے تا آنکہ ہم 'انسان محض' کی اقسام مثلاً 'آدم جاوٗ' اور 'آدم پیکن' تک اور پھر قبل انسانی 'عہد سے متعلق' 'افریقی سردار' کی کھوپڑی تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں سے ہم اثریات کو جوڑ کر ارضیات کے میدان میں داخل ہوتے ہیں یعنی تاریخ کا مطالعہ ختم ہو جاتا ہے اور ذوات الثدی (دودھ پلانے والے جانور) فقاریہ (ریڑھ کی ہڈی) والے جانور مچھلیوں اور زندگی کی دوسری شکلوں کے ارتقا کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔

لیکن اس تمام تحقیق میں ایک گم گشتہ عہد زریں ایک قدیم اقبال و عظمت کی کوئی شہادت نہیں ملتی آدمی نے یکساں روی یا ثابت قدمی سے ترقی نہیں کی۔ لیکن مجموعی طور پر اس نے ترقی ضرور کی اور ایک خاص حد تک وہ نااہل جانور سے ترقی کر کے ایک اوزار ساز اور اوزار کار مخلوق بن گیا جو اپنی کثرت تعداد اور مختلف انواع کی سرگرمیوں کے ذریعے پورے کرۂ ارض پر چھا گئی اور جس کے لیے اب صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ خود پر قابو رکھنا سیکھے۔ لاکھوں سال بعد کھود کر نکالی ہوئی ہڈیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم حجری عہد کے کسی بھی آدمی کے لیے چالیس سال کی عمر تک بھی جینا ایک حیرت ناک کارنامہ تھا۔ ہم سے زیادہ صحت مند ہونا تو درکنار وہ ہم سے زیادہ طفیلی کیڑوں مکوڑوں اور مفلوج کن امراض کا شکار تھا جو اس کی زندگی کو کم کر دیتے تھے۔ عہد زریں اگر کوئی ہے تو وہ مستقبل میں ہے، ماضی میں کچھ نہیں تھا۔

عصر ماقبل کی تاریخ اور حیات قدیمہ

ماہر آثار قدیمہ کی دریافتیں ہمیں ازخود یہ نہیں بتاتیں کہ کسی خاص زمانے کے لوگ واقعی کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اس طرز زندگی (پوری ثقافت) کا خاکہ از سر نو مرتب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دنیا کے الگ تھلگ اور افتادہ مقامات پر جو بہت سے مختلف قدیم قبائل باقی رہ گئے ہیں ان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ تب رفتہ رفتہ یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ایک خاص زمرے کے اوزار کس طرح بنائے گئے اور استعمال کیے گئے اور اس کے بنانے والے ماضی بعید میں کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ جب سماجی نظام وجود میں آ گیا تو اسی طرح کچھ نہ کچھ سماجی نظام کے متعلق بھی بتایا جا سکتا ہے لیکن کم تیقن کے ساتھ۔ خود یہی حقیقت کہ آسٹریلیا اندرون برازیل میں ایک قدیم ابتدائی قبیلے کا مطالعہ ممکن ہے یہ معنی رکھتی ہے کہ اہل قبیلہ کا باہر کی دنیا سے اور بطور نتیجہ بیرونی تہذیب سے کچھ رابطہ رہ چکا ہے۔ ایسا ماننا ہی پڑے گا کہ کیونکہ کوئی رابطہ بغیر تغیر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کوئی انسانی گروہ کسی حد تک ایک ہی مقررہ حالت میں نہیں رہ سکتا۔ یا تو ارتقا پا کر کوئی زیادہ اہل و بہتر صورت اختیار کرتے ہیں یا پژمردہ ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قبل تاریخ کے لوگ جن کا ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں روئے زمین سے مٹ چکے ہیں۔ بعض گروہ اپنے بعد ایسے اخلاف چھوڑ گئے ہیں جو آگے بڑھ کر تہذیب حاضرہ تک آ گئے اور بعض صفحۂ ہستی سے یکسر غائب ہو گئے۔ دور افتادہ گوشوں میں جو تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں انھوں نے کچھ خیالات ذہنی انداز، توہمات، پوجا پاٹ کے طریقے اور رسم و رواج اس قسم کے پیدا کر لیے ہیں جو ان کی زندگی کے جدید طریقوں کا تجربہ کرنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے عہد کے بیشتر وحشی گروہوں کا سماجی ڈھانچہ ایسا سخت اور بے لوچ ہے کہ ہر ایک جدت و بدعت کی ہمت فرسائی کرتا ہے حالانکہ سب کا ایک ہی سماجی ڈھانچہ نہیں ہے۔ کوئی مادہ پرست سماجی نشو و نما پر خیالات کے اثر کو نظر انداز کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا۔

دنیا کے جن حصوں میں وسیع پیمانے پر کھدائی ہو چکی ہے وہاں کے اثریاتی ریکارڈ سے یہ تسلسل ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے نیچے اور اس لیے سب سے قدیم حصے میں چھلے ہوئے پتھر کے بھدے ٹکڑے ہیں۔ یہ اوزار کے طور پر لکڑی اور ہڈی کے ساتھ ہوتے تھے جو کہ اب نابود ہو چکی ہے۔ اس قدیم حجری عہد نے ایک لاکھ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت کے دوران پتھر کو چھیل کر اوزار بنانے کی تکنیک میں بہت سست ترقی کی۔ اس کے بعد پتھر کے صاف اور چکنے اوزاروں کا زمانہ (عہد جدید حجری) آیا۔ ان دونوں کے درمیان 'وسطی حجری عہد' آیا یہ اصطلاح اب استعمال نہیں ہوتی۔ اس عہد کی حد اور مدت غیر متعین ہے۔ زمین کی زیریں تہیں جن میں صرف پتھر کے اوزار تھے اور قیاساً ہڈی لکڑی اور سینگ کے بھی وقت گزرنے پر دوسری تہوں کے نیچے دب گئیں جن میں دھات کے اوزاروں اور دھات کے ہتھیاروں کے باقیات تھے۔ سب سے پہلے جس دھات کا وسیع پیمانے پر استعمال ہوا وہ تانبا تھا جس کو ایک معمولی بھٹی کے ذریعے اس کی خام معدنی حالت سے پاک و صاف کر کے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ بھٹی اس آوے سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتی جس کی مٹی کے برتن تیار کرنے میں ضرورت ہوتی۔ مٹی کے برتن اواخر عہد حجری والے پتھر کے اوزاروں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ تانبا اتنا نرم ہوتا ہے کہ پگھلائے اور کوٹے بغیر کارآمد نہیں ہو سکتا اور اس پر بھی اس قدر خستہ و نازک ہوتا ہے کہ اگر کسی دوسری دھات مثلاً رانگ یا ٹین کی مناسب آمیزش نہ کی جائے تو کام نہیں دیتا۔ چونکہ رانگ کے ذخیرے وسیع پیمانے پر موجود نہیں اس لیے 'کانسی کا زمانہ' بہت کچھ تحقیق و تلاش پر دلالت کرتا ہے۔ تین ہزار قبل مسیح تک یا اس سے قبل ہی طویل فاصلوں پر تجارت کی سرگرمیاں پورے شباب پر آ چکی تھیں۔ بہترین قسم کی کانسی نسبتاً کم یاب دھات تھی اور بہت کم لوگوں کے قبضے میں رہتی تھی۔ اس کے یہی معنی ہوئے کہ سماج متفرق طبقات میں بٹ چکا تھا۔ 'کانسی کے زمانے' میں خام دھاتوں کے ذخیروں اور عمدہ آبی وسائل پر قابو پانے کے لیے بہت کافی جنگ و جدل ہوئی اور طویل فاصلوں پر چھاپے مارے گئے۔ دوسرے ہزار سال دور قبل مسیح میں (ایک ہزار تا دو ہزار ق م) بے شمار قبائل بہت کافی لیکن متحرک غذائی رسد (عموماً مویشی) کے ساتھ نقل و حرکت میں تھے اور یوریشیائی براعظم میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دریائی وادیوں کی قدیم تر زرعی ثقافتیں اس سے ایک ہزار قبل ہی مصر اور میسوپوٹامیہ میں شہری ریاستوں، بادشاہتوں معبدی پیشوائیوں اور جنگ و جدل کے اداروں کو پروان چڑھا چکی تھیں اس طرح کی ترقی و نشو و نما مقامی

اور استثنائی تھی۔ موجودہ زمانہ عصریاتی اعتبار سے لوہے کا زمانہ ہے، لوہا ایک کافی ارزاں اور وسیع طور پر ملنے والی دھات ہے جو زراعت کے لیے ایک عالمی امکان فراہم کرسکتی ہے اواخر عہد حجری میں کچھ زراعت ضرور نمودار ہوئی تھی اس لیے ہم ذرائع پیداوار میں ایک جدید حجری انقلاب' کا نام لے سکتے ہیں لیکن یہ چند مخصوص پسندیدہ علاقوں ہی تک محدود تھا، جہاں گھنے جنگلوں کو صاف کرنا ضروری نہیں تھا مثلاً میسوپوٹامیہ (عراق، مصر، وادی سندھ، ایران کے مرتفع میدان ترکی، فلسطین، ولدی ڈینوب کی چکنی مٹی کے تنگ قطعہ کے بعض حصے اور شاید چین میں زرد چکنی مٹی کے بعض علاقے اگرچہ لوہا جب پہلی بار تیار کیا گیا تو کانسی سے نرم تھا پھر بھی اس کے ذریعے جنگل صاف کیے جا سکے اور سخت تر مٹی میں ہل چلانا ممکن ہوسکا۔ یہ پہلی دھات تھی جو بہت سے لوگوں کو دستیاب تھی اور ایک مضبوط جنگ جو طبقے کے اجارہ میں نہیں تھی۔ اولین کسان جنھوں نے کتال ہیوک (ترکی) اور جیریکو (فلسطین) کے مقام پر قصبے تعمیر کیے۔ ان کا زمانہ سات ہزار ق م سے آٹھ ہزار ق م تک پہنچتا ہے لیکن ان کے غذا پیدا کرنے کے طریقے قریب کے میدان میں وسیع پیمانے پر استعمال نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کی کاشت کاری مصر اور عراق کے برخلاف غذا اندوزی اور گلہ بانی کی محض ایک ضمیمہ اس وقت تک بنی رہی۔ جب تک دو ہزار ق م کے اواخر میں لوہا دستیاب نہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوہا تیار کرنے کے سب سے پہلے عمدہ طریقے حتی کہ لوگوں کے اجارے میں تھے جس کی وہ سخت حفاظت کرتے تھے۔ یہ لوگ اس علاقے میں آباد تھے جو اب ترکی کہلاتا ہے 1450 ق م میں بھی لوہا اتنا کمیاب تھا کہ فرعون، طوطن، خامن ایک ٹھوس سونے کے تابوت میں دور ایک ایسے مقبرہ کے اندر دفن کیا گیا جو کانسی، ہاتھی دانت اور دیگر اشیا سے بھرا ہوا تھا لیکن لوہے کا اس کے پاس صرف ایک تعویذ تھا۔ جو اس کی کھوپڑی کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ سستے لوہے کی دریافت کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس سے لوگوں کی اکثریت کو مسرت حاصل ہوگئی۔ ایشیائے کوچک کی چھوٹی چھوٹی الگ تھلگ قوموں کو کانسے کے زمانے میں بھی اکثر حملہ آوروں کا سیلاب بہالے گیا تھا جب زیادہ وافر نفری قوت (اکثر زرخرید اور زمین سے وابستہ زرعی غلاموں کی صورت میں) فراہم ہوسکی تو صرف اسی وقت لوہے کے استعمال کے معنی ہوئے زیادہ غذا— زیادہ جبر وظلم— تجارتی راستوں سے دور کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائلی ایسے رہ گئے (اور تقریباً آج تک موجودہ ہیں) جو خود کو بدل کر غذا پیدا کرنے کی بجائے غذا تلاش وجمع کرنے کے عہد حجری پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے۔ وہ تہذیب کی سمت پیش قدمی سے الگ ہوکر رہ گئے پتھر کا گاہ بگاہ استعمال قبل تاریخ کے عہد سے تاریخی دور میں کافی دور تک جاری رہا۔ شاہ ہیرلڑ کی فوج کے بہت سے سگلین لوگ 1066 میں ہسٹنگیز کی جنگ کے دوران پتھر کی کلہاڑی سے مرے تھے اگرچہ 54 ق م میں جولیس سیزر کے حملے سے بہت پہلے ہی انگلستان آہنی عہد میں داخل ہوچکا تھا۔ ایک کل کی حیثیت سے غذا جمع کرنے والے سماج کی خصوصیات بیان کرنا آسان نہیں، عہد حاضر کا رومانی مکتب انشا یقین رکھتا تھا کہ ابتدائی قدیم آدمی لازمی طور پر ایک شریف وحشی ہوگا۔ تہذیب کی آلودگیوں سے پاک فطرت کا ایک طفل معصوم، برائیوں اور حرص و آز سے آزاد، ایک فطری ارضی بہشت کا یہ افسانہ کرسٹوفر کولمبس کے ایک خط سے شروع ہوا جو اس نے کسٹیل کی ملکہ بیلا کے نام لکھا تھا۔ اس سیاح کو جب ہندوستان کے زریں شہروں تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی تو وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے مضطرب ہوگیا کہ اس نے بہرحال ایک غیر معمولی چیز دریافت کرلی ہے۔ بعض امریکہ کے جنوبی جزائر کا انسان فطری حالت میں۔ اس طرح ہیجان میں آکر یورپ کی قوت تخیل ایسی چیز مل گئی جو ('باغ عدن' کے بعد) نہ تو انجیل میں موجود تھی اور نہ ان یونانی لاطینی ادبیت عالیہ کی خیالی جدتوں میں جن کی دریافت 'نشاۃ ثانیہ' میں ہوئی تھی۔ ارسو کے سماجی نظریات اور والٹیر کی اپنے ہم عصر سماج پر بھرپور طنزیات کو اس 'فطری انسان' دریافت سے بڑی تقویت ملی کچھ لوگ تو ابتدائی قدیم کمیونزم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں گویا وہ معاشرے کی ایک معیاری حالت تھی جس میں سب کا حصہ برابر تھا اور سب اپنی ساری ضرورتیں امداد باہمی سے پوری کرتے تھے اسی چیز کو انتہا تک لے جائیں تو یہ بھی عہد حاضر کے سرخی مائل لباس میں 'عہد زریں' کا ہی ایک افسانہ ہے۔ غذا اکٹھا کرنے والا ابتداً سماج بڑا محدود تھا۔ ہر مقام پر اور ہر زمانے میں اس کی خصوصی نوعیت کا تعین، غذا کی قلت اور غیر یقینی فراہمی سے ہوتا تھا۔ گراہم کلارک جیسا محتاط ماہر آثار قدیمہ بالائی قدیم عہد حجری میں انگلینڈ اور ویلز کی مجموعی آبادی کا تخمینہ شاید دو سو پچاس نفوس انسانی بتاتا ہے جو دس چھوٹی جماعتوں میں منقسم تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق 'وسطی عہد حجری' میں پورے برطانیہ عظمیٰ کی آبادی چار ہزار پانچ سو— 'جدید عہد حجری' کے کسی ایک دور میں بیس ہزار اور اس کی تعداد کے دُگنے سے کچھ کم ایک ہزار ق م اور دو ہزار ق م کے درمیان تھی۔ جب کہ کانسی کا زمانہ غدائی، پیداوار کا سلسلہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ ہندوستان میں اثریاتی شہادت فی الحال اس قدر ناقص ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے تخمینے پیش کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال اگر ہندوستانی تحتی براعظم کے کسی بھی وسیع علاقے میں 'عہد حجری' کی آبادی ہر دس مربع میل ایک آدمی سے زیادہ تھی تو یہ بھی ایک حیرت خیز بات ہوگی۔ وہ مقامات بھی جہاں قدرت مہربان ہے اس کا فیضان تمام موسموں میں یکساں نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی متواتر سال قلت کے آئیں۔ ایک بڑی مجموعی آبادی متعلق قائم شدہ بستیاں کسی قسم کے غذائی ذخیروں کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ غذا کو محفوظ رکھنے کی منزل غذا کی تلاش وجمع کی زندگی مقابلتاً بعد میں آتی ہے۔ خشک مچھلی اور گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے نمک کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی قدر فاصلے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح غذا کو رکھنے والی چیزیں مثلاً ٹوکریاں چمڑے کے تھیلے اور مٹی کے برتن وغیرہ بھی ضروری ہی تمام اقسام کی غذا کو محفوظ بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ ذخیرہ کرنے کے لیے مغز والے میوے غلہ اور کچھ پودوں کی جڑیں بہترین چیزیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر پکائے بغیر ہضم نہیں ہوسکتیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگ پر قدرت حاصل ہو اور کچھ مٹی یا برتن کی دھات موجود ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے سے بہت پہلے آدمی نے سماجی زندگی کے خاص طریقے پیدا کرلیے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی ہزاروں سال تک اوزار استعمال کرنے والے حیوان کی حیثیت سے زندگی گزار چکا تھا۔ ■

ماخذ: قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں، **مصنف:** ڈی ڈی کوسمبی، **مترجم:** بالمکند عرش ملسیانی، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مصنف: رولو مے
مترجم: زاہدہ زیدی

فرد کی قدر شناسی اور اثبات اقدار کی صلاحیت

دورِ جدید میں اقدار کی شکست و ریخت اور زوال کے مباحثے کے سلسلے میں ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس خیال کا اظہار کریں کہ اصل مسئلہ کچھ نئی اقدار کی دریافت ہے اور کچھ اور لوگ شاید یہ سوچیں کہ ماضی کی اکثر اقدار مثلاً محبت، برابری اور انسانی بھائی چارہ وغیرہ بہت اچھی اقدار ہیں اور مسئلہ صرف انھیں واپس لانے کا ہے۔

لیکن ان دونوں صورتوں میں ایک بات نظرانداز کردی ہے اور وہ یہ کہ بڑی حد تک جدید انسانی اقدار میں یقین اور ان کے اثبات کی صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے۔ ایک قدر اپنی جگہ اہم، گہری یا مناسب ہوسکتی ہے لیکن ایک فرد کے لیے جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ خود اس کی 'قدر شناسی' اور اقدار کی یافت کی صلاحیت ہے۔ ہٹلری فاشزم میں بربریت کی فتح کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگ اخلاقی روایت اور اقدار کو بھول گئے تھے۔ آزادی اور عوامی خوشحالی کی انسانی اقدار اور عیسائیت اور یہودیت کی اجتماعی ذمے داری اور محبت کی اقدار اس وقت بھی کتابوں میں موجود تھیں اور مذہبی اسکولوں میں ان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لوگوں میں ان اقدار کو اپنے تجربے میں سمونے اور ان کا اثبات کرنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔

اسی طرح 'اقدار کے مرکز' کی تلاش کے تصور میں بھی ایک قسم کا مصنوعی پن ہے اور یوں بھی اقدار کے کسی خارجی مرکز کی تلاش کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ انسان اجتماعی تصورات اور گروپ کی توقعات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے اور اسے ہر وقت یہ فکر لاحق رہے کہ اس سلسلے میں نو بہ نو فیشن کون سا ہے گویا اقدار بھی کوئی سامان آرائش ہوں جس میں جدید فیشن کی پابندی ضروری سمجھی جائے اور یہی رویہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، سوسائٹی کے کھوکھلے پن اور فرد کے خالی پن کے احساس کی جڑ ہے۔

ایک انسان کا ذاتی تجربہ، مقاصد، اخلاقی شعور اور اقدار کا اثبات ہی اس مباحثے کی بنیاد اور اس کا اولین قدم بن سکتا ہے کیونکہ ایک انسان کے اخلاقی فیصلے اس کی قدر شناسی کی قوت ہی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ 'اقدار کی بحث' بھی ایک گمراہ کن تصور ہے کیونکہ نظریاتی اور علمی بحث اقدار میں یقین کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ ہر وہ چیز جس کی ایک انسان قدر کرتا ہے مثلاً اپنے بیوی بچوں سے محبت اور اپنے لیے ان کی محبت، ڈرامہ، موسیقی، کوئی خاص کھیل یا اپنے کام میں فخر کا جذبہ، اس کے لیے ٹھوس حقیقتوں کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کے سلسلے میں کوئی نظریاتی بحث اسے اگر بدتمیزی نہیں تو غیر ضروری یقیناً معلوم ہوگی۔ اگر اسے اس سلسلے میں توجہ پیش کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا ''میں اپنے بچوں سے محبت اس لیے کرتا ہوں کہ میں یہ جذبہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں'' اور اگر اسے اس سلسلے میں زیادہ پریشان کیا جائے تو شاید وہ یہ کہے کہ ''اگر آپ خود اس جذبے سے آشنا نہیں تو اس سلسلے میں آپ سے کوئی بات کرنا بے سود ہے'' اصل زندگی میں کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ ہمارے اندرونی تجربے، عمل اور ردعمل کے سیاق و سباق ہی میں کیا جاسکتا ہے اور اس کے سلسلے میں نظریاتی یا لفظی بحث کی حیثیت ثانوی ہے۔

ہم یہ ثابت کرکے کہ وہ ہر چیز جس کی طرف کسی خاص شخص کا کسی خاص وقت رجحان ہے وہی 'اچھی' اور 'سچی' بھی ہے، قدر کو ایک نفسیاتی گورکھ دھندا بناکر پیش نہیں کرنا چاہتے۔ اور نہ ہم اقدار کی وضاحت میں فلسفہ، مذہب اور دوسرے انسانی علوم کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ ان سب علوم کی مشترک کوششوں ہی سے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے کہ وہ کون سی اقدار ہیں جن کے مطابق عصر حاضر کا ایک انسان اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

لیکن ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ ایک انسان کا ذاتی تجربہ، مقاصد، اخلاقی شعور اور اقدار کا اثبات ہی اس مباحثے کی بنیاد اور اس کا اولین قدم بن سکتا ہے کیونکہ ایک انسان کے اخلاقی فیصلے اس کی قدر شناسی کی قوت ہی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ایک شخص کا حقیقت کا

ادراک اور حقیقت سے اس کا ذاتی تعلق اور اس کے ذاتی عمل اور فیصلے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں اور اسی کی مدد سے وہ اقدار کا اثبات کرتا ہے اور ان اقدار کے بامعنی اور بااثر ہونے کا دار و مدار بھی انھیں چیزوں پر ہے اور اسی صورت حال میں وہ اپنے کردار اور فیصلوں کی اخلاقی ذمے داری بھی قبول کرسکتا ہے اور اسی طرح اس کا ہر قدم خوب سے خوب تر اقدار کی یافت کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے کیونکہ صرف ذاتی تجربہ ہی نئے امکانات کے ادراک اور لطیف امتیازات کا وسیلہ بن سکتا ہے جب کہ رٹی رٹائی باتوں پر یقین اور دوسروں کی نقالی ایک مخصوص صورت حال کی انفرادیت اور ندرت کے احساس کو دھندلا کر دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک انسان کا عمل اسی حد تک پر جوش اور پر اثر ہوگا جس حد تک وہ اس میں یقین رکھتا ہے اور اس یقین کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ خود اپنے عمل کا انتخاب اور شعوری طور پر اپنے نصب العین کا اثبات کرسکتا ہو۔

زرتشت کے خیال کے مطابق انسان کو 'قدر داں' یا 'قدر شناس' کہنا مناسب ہوگا۔ اس کے الفاظ میں 'قدر شناسی کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی' اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ قدر شناسی دوسرے لوگوں اور قوموں کی قدر شناسی سے مختلف ہو کیونکہ قدر شناسی ایک تخلیقی عمل ہے۔ قدر شناسی ہی اس چیز کا جوہر ہے جس کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ قدر شناسی ہی اقدار کی خالق ہے، اس کے بغیر زندگی کھوکھلی ہے۔''

اب ہم زیادہ ٹھوس طریقے سے اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک انسان کس طرح ایک اخلاقی انتخاب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر صورت حال میں ان گنت جبری پہلو بھی ہوتے ہیں لیکن ذاتی فیصلے کے لمحے میں انسان کو ایک ایسا اندرونی تجربہ ہوتا ہے جو اس جبریت کا پروردہ نہیں بلکہ ایک نئی جست ہے۔

مثال کے طور پر فرض کرلیجیے کہ ایک شخص کو ایک کشتی میں بیٹھ کر کسی جگہ جانا ہے جہاں اس کو تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ مقررہ مقام پر پہنچنے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی اسٹرائک ہے اور ایک خاص مقام پر اسے آگے جانے سے روکا جاتا ہے۔ اس اسٹرائک کی وجہ بھی انصاف یا مساوات کا کوئی مسئلہ ہے لیکن اس وقت اس شخص کے سامنے ایک اخلاقی مسئلہ ہے جو اس کے لیے زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ وہ اس لائن کو پار کرے یا نہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت وہ اسٹرائک کے حق بجانب یا غیر ضروری ہونے کے سوال پر غور کرے اور اپنی تقریر کی اہمیت اور وعدہ پورا کرنے کی ضرورت سے اس کا مقابلہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ آیا کسی اور طریقے سے اس خاص مقام پر وقت مقررہ پر پہنچنا ممکن ہے یا نہیں۔ لیکن فیصلے کے لمحے میں اسے اس خطرے کے احساس کے ساتھ جو کسی بھی فیصلے کے لیے ناگزیر ہے اسے تمام تر ذمے داری خود لینی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ گویا ایک قسم کی جست ہے جو کسی ادھورے پن کی تاب نہیں لاسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مثال کسی قدر مبالغہ آمیز ہے کیونکہ اس صورت میں غالباً بیشتر لوگ تو کسی خارجی اصول کے سہارے سے یہ فیصلہ کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ یہ کہیں 'اسٹرائک توڑنا میرے اصول کے خلاف ہے' یا یہ کہ 'چولھے میں ڈالو اس اسٹرائک کو اور اسٹرائک کرنے والوں کو یہ لوگ تو کوئی نہ کوئی جھگڑا

اب ہم زیادہ ٹھوس طریقے سے اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک انسان کس طرح ایک اخلاقی انتخاب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر صورت حال میں ان گنت جبری پہلو بھی ہوتے ہیں لیکن ذاتی فیصلے کے لمحے میں انسان کو ایک ایسا اندرونی تجربہ ہوتا ہے جو اس جبریت کا پروردہ نہیں بلکہ ایک نئی جست ہے۔

کھڑا ہی رکھتے ہیں اور اس طرح گویا وہ اپنے فیصلے کی ذمے داری کسی خارجی چیز پر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن جو شخص اس انتخاب کے وقت شعور ذات کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اس کے لیے یہ فیصلہ ایک اضافی قدر کا حامل ہوگا جس نے وقتی طور پر اس کی قوتوں کو یکجا کردیا ہے اور یہ صرف ذاتی سالمیت کا احساس نہیں (گو کہ شعور کی پختگی کے ساتھ یہ احساس بھی حاصل ہوسکتا ہے) بلکہ یہ اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ اس قسم کا کوئی فیصلہ ایک قسم کی کمٹ منٹ جس کا ماخذ ایک 'جست' ہے گویا کہ وہ شخص خود سے کہہ رہا ہو 'اپنے علم اور شعور کی روشنی میں، میں اس وقت یہی فیصلہ کرسکتا ہوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ آئندہ میرے علم و شعور میں اضافہ ہو اور اس قسم کی صورت میں، میں کوئی دوسرا فیصلہ کروں۔''

اس کے ساتھ ساتھ اس انتخاب نے صورت حال میں بھی ایک تبدیلی پیدا کی ہے خواہ وہ ایک خفیف تبدیلی ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس طرح ایک شخص نے ایک مخصوص نقطۂ نظر یا طریقۂ کار کی تائید کرکے اسے مضبوط بنایا ہے اور یہی ایک فیصلے کا فعال اور تخلیقی پہلو ہے۔

جیسا کہ ہر ایک جانتا ہے، ایک شخص لاشعوری قوتوں سے بیشمار طریقوں سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن یہ بات اکثر نظر انداز کردی جاتی ہے کہ شعوری فیصلے بھی، بشرطیکہ وہ جلد بازی میں یا باغیانہ انداز سے نہ کیے گئے ہوں بلکہ صحت مند انداز سے سوچ سمجھ کر کیے گئے ہوں۔ اکثر لاشعوری قوتوں کے تند دھارے کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اعصابی علاج کے دوران اکثر اس بات کی بڑی اچھی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص جو کافی عرصے سے اپنے والدین کو خدا حافظ کہنے اور ایک خاص نوکری کرنے کا فیصلہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس دوران میں اکثر کچھ اس قسم کے خواب دیکھتا ہے کہ جن میں اس بے یقینی کی جھلک ہے۔ ان میں سے کچھ خواب اسے گھر چھوڑنے کے خلاف آگاہ کرتے ہیں اور کچھ اس کے روشن پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر آخر کار وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے اور پھر یکایک اس کے خوابوں میں بھی ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ اس کے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا کہ اس کے شعوری فیصلے نے لاشعوری قوتوں کے رکے ہوئے دھارے کے بند توڑ دیے ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری شخصیت ہی وہ صحت اور توانائی کے کچھ ایسے امکانات ہیں جنھیں بروئے کار لانے کے لیے ایک شعوری فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمثیلی طور پر انفرادی فیصلہ یہودیوں اور سیسرا کی فوجوں کی آپسی لڑائی میں یہودیوں کی یاد دلاتا ہے۔' آسمان کے تاروں نے اس

لڑائی میں یہودیوں کا ساتھ دیا' لیکن یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب یہودیوں نے خود لڑنے کا فیصلہ کیا۔

اس لیے ایک اخلاقی عمل کو اس قسم کا عمل ہونا چاہیے جس کا فیصلہ اثبات ایک انسان خود کرے اور جو اس کے گہرے اندرونی مقاصد اور رجحانات کا آئینہ دار ہو، اگر وہ فیصلہ پرخلوص ہوگا اور ایمانداری سے کیا گیا ہوگا تو نہ صرف اس کے شعوری خیالات بلکہ اس کے خواب اور وجدانی بصیرت بھی اس کی تائید کرے گی۔ اس طرح ایک اخلاقی بصیرت رکھنے والے شخص کے فیصلے اور اعمال شعوری اور غیرشعوری طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور پر تو کسی انسان سے محبت کرے اور لاشعوری طور پر اسی سے نفرت کرے۔ گو کہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس طرح کی سالمیت شاید کبھی بالکل مکمل نہیں ہوتی۔ انسانی مقاصد کبھی بھی پورے طور سے پاک صاف اور یک طرفہ نہیں ہوتے اس لیے انسانی عمل میں بھی کچھ نہ کچھ تضاد ضرور ہوتا ہے۔ ایک اخلاقی عمل کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں مکمل اتحاد اور ہم آہنگی ہو اور شک وشبے کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اگر ایسا ہوتا تو غالباً انسان کے لیے کوئی قدم اٹھانا یا فیصلہ کرنا تقریباً ناممکن ہوتا کیونکہ اس قسم کے موقع پر رشک وشبہ، کشمکش اور اندرونی جدوجہد تو ایک لازمی امر ہے لیکن اس فیصلے اور اس قسم کے اقدام میں یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ اسے انسان اپنے پورے خلوص کے ساتھ کرتا ہے اور وہ اس کی ذات کے مرکز اور گہرائیوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس میں یہ اعتراض بھی شامل ہوتا ہے کہ اس شخص کے مقاصد پوری طرح واضح اور صاف نہیں ہیں اور آئندہ اپنے علم اور نئے تجربے کی مدد سے انھیں زیادہ روشن بنانے کی ذمے داری خود اس کی ہے۔

اخلاقی عمل میں اندرونی مقاصد کی اہمیت کے سلسلے میں جدید نفسیات کی دریافتیں اور حضرت عیسیٰ کے اخلاقی تصورات اور ارشادات ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ کی اخلاقیات میں خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے 'دس عظیم احکامات' کے خارجی اصولوں کے بجائے اندرونی مقاصد کو اخلاقیات کا مرکز اور سرچشمہ قرار دیا اور فرمایا کہ 'زندگی کے مسائل کا سرچشمہ انسانی دل ہے' اخلاقی مسئلہ اس طرح طے نہیں کیا جاسکتا کہ 'قتل نہ کرو' چوری نہ کرو' بلکہ اس

انسان کی ذات ہی اس کا مرکز ہے کیونکہ تمام کائنات اسی ذات پر مرکوز ہے اور عرفان ذات ہی عرفان الٰہی ہے۔'' اخلاقیات کی بحث یہاں ختم نہیں ہوتی لیکن اگر ہم اسے اس مقام سے شروع نہ کریں تو کسی منزل تک پہنچنا بھی ممکن نہیں۔

کے لیے دوسروں کی طرف اندرونی رجحانات مثلاً غصہ، نفرت، مخالفت، رشک وحسد، دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہوس وغیرہ سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے جو عام طور پر اس قسم کے برے اقدام کا باعث بنتے ہیں۔ جب لوگوں کے خارجی عمل اور اندرونی مقاصد اور رجحانات ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ ہوں، ان کی زندگی مذہبی الفاظ میں رحمت الٰہی' کا نمونہ ہے اور جب لوگوں پر 'رحمت الٰہی' ہے ان کے قلب پاک اور مصفّٰی ہیں۔ کیر کے گارڈ نے اپنی کتاب کا عنوان 'خواہش اور ارادے کی ہم آہنگی پاکیِ قلب ہے' رکھا ہے اور اس کی بنیاد بائبل کے اس ارشاد پر ہے 'اے دو غلے انسانو! اپنے دل کو پاک کرو'۔

شاید کچھ لوگ اخلاقیات کے اس داخلی تصور سے خائف ہوں کیونکہ اس کی بنیاد ایک اندرونی آزادی پر ہے جو انسان کو خود اپنے اعمال کا ذمے دار بناتی ہے۔ وہ شاید ان خارجی اصولوں 'دائمی قدروں' سخت گیر قدیم اخلاقی نقطۂ نظر کی تمنا کریں کیونکہ یہ ہمیں 'آزاد فیصلوں کے پریشان کن بارگراں' سے نجات دلا سکتے ہیں اور یہ تمنا شاید انھیں یہ کہنے پر اکسائے کہ آپ کے اندرونی مقاصد اور ذاتی فیصلوں والی اخلاقیات بے راہ روی کا جواز ہے کیونکہ اس کے مطابق ہر شخص اپنی من مانی کرسکتا ہے لیکن اس قسم کی دلیلیں ہمیں 'آزادی' کے مسائل سے آزاد نہیں کرسکتیں کیونکہ جو چیز ایک شخص کے لیے 'اچھی' اور ایماندارانہ ہے وہ اس کے بالکل برعکس نہیں ہوسکتی جو دوسروں کے لیے 'اچھی' اور ایماندارانہ ہے۔ ڈاکٹر ٹلس نے اس سلسلے میں یہ کہا ہے کہ ''اگر تم ان اصولوں کو دریافت کرنا چاہتے ہو جن کی بنیاد پر کائنات کی تخلیق ہوئی ہے تو انھیں انسان کی ذات میں تلاش کرو' اور اس تصویر کا دوسرا رخ بھی درست ہے وہ یہ کہ وہ جو سچائی انسانی تجربے میں منعکس ہے وہ بڑی حد تک ایک کائناتی حقیقت کا عکس ہے۔''

یہ بات فن کی دنیا میں زیادہ نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اگر ایک تصویر میں خلوص اور ایمانداری نہ ہو یعنی وہ فنکار کے گہرے، ذاتی اور منفرد تجربات مشاہدات اور تاثرات پر مبنی نہ ہو تو اس کے حسین ہونے کا بھی امکان نہیں، لیکن اگر وہ اس معنی میں پرخلوص ہے تو اس میں حسن کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور موجود ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچوں کا فن جہاں تک کہ وہ ان کے سیدھے سادے پرخلوص تجربات اور جذبات کا آئینہ دار ہے، ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔ آزادی اور بے ساختگی معمولی خطوط میں بھی لطافت اور آہنگ پیدا کردیتی ہے۔ سر، تال اور توازن جو کائنات کے بنیادی اصول ہیں اور جن کی کارفرمائی ستاروں کی گردش سے لے کر ایٹمی ذرات کی حرکات وسکنات تک ہر چیز میں دیکھی جاتی ہے، حسن کے بنیادی عناصر ہیں اور انسانی جسم اور شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کا حسن بھی انھیں اصولوں کا مرہون منت ہے لیکن جیسے ہی بچہ بے ساختگی سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے دوسروں کی نقل کرنا شروع کرتا ہے یا تعریف وستائش کی خاطر تصویریں بناتا ہے۔ ان تصاویر کے خطوط کرخت ہوجاتے ہیں اور ان کا حسن اور لطافت غائب ہوجاتی ہے۔

'داخلی تنویر' کی مذہبی روایت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے نقطۂ آغاز خود اس کی ذات ہے جیسا کہ مائسٹر ایکہارت نے کہا تھا ''جس شخص نے خود کو نہیں پہچانا وہ خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ روح انسانی عظیم بلندیوں کا گہوارہ ہے اس کی طرف رجوع کرو' اس حقیقت کو سقراط سے منسلک کرتے ہوئے کیر کے گارڈ نے لکھا ہے ''سقراط کے خیال کے مطابق انسان کی ذات ہی اس کا مرکز ہے کیونکہ تمام کائنات اسی ذات پر مرکوز ہے اور عرفان ذات ہی عرفان الٰہی ہے۔'' اخلاقیات کی بحث یہاں ختم نہیں ہوتی لیکن اگر ہم اسے اس مقام سے شروع نہ کریں تو کسی منزل تک پہنچنا بھی ممکن نہیں۔

■

ماخذ: انسان اپنی تلاش میں، **مصنف:** رولو مے، **مترجم:** زاہدہ زیدی، دوسری طباعت: اگست 2009، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شریف الحسن نقوی

انسان بحیثیت سماجی حیوان

پرانے زمانے میں آدمی غاروں میں رہتا تھا، لیکن آج وہ خلا کو بھی مسخر کر چکا ہے۔ آدمی کی ترقی کی یہ کہانی نہایت دل چسپ ہے۔ اس کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انسان کا بچہ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں بہت کمزور اور لاچار ہوتا ہے اور اس کے پلنے، بڑھنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی عمر تک پہنچنے میں اچھا خاصا عرصہ لگتا ہے۔ وہ ایک کنبے میں پیدا ہوتا ہے اور کنبے ہی میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ عمر کے ابتدائی ایام میں والدین ہی اس کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، اس کی تربیت کرتے ہیں، اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں کامیاب ہو سکے مثلاً وہ بالغ ہو کر اپنی اور اپنے کنبے کی پرورش کے لیے روزی پیدا کر سکے۔ قدیم سماج میں بچوں کی پرورش کی تمام تر ذمے داری والدین پر ہوتی تھی، لیکن دورِ حاضر کے ترقی یافتہ سماج میں مختلف دوسری ایجنسیاں بھی ہوتی ہیں جو بچوں کی تربیت اور ان کو اپنے مستقبل کے لیے تیار کرنے کی ذمے داری لیتی ہیں۔ یہ ایجنسیاں آہستہ آہستہ زمانے کے ساتھ عالم وجود میں آئیں۔ جیسے جیسے رہنے سہنے کے طریقے پیچیدہ ہوتے گئے ویسے ویسے ایجنسیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان ایجنسیوں کا مطالعہ انسان کی زندگی اور انسان کی کہانی کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انسان کیونکہ سماجی حیوان ہے اس کا اندازہ ان ایجنسیوں کے مطالعے سے ہوگا۔

خاندان: جس خاندانی زندگی کا تصور جدید میں ہے، وہ انسانی سماج کی ارتقا کے اوائل میں نہ تھا۔ قدیم سماج میں بچے کا تمام تر تعلق قبیلے یا کنبے سے ہوا کرتا تھا۔ اور وہ اس کا سرمایہ متصور ہوتا تھا، خاندان کے تمام بالغان بچے کی پرورش کی کچھ نہ کچھ ذمے داری نبھاتے تھے۔

فطری طور پر بچے کا لگاؤ ماں سے ہوتا تھا، اس سے وہ پیار بھی زیادہ کرتا تھا۔ باپ تو روزی کی تلاش میں شکار گاہ وغیرہ میں چلا جاتا تھا، لیکن ماں بچے کی پرورش کی ذمے داری پوری کرتی تھی۔ وہ بچے کے لیے لازمی اور مرکزی حیثیت رکھتی تھی، سماج بھی بچوں کی زندگی کے لیے ماں کا وجود بہت اہم سمجھتا تھا۔ اس طرح ماں کی حیثیت کنبے میں مرکزی اور ضروری تھی۔ آہستہ آہستہ ماں کی انفرادیت ابھری اور اس کو خاندان کا سربراہ تصور کیا جانے لگا۔ اس طرح کا خاندان 'مادر سری' کے نام سے مشہور ہوا۔ قدیم سماج میں زیادہ تر 'مادر سری' خاندان ہوا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے زندگی میں ٹھہراؤ آتا گیا اخلاقی قدروں میں حسن پیدا ہوا اور احساسات میں عمدگی پیدا ہوئی۔ رسمی شادی کا رواج ہوا۔ باپ کا مقام اہم ہو گیا اور خاندان کی نوعیت میں حیرت انگیز تبدیلی بھی ہوئی۔ اس تبدیلی سے بچوں کی پرورش کی ذمے داری کی تقسیم ہوئی۔ والدین کے اہم کردار کا اندازہ ہوا۔ باپ کے اہم کردار اور اس کی نمایاں حیثیت کی وجہ سے خاندان 'پدر سری' ہو گئے۔ خاندان کے سب لوگ اس کی خواہش کے مطابق اس کے حکم کی بجا آوری کرتے، اس میں کوئی چوں و چرا نہ کرتا۔ عورتیں نہ صرف بچوں کی پرورش کرتیں بلکہ کھیتوں اور کھلیانوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں۔ اس طرح 'خاندان' جو فطری طور پر عالم وجود میں آیا تھا، اب وہ سماج کا سب سے چھوٹا یونٹ ہو گیا۔ اس سے خاندان کے تمام ارکان کو پرورش کا

قدیم سماج میں زیادہ تر 'مادر سری' خاندان ہوا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے زندگی میں ٹھہراؤ آتا گیا اخلاقی قدروں میں حسن پیدا ہوا اور احساسات میں عمدگی پیدا ہوئی۔ رسمی شادی کا رواج ہوا۔ باپ کا مقام اہم ہو گیا اور خاندان کی نوعیت میں حیرت انگیز تبدیلی بھی ہوئی۔

> 'مادری سری' خاندان میں بچے ماں کے احکام کے پابند ہوتے تھے، اس کی عزت کرتے تھے، اسی کو قابل احترام تصور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں کے نام ماں کے نام کے مطابق ہوتے تھے۔ لڑکیاں وراثت کا حق رکھتی تھیں، لڑکوں کو اس حق سے محروم رہنا پڑتا تھا۔

موقع ملتا تھا، اس کو ہر طرح کا تحفظ میسر ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ بچے کا بنیادی تعلق اپنے خاندان سے ہوتا ہے۔ اس کے ہر رکن سے اس کا تعلق ہوتا ہے وہ اپنے خاندان میں بولنا سیکھتا ہے۔ خاندان کے دوسرے ارکان کے اطوار و افعال کی نقل کرتا ہے۔ یہ باتیں اس کی زندگی میں بہت اہم ہیں، اس کی زندگی میں اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ اظہارِ خیالات کے مختلف انداز سیکھتا ہے اور مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔

خاندان کی بدلتی ہوئی شکل

'مادری سری' خاندان میں بچے ماں کے احکام کے پابند ہوتے تھے، اس کی عزت کرتے تھے، اسی کو قابل احترام تصور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں کے نام ماں کے نام کے مطابق ہوتے تھے۔ لڑکیاں وراثت کا حق رکھتی تھیں، لڑکوں کو اس حق سے محروم رہنا پڑتا تھا۔

جیسے جیسے سماج میں ٹھہراؤ پیدا ہوا، لوگوں نے کھیتی باڑی کو اپنا پیشہ بنایا اور خاندان بڑا ہوتا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خاندان کا کوئی فرد جو بھی کھیت میں پیدا کرتا یا کماتا وہ تمام افراد خاندان کے گزر اوقات کے لیے ہوتا۔ یعنی ایک فرد خاندان کے دیگر افراد کی کفالت کا ذمے دار ہوتا تھا۔ اس طرح سے متحدہ خاندان یا ملے جلے خاندان کا رواج عالم وجود میں آیا۔

اس طرح کے خاندان آج بھی بہت سے سماجوں میں موجود ہیں، خاص طور پر ایسے خاندان کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں، جیسے جیسے صنعتی ترقی ہوئی، خاندانوں کی شکلوں میں اور بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لڑکوں کو جب کسی دوسری جگہ پر ملازمت ملی تو انھیں اپنے خاندان سے علاحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح انھوں نے اپنے اپنے الگ الگ خاندان بنا لیے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ خاندان چھوٹے ہوتے گئے۔ دوسرے الفاظ میں متحدہ خاندان کا رواج شہری زندگی کے اثرات سے ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا خاندان رواج میں آ رہا ہے۔

خاندان کے کام

خاندان چاہے چھوٹا ہو یا بڑا وہ بچوں کی پرورش کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہے اور اس وقت تک کرتا ہے جب تک بچہ سن بلوغ کو نہ پہنچ جائے۔ ان کاموں کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

1. جو افراد خاندان میں رہتے ہیں ان کی جسمانی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ وہ باہمی خوشی اور آرام کے لیے مل جل کر رہتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ نسل کو بڑھانے اور آبادی میں اضافہ کرنے کی انسانی خواہشات بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح خاندان نہ صرف نسل کی تحفظ کا ضامن ہے بلکہ کنبے کی مکمل نگرانی کرتا ہے۔

2. خاندان ہر فرد کی معاشی ضروریات کو پوری کرتا ہے۔ اس میں تقسیم کار ہوتا ہے اور ہر فرد سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ خاندان کے جملہ کاموں میں ہاتھ بٹائے۔ خاندان کا سرغنہ خاندان کا نظم و نسق اس صورت سے رکھتا ہے کہ تمام افراد کی ضروریات اس کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ جذباتی رشتے اس طرح استوار ہو جاتے ہیں اور خاندان کو ایک رشتے میں متحد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ خاندان کمسن افراد کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے اور اس طرح خاندان کا ہنر نسلاً بعد نسل چلتا رہتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خاندان کے تمام افراد کی کوشش اور تعاون سے خاندان کے پاس کچھ پونجی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ اس پونجی سے خاندان کے کام کو بڑھانے اور ترقی دینے میں مدد ملتی ہے۔ اس سے خاندان میں جو افراد کمزور یا کسی قسم کی کمی کا شکار ہوتے ہیں ان کو بھی مدد مل جاتی ہے۔ کمزوروں اور لاچاروں کی دیکھ بھال بھی خاندان ہی میں ہو سکتی ہے۔

3. کسی بھی خاندان کے کچھ نسلی اصول اور قدریں ہوتی ہیں۔ یہ اصول اور قدریں بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ اس سے نہ صرف بچوں کی انفرادیت اور شخصیت کی نشوونما میں مدد ملتی ہے بلکہ ان کے خاندان کی تہذیب، اخلاقیات اور تمدن میں جو بھی خوبیاں ہوتی ہیں وہ آنے والی نسل کے پرامن اور ہم آہنگ ماحول میں اثباتی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

4. خاندان بچوں کو سماجی حیثیت دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ افراد خاندان کے آپسی سلوک اور برتاؤ سے سماج کی اعلیٰ خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے اور بچے کے اندر سماجی قدروں کا احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے اندر فرائض اور حقوق کا احساس بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی فرد اس کو بتانے یا سمجھانے کے لیے خصوصی توجہ نہیں دیتا۔ ایک بچہ خاندان ہی میں رہ کر محبت، قربانی، آپس میں ایک دوسرے سے

ہمدردی اور وفاداری کے جذبات سے ہمکنار ہوسکتا ہے یعنی یہ جذبات خاندان کے اندر ہی بیدار اور اجاگر ہوتے ہیں۔ ایک شہری کے کردار کی تعمیر کے لیے یہ خوبیاں نہایت ضروری ہیں۔ میزنی کا قول ہے ''شہریت کا پہلا سبق بچہ ماں کے بوسوں اور باپ کے دلار میں سیکھتا ہے'' ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گھر شہری خوبیوں کا گہوارہ ہے۔

خاندان کے رکن کی حیثیت سے فرد کا رول

موجودہ سماج میں فرد کے کردار و اعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ صنعتی وسعت اور ترقی نے سماجی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کردی ہے۔ گاؤں کے باشندے

صنعت یا کارخانوں میں کام کرنے کے لیے دوسری بستیوں اور شہروں میں رہنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ شہری خاندان ایک اکائی والا خاندان ہوگیا ہے۔ تعلیم کے رواج پکڑنے کے ساتھ ساتھ خاندان مختصر سے مختصر تر ہوتا جاتا ہے لیکن ان افراد میں خوف و ہراس کا احساس رہتا ہے۔ ان کا معاشی تحفظ نہیں ہوتا، بے روزگاری کی وجہ سے چھٹنی ہوتی رہتی ہے۔ خاندان کے اکثر ممبر زیادہ سے زیادہ آزادی چاہتے ہیں۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے خاندان کے لیے جو جذبۂ وفاداری تھا، اس میں دور حاضر میں نمایاں کمی پیدا ہوگئی ہے۔ طلاق کے سلسلے میں قانون بن جانے کے بعد خاندان میں انتشار پیدا ہوا اور اس انتشار سے چھوٹے بچوں پر بہت برا اثر پڑا وہ مجبور و لاچار ہوگئے۔ گندی بستیوں میں رہنے والوں کی حالت نہایت خراب ہے۔ ان کے اخلاق اور طریقہ زندگی میں بھی پستی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ خاندان کے اخراجات کی کفالت کے لیے کچھ افراد سماجی جرائم کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، اسمگلنگ اور عوام کے سرمائے کا غلط استعمال وغیرہ ایسے سماجی جرائم ہیں جن کے اکثر لوگ مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا پورا پورا خیال رکھنا ہے کہ خاندان کی ضروریات اور اس کی محبت اور احساس ذمے داری کا شکار ہوکر سماج کے عظیم مقصد سے روگردانی نہ کریں۔ ہر فرد کو سماج کے عظیم فوائد کے لیے اپنے فوائد کو ترک کرنا چاہیے۔

خاندان اسی وقت سماج میں اپنا صحیح رول ادا کرسکتا ہے جب اس کی آمدنی اتنی وافر ہو کہ خاندان کی تمام ضروریات بہ آسانی پوری ہوسکیں۔ خاندان کے ماحول کو بچوں کی پرورش اور تربیت کے لیے بھی سازگار ہونا چاہیے۔ ایسے خاندان میں والدین اپنے بچوں کی صحیح پرورش کرسکتے ہیں اور ان کے عادات و اخلاق کو بہتر بناسکتے ہیں۔ ان کے اندر آپسی لین دین کا جذبہ اجاگر کرسکتے ہیں، ان میں قوتِ برداشت پیدا کرسکتے ہیں اور باہمی تعاون کا جذبہ پیدا کرسکتے ہیں۔ مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ خاندان میں رہ کر افراد اپنے ذاتی فوائد کو دوسرے افراد کے فائدے کے لیے قربان کرنا سیکھتے ہیں۔ اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر، دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا سیکھتے ہیں۔ خاندان کے ممبر آپس میں ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں، پھر محلے کے خاندانوں میں تعلقات وسیع تر ہوجاتے ہیں۔ جب بہت سے خاندان ایک دوسرے کی ضروریات کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور ان کے افراد تمام خاندانوں کی فلاح و بہبود کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کرتے ہیں تو سماج عالم وجود میں آتا ہے۔

سماج

ہم نے سیکھا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اور وہ الگ یا تنہا نہیں رہ سکتا۔ انسان خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور سماج میں رہتا ہے۔ خاندان سماج کا بنیادی حصہ ہے۔ 'سماج' کا وجود کب ہوا؟ یہ سوال مشکل ہے اور اس کا صحیح جواب دینا بھی مشکل ہے۔ ہاں، اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انسان کبھی تنہا نہیں رہا۔ اس طرح زمانہ قدیم سے انسان کسی نہ کسی طرح کے سماج میں رہا ہوگا۔ کسی نہ کسی طرح کے 'سماج' کا وجود ابتدائے آفرینش سے ہوا ہوگا۔ زیادہ مناسب سوال یہ ہے کہ سماج کی ارتقا کیسے ہوئی اور اس نے کس طرح ترقی کی؟ متعدد مفکرین کا خیال ہے کہ سماج اور اس کے ملحقہ ادارے خدا کی تخلیق ہیں۔ یہ اصول کسی منطق یا تاریخی حقائق پر مبنی نہیں معلوم ہوتے ہابس، لاک اور روسو جیسے مفکرین کا خیال ہے کہ سماج کے عالم وجود میں آنے سے قبل انسان فطری ماحول میں زندگی بسر کرتا تھا۔ بعدہ ایک معاہدے کے نتیجے کے طور پر سماج عالم وجود میں آیا۔ اس بات کو بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ آبادی بڑھنے کے بعد آپسی جھگڑے لڑائی کی وجہ سے رہنا مشکل ہوگیا ہوگا۔ ان ناقابل برداشت حالات سے بچنے کے لیے عوام نے آپس میں عہد و پیمان کیے ہوں گے۔ کچھ ایسے بھی

انسان شکاری تھا اور شکار کر کے اپنی گزر اوقات کرتا تھا، کچھ زمانے بعد اس نے جانور پالنے شروع کردیے۔ جب اس نے شکار کے زمانے سے نکل کر جانوروں کی پرورش کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی تو خاندان میں سرمائے اور ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔

مفکرین ہیں جن کا خیال ہے کہ سماج آہستہ آہستہ بتدریج ترقی پزیر ہوتا گیا۔ انسان شکاری تھا اور شکار کر کے اپنی گزر اوقات کرتا تھا، کچھ زمانے بعد اس نے جانور پالنے شروع کردیے۔ جب اس نے شکار کے زمانے سے نکل کر جانوروں کی پرورش کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی تو خاندان میں سرمائے اور ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ یعنی خاندان چیزوں کا مالک ہونے لگا۔ جب کھیتی باڑی شروع کی تو انسان نے گروہ بنا کر کھیتوں کے کنارے رہنا شروع کیا۔ اس طرح ایک نئی سماجی تنظیم کا آغاز ہوا، اسی کو ہم سماج کہتے ہیں۔ اس کے نئے قانون، قدریں اور رسم و رواج تھے۔ کھیتی کی

ترقی اور نئے نئے تجارتی ذرائع کے عالم وجود میں آنے کی وجہ سے سماج کی شکل میں تبدیلی ہوئی۔ صنعت کی ارتقا نے سماج کو نیا موڑ دیا، جب عوام گاؤں سے نکل کر صنعتی قصبوں اور شہروں میں گئے تو کچھ اور نئے مسائل پیدا ہوئے ان کی نوعیت سماجی تھی، جیسے جیسے صنعت زیادہ ترقی کرتی گئی، یہ مسائل پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ اب ایک نیا سماج اور اس کا نیا نظام عالم وجود میں آرہا ہے اور یہ ریاستی حدود سے تجاوز کررہا ہے۔

اس طرح شکاری زمانے سے صنعتی سماج قطعی مختلف ہے۔ آج افراد مختلف انجمنوں کے ارکان ہیں۔ ان انجمنوں کی تشکیل متعدد اور مختلف اغراض و مقاصد کی بنا پر ہوتی ہے۔

سماج میں انسان کی حیثیت

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی اور وجود سماج میں رہ کر ہی ممکن ہے۔ سماج کی تعمیر اس کے متعدد افراد کے باہمی تعاون سے ہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بچے کی بالیدگی کا مدار بھی سماج پر ہی ہے۔ جب وہ بڑھتا ہے تو اس کی تمام تر ضروریات کی تکمیل محض خاندان ہی میں ممکن نہیں۔ ان ضروریات کے لیے وہ سماج کا بھی رہین منت ہوتا ہے۔ انسان نے فطرت پر باہمی تعاون سے قابو پالیا ہے جو کام ایک نسل کے لوگ کرتے ہیں وہ سماج کی قدروں کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں، اور ان کے محاصل ہوتے ہیں، یہ قدریں اور محاصل دوسری نسل کو ملتے ہیں اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسری نسل کے افراد ان محاصل اور قدروں کا تحفظ کرتے ہیں اور ان میں اضافے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح محاصل اور قدروں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور سماج کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اب مختلف ممالک کے افراد وارکان کے مابین تعلیمی رشتے قائم ہوگئے ہیں۔ ایک دوسرے کے درمیان سیکھنے سکھانے کا سلسلہ جاری ہوا ہے، اس سے علم کی ترقی ہوئی ہے اور مختلف ممالک کے عوام کے علوم میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح دیکھنے میں آتا ہے کہ سماج کے افراد بڑے پیمانے پر ایک دوسرے سے تعلقات اور معاہدے کے ذریعے مستفیض ہورہے ہیں۔ جب فرد اپنے سماج کی کوششوں کے ثمرے سے فائدہ حاصل کرتا ہے تو اس کا بھی فرض ہوجاتا ہے کہ وہ سماج کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہو۔ اس کا اہم

> اب مختلف ممالک کے افراد وارکان کے مابین تعلیمی رشتے قائم ہوگئے ہیں۔ ایک دوسرے کے درمیان سیکھنے سکھانے کا سلسلہ جاری ہوا ہے، اس سے علم کی ترقی ہوئی ہے اور مختلف ممالک کے عوام کے علوم میں اضافہ ہوا ہے۔

فریضہ یہ ہے کہ دوسرے افراد سے تعاون کرے، سماج کے لیے کام کرے۔ اپنے بزرگوں اور اسلاف کے محاصل اور قدروں کا تحفظ کرے۔ اس کو کسی حال میں تباہ نہ ہونے دے، ممکن ہے کچھ لوگ سماج کو بے بنیاد سمجھیں۔ لیکن وہ اس بات سے مطمئن ہوسکتے ہیں کہ سماج کے متعدد ارکان کے مابین معاہدے اور تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ انجمنوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں، ارکان ان رشتوں کو بہت مضبوط سمجھتے ہیں اور انھیں مکمل تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

ان انجمنوں کے متعدد اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ کچھ عارضی اور کچھ مستقل، اپنے کاموں کے انجام دینے کے لیے ان کے کچھ اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ انجمنوں کی رکنیت رضا کارانہ ہوتی ہے اس میں ارکان کا اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ جن بنیادوں، اغراض و مقاصد کے لیے انجمن کی تشکیل ہوتی ہے اس کو پورا کرنے، ترقی دینے اور اونچا اٹھانے کے لیے اس کے ارکان جدوجہد کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انجمن کا کوئی رکن اتنا کمزور ہو کہ وہ اپنی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کام نہ کرسکتا ہو لیکن اس سے انجمن کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ بہرحال کامیاب ہوتی ہے کیونکہ اس کے دوسرے ارکان بھرپور کوشش کرتے ہیں اور ان کی جدوجہد سے انجمن کو فیض پہنچتا ہے۔ اس کے متعدد ارکان کی قوت، ادراک، فہم اور مقصد کی یکسانیت اس کی کامیابی کا باعث ہوتے ہیں۔ اہل اور قابل ارکان کے مقابلے میں کمزوروں کو زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ نفع کی تقسیم برابر ہوتی ہے۔ انجمن کے اغراض و مقاصد کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، نفع کی طرف کم

اس لیے ارکان میں قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان میں شائستگی اور توازن بھی پیدا ہوتا ہے انجمن کسی بھی رکن کو حتی الامکان مدد دیتی ہے۔ ایک رکن انجمن کے دوسرے ارکان سے تعاون کرنا سیکھتا ہے اور جو بھی توقعات اس سے وابستہ ہوتی ہیں وہ ان کو انجام دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی فرد متعدد انجمنوں کا رکن ہوتا ہے۔ کہیں وہ لیڈر ہوتا ہے اور کہیں تقلید کرنے والا رکن ہوتا ہے۔ ان حالات میں وہ دوسروں کی خواہش کا احترام کرنا سیکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے حکم کی دوسروں سے پابندی کروائے، اس کو دوسروں کے نظریات کا احترام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر قوت برداشت بھی ہوتی ہے۔ وہ اس بات کی امید نہیں کرسکتا کہ دوسرے اس کے نظریات و خیالات کی موافقت کریں۔ وہ اپنے نظریات و خیالات کے لیے دلائل پیش کرتا ہے۔ دوسروں کے اندر اعتماد اور یقین پیدا کرتا ہے اور اپنا ہمنوا اور موافق بناتا ہے۔ دوسروں کی بات ماننا، ان پر اعتماد کرنا، اور ان کے خیال سے اتفاق کرنا سیکھتا ہے۔ مختلف انجمنوں کی رکنیت سے وہ اپنے اغراض و مقاصد کے لیے پرخلوص طریقے اور وفاداری سے کام کرنا سیکھتا ہے۔ کبھی کبھی متعدد ذمے داریوں اور وفاداری میں ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ رکن ہونے کی حیثیت سے وہ یہ سیکھتا ہے کہ ان ذمے داریوں اور وفاداریوں میں سے کسے پہلے انجام دے یعنی اس میں قوت انتخاب اجاگر ہوتی ہے۔ اس کے اندر قوتِ فیصلہ پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی وفاداری ریاست کے حق میں سب سے اہم اور لازمی ہے کیونکہ ریاست تمام چیزوں کا مخرج اور مخزن ہے۔

ہم نے سیکھا:

1. اپنی حفاظت کے لیے اور باہمی امداد کے لیے انسان کی اجتماعی اور منظم حیثیت نہایت ضروری ہے۔
2. اجتماعی زندگی انسان کو متمول اور غنی بناتی ہے۔
3. انسانی زندگی اور وجود کو کامیاب بنانے کے لیے فرد اور سماج مل کر کام کرتے ہیں۔ چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا طبقاتی۔

■

ماخذ: ابتدائی علم شہریت: شریف الحسن نقوی، ایس این چٹوپادھیائے، **دوسرا ایڈیشن:** اگست 2002، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شکیل احمد

ناقص تغذیے کے اثرات

انسان کی خوراک میں غذا کے تمام اجزا مناسب مقدار میں شامل ہونا چاہیے۔ اس سے انسان تندرست اور بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ غذا کی کمی خواہ مقدار کے اعتبار سے ہو یا قسم کے اعتبار سے مضر ہے۔ اسی طرح زیادہ کھانے سے بھی بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ناقص تغذیہ کا بڑی عمر کے لوگوں کے مقابلے میں بچوں اور خصوصاً شیر خوار بچوں پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ایسی خوراک کو جس میں سبھی ضروری غذائی اجزا کی مقررہ مقدار موجودہ ہو، متوازن خوراک (Balanced Diet) کہتے ہیں لیکن یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ دنیا کے زیادہ تر لوگ متوازن غذا سے محروم ہیں۔ انسان کے مختلف کاموں کو صحیح طور پر انجام دینے کے لیے توانائی کی ضروری مقدار متوازن غذا سے دستیاب ہوتی ہے۔ غذائی اجزا کے کسی ایک جزو کی مقدار میں کمی بھی، خرابی صحت کا باعث بن سکتی ہے۔

غذا کی مقدار میں کمی سے قلت تغذیہ اور عدم تغذیہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت عام طور پر ہنگامی حالات قحط سالی وغیرہ میں ہوتی ہے۔ افراد کو یہ صورت نظام ہضم کے نقص سے جب کہ وہ غذا کو قبول کرنے اور جذب کرکے جزو بدن بنانے کے لائق نہیں ہوتے پیش آتی ہے جگر اور گردوں کے متعدی امراض میں لوگ بھی اس سے دوچار ہوسکتے ہیں۔

نقص غذا کے مندرجہ ذیل پانچ وجوہ ہوسکتے ہیں:

1 غذا کی مقدار کی کمی: اس سے قلت تغذیہ اور بعد میں بھکمری ہوتی ہے۔

2 قسم غذا کا نقص: اس کی وجہ غذا میں کسی ایک ضروری جزو کی کمی ہے۔ اس سے سوءِ تغذیہ ہوتا ہے اور سوکھے اور استقر بوط جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

3 غذا کی مقدار کی زیادتی: ضرورت سے زیادہ خوراک نقصان دہ ہے اس سے بدہضمی، فربہی (موٹاپا) جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

4 کسی تغذیہ کی زیادتی: اس میں خوراک میں غذا کا کوئی ایک جزو زیادہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً چکنائی یا وٹامن ڈی جیسے اجزا کی مقررہ مقدار سے زیادتی نقصان دہ ہے۔

5 غذا میں موجود عفونتی زہر (ٹاکسن Toxin): کچھ غذاؤں میں قدرتی طور پر تھوڑی مقدار میں ٹاکسن موجود ہوتا ہے۔ اس قسم کے زیادہ استعمال سے نقصان کے امکانات ہوتے ہیں۔ ٹاکسن سے جلبلائیت (Lathtrism) پیدا ہوتی ہے۔ یہ ٹاکسن ضعیف مقدار میں انڈے کی سفیدی، کھیسری دال اور بتھو، پالک وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

غذا کی بے نظمی کے سماجی اور معاشی وجوہ

پس ماندہ ممالک میں نقص غذا عام ہے، لیکن ان ممالک میں بھی جہاں غلہ اور خوراک کافی مقدار میں موجود ہے، غربت، تعصب، ناواقفیت اور غلط طریقے سے غذا کو رکھنے کی وجہ سے غذا کی بے نظمی پائی جاتی ہے۔

غذائی بے نظمی کے مرضیاتی (Pathological) وجوہ:

کافی آمدنی، مناسب رہائش اور غذا اور پرہیز کے بارے میں معلومات رکھنے کے باوجود کسی بیماری کی وجہ سے بھی آدمی کے اندر غذا کی بے نظمی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ مندرذیل طریقوں سے ہوتی ہے:

1 **غذا کا نامناسب استعمال:** (الف) بھوک کا کم ہوجانا معدہ کے کینسر اور بے اشتہائی اعصابی امراض وغیرہ میں یہ کیفیت ہوتی ہے۔ (ب) الکوہل جس میں کیلاری تو ہوتی ہے لیکن ضروری غذائیت نہیں ہوتی۔ اس کے کثرت استعمال سے پرانے شرابی ناقص تغذیہ سے زیادہ سوءِ تغذیہ کا شکار ہوتے ہیں۔ (ج) غیر متوازن پرہیزی غذاؤں کا استعمال مثلاً ہاضمے کی خرابی میں دی گئی پرہیزی غذاؤں میں اسکوربک ایسڈ نہیں ہوتا۔ اگر ہم اس کو الگ سے استعمال نہ کریں تو اس کی کمی ہوجائے گی۔ (د) عرصہ تک غیراوما (Parenteral) تغذیہ جیسا کہ عمل جراحی کے دوران نسوں میں گلوکوز چڑھا کر کیا جاتا ہے۔ اس عمل سے جسم میں وٹامن بی کمپلکس کی کمی ہوجاتی ہے۔

2 غذا کے ہاضمے اور استحالے کی خرابی: (الف) سبز (کوری) سے خون میں لوہے کی کمی ہوتی ہے۔ (ب) اسہال شحمی میں چربی میں حل ہونے والے وٹامن اور استحالہ ٹھیک نہیں ہو پاتا۔ (ج) بھوکے اور بیمار لوگوں کو

نامناسب غذا دینے سے آنتوں کی حرکت کے بڑھ جانے سے نقصان کے امکانات ہوتے ہیں (د) جراثیم کش ادویات (Antibiotics) کا اثر عرصے تک جراثیم کش ادویات کے استعمال سے آنتوں کے بیکٹیریا متاثر ہوتے ہیں جس سے ان بیکٹیریا کے ذریعے تیار ہوئے وٹامن جسم کو نہیں مل پاتے۔

3 **بیماری میں غذا ناقص استعمال:** (الف) جگر کی بیماری (Cirrhosis) میں خصوصاً پروٹین اور وٹامن کے استعمال میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ (ب) گردے کی خرابی میں وٹامن ڈی متحول مادہ میں تبدیل نہیں ہوتا۔

4 **تغذیہ کا جسم سے اخراج:** (الف) انحطاط گردہ کے مرض میں پروٹین پیشاب میں نکل کر ضائع ہوجاتی ہے (ذ) مرض ذیابطیس شکری میں کاربوہائیڈریٹ کا استحالہ ٹھیک نہیں ہوتا اور شکر پیشاب میں آنے لگتی ہے جس سے سوءِ تغذیہ کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ (ج) عورتوں میں ماہواری خون کی زیادتی (جریانِ حیض) سے خون میں لوہے کی کمی ہوجاتی ہے۔ (د) شدید اور پرانے اسہال میں پوٹاسیم ضائع ہوجاتا ہے۔

زیادہ غذائیت کی ضرورت کی حالتیں

کچھ حالتوں میں عام حالات کے مقابلے زیادہ غذائیت کی ضرورت ہوتی ہے:

(الف) عورتوں کو دوران حمل اور دورانِ رضاعت، نوعمر افراد کو نشو ونما کی غرض سے اور مریضوں کو بیماری سے فراغت کے بعد مزید غذا درکار ہوتی ہے اسی طرح سخت جسمانی محنت کرنے والے لوگوں کو اور سرد ممالک کے رہنے والوں کو گرم ملک کے رہنے والوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ غذائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ب) بخارا ور غدۂ درقیہ کی ریزش کی زیادتی (Hyperthyroidish) کے دوران کیلاری کی ضرورت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(ج) جلنے، ہڈی ٹوٹنے اور عمل جراحی کے بعد جسم کو پروٹین اور اس کو ریک ایسڈ کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

جسم میں غذا کی بے نظمی عموماً مندرجہ بالا وجوہ سے ہوتی ہے، لیکن اکثر اصل وجہ خوراک میں ایک یا زیادہ تغذیہ کی کمی ہوتی ہے۔ غذا میں صرف حیاتین کی کمی کو ذہن میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ تمام باتوں کا مطالعہ کر کے غذا تجویز کرنی چاہیے۔

پروٹین اور کیلاری کی کمی سے سوءِ تغذیہ

ہمارے ملک میں سوءِ تغذیہ سے بچے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس میں غذا میں پروٹین اور کیلاری کی کمی سے پیدا ہونے والے امراض بہت اہم ہیں۔ پروٹین اور کیلاری کی کمی کی وجہ سے غریب طبقے میں بچوں کی بیماری اور موت عام ہے۔ اوائل عمری میں سوءِ تغذیہ کا اثر بچے کی آئندہ کی زندگی اور نشو ونما پر بہت برا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی بلکہ دماغی اور ذہنی نشو ونما بھی متاثر ہوتی ہے۔ پروٹین کی کمی کا اثر ایک سال کی عمر سے پانچ سال کی عمر کے درمیان بہت پڑتا ہے۔ ایک سال تک چونکہ بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے اس کو مناسب پروٹین ماں کے دودھ سے حاصل ہوجاتی ہے لیکن اپنے ملک کے غریب طبقے میں جہاں ماں کو مناسب غذا اور پروٹین حاصل نہیں ہو پاتی اس کا دودھ بچے کے لیے نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے نامکمل ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس میں وٹامن کی مقدار بھی کم ہوجاتی ہے۔ بچے کے لیے ماں کا دودھ گو کہ موزوں ترین غذا ہوتی ہے لیکن چھ ماہ کے بعد بچے کی صحیح نشو ونما کے لیے اوپر سے دیگر غذائیں دینا ضروری ہوتا ہے۔ غذا میں پروٹین کی کمی سے بچوں کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ دست آنے لگتے ہیں۔ سر کے بالوں کا رنگ ہلکا ہوجاتا ہے اور وہ گرنے لگتے ہیں۔ کھال کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور کھال ادھڑنے لگتی ہے، جس سے جگہ جگہ سفید سے نشانات پڑجاتے ہیں۔ بدن میں خون کی کمی ہوجاتی ہے۔ جسم پھول جاتا ہے۔ استقاء لحمی (Edema) اور خصوصاً ہاتھوں اور پیروں میں ورم ہوجاتا ہے۔ بے حسی، مردہ دلی اور کند دماغی (Apathy) پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب بچوں میں یہ باتیں ایک ساتھ پیدا ہوں لیکن یہ علامات عام ہیں۔ کبھی کبھی لاغری اور سوکھے کا مرض ہوجاتا ہے، جس سے نشو ونما رکنے کے ساتھ ہی جسم کے عضلات گھلنا شروع ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ بچوں میں سوءِ تغذیہ کی وجہ غذا میں پروٹین کی کمی ہے جس کو مزید پروٹین خوراک میں دے کر ختم کیا جاسکتا ہے لیکن اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چھ ماہ کی عمر کے بعد ضروری نہیں کہ صرف پروٹین کی کمی سے ہی یہ بات پیدا ہو۔ اس صورت میں اگر صرف پروٹین کی کمی کو پورا کیا گیا اور کیلاری کا خیال نہ کیا گیا تو دی ہوئی پروٹین کی کچھ مقدار کا استعمال توانائی کے لیے بھی ہوگا جس کے نتیجے میں نشو ونما اور منسوجات کی ساخت کے لیے پروٹین کی کمی پڑجائے گی۔ ہندوستان میں غذائی جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ غریب طبقے کے تقریباً 95 فیصدی بچے سوءِ تغذیہ میں مبتلا ہیں جن میں 70 فیصدی کیلاری کی کمی کا شکار اور 30 فیصدی پروٹین کی کمی کا شکار ہیں۔ اگر ان بچوں کو کیلاری کے لحاظ سے مکمل غذا حاصل ہوجائے تو پروٹین کی کمی آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے۔

وٹامن اے کی کمی

سوءِ تغذیہ کا یہ المیہ نہیں ہے کہ وہ کثرت اموات کا باعث ہوتا بلکہ وہ نئی پود کو مفلوج اور ہمیشہ کے لیے بیکار کردیتا ہے۔ ان تمام اثرات میں سب سے تکلیف دہ آنکھ کی بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ملک میں سیکڑوں ہزاروں افراد نابینا ہیں۔ اس کی وجہ وقت ضرورت پر غذا میں وٹامن اے کی کمی ہے۔ وٹامن اے کی کمی سے سب سے زیادہ بچے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ نشو ونما کے دوران وٹامنوں کی بہت ضرورت ہے۔ وٹامن اے کی کمی کا پہلا اور ہلکا اثر آشوب چشم ہے (جس میں آنکھ کے سفید دیدہ پر ایک جھلی آجاتی ہے)۔ آنکھوں میں نمی اور چمک کے بجائے خشکی اور بے نوری آجاتی ہے اور ماں کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ بچہ رات میں چیزوں کو دیکھنے میں دقت محسوس کرتا ہے جس کی پہچان یہ ہے کہ بعد غروب آفتاب بچہ پیٹ میں اپنی غذا ٹٹول کر کھاتا ہے۔ اس حالت کو رتوندھی کہتے ہیں۔ یہ مرض آسانی سے ختم ہوسکتا ہے۔ اگر فوراً اس پر توجہ دے کر علاج کرلیا جائے۔ مرض کے جڑ پکڑنے میں آنکھ کی قرینہ (پتلی) اس سے متاثر ہوتی ہے اور اس کی دیکھنے کی طاقت ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد قرینہ کے کنارے کٹ جانے سے وہ نرم ہوکر باہر کی طرف نکل آتی ہے۔ آخرکار قرینہ پھٹ کر ضائع ہوجاتی ہے اور اندرونی عدسۂ چشم (Lens of the Eye) بھی ضائع ہوجاتا ہے۔ ایک بار اگر قرینہ خراب ہوجائے تو بہترین علاج کے بعد بھی اس کا درست ہونا ممکن نہیں اور کورپن کو روکا نہیں جاسکتا۔ اس

بیماری میں عموماً دونوں آنکھیں متاثر ہوتی ہیں۔ وٹامن اے کی کمی سے کورپن کا مسئلہ پورے ہندوستان میں ہے لیکن اس سے جنوبی ہند اور بنگال زیادہ متاثر ہے۔

وٹامن اے کافی مقدار میں کچھ غذاؤں مثلاً مکھن، انڈے، کلیجی وغیرہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن یہ چیزیں چونکہ گراں ہیں اس لیے بہت سی ہرے پتوں والی ترکاریاں اور کچھ پھل جن میں کیروٹین پایا جاتا ہے استعمال کرنے سے جسم میں حیاتین اے کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ روزانہ پچاس گرام ہری ترکاریاں جن کی قیمت بہت کم ہوتی، بچوں میں وٹامن اے کی کمی کو پورا کرسکتی ہیں۔ ہری ترکاریوں کے برابر استعمال سے یہ وٹامن جسم میں اکٹھا ہوجاتا ہے اور ناموافق موسم میں جسم میں وٹامن کی کمی کو پورا کردیتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب ماں حاملہ ہو اسی وقت اس کو وٹامن اے اور کیروٹین والی غذائیں افراط سے استعمال کرنا چاہیے تاکہ بچے کے اندر وٹامن اے کافی مقدار میں پہنچے۔ حاملہ عورتوں کو سو گرام روزانہ ہرے پتوں والی ترکاریوں کو خوراک میں شامل کرکے استعمال کرنے سے پیدائش کے وقت بچے کے جگر میں خاصی مقدار وٹامن اے موجود رہے گا۔ چھ ماہ کی عمر سے بچے کی خوراک میں ہری سبزیوں کو پکا کر ان کا عرق دینا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ضرورت بھر وٹامن اس کو ملتا رہے گا۔ خصوصاً اس کے نشو و نما کے وقت جب کہ اس کو اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے۔ تجربے سے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ پانچ سال کی عمر تک سال میں دوبار وٹامن اے کی بھاری خوراک دے دینے سے بھی بچہ کورپن سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ وٹامن اے جگر میں جمع ہوجاتا ہے۔ پتہ چلا کہ 1000 ،200 انٹرنیشنل اکائی وٹامن اے کے کھلانے سے اس کا اثر چھ ماہ تک برقرار رہتا ہے۔ وٹامن کی بھاری خوراک کا غلط اثر بھی پڑسکتا ہے۔ اس لیے چھ ماہ کے اندر دوسری خوراک ہرگز نہیں دینا چاہیے۔ معمر لوگوں کو وٹامن اے کی بھاری خوراک دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی کمی ان کے لیے مہلک نہیں ہے۔

قلت الدم (Anaemia)

قلت الدم نقص غذا کا ایک اہم نتیجہ ہے، جس میں سب سے زیادہ حاملہ عورتیں اور دودھ پلانے والی مائیں مبتلا ہوتی ہیں۔ یہ بیماری عموماً غذا میں لوہے کی کمی سے پیدا ہوتی ہے۔ حاملہ عورتیں قلت الدم کا جلد شکار ہوجاتی ہیں۔ حمل کے دوران خون کی بہت کمی ہوجاتی ہے۔ یہ مرض دوران حمل بہت مضر، خطرناک اور ماں کی صحت کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں قلت الدم ماؤں کی بیماری اور موت کا سبب رہتی ہے۔ اس لیے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ حاملہ عورت کو ضرورت بھر پور فولاد ملتا رہے۔ قلت الدم کو روکنے کے لیے نئی غذائیں جن میں ہرے پتوں والی سبزیاں ہوں روز کھانا چاہیے۔ لوہے کی نمکیات بھی مفید ہیں۔ یہ غذائیں قلت الدم کو روکنے کے لیے سستے ذرائع ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ حمل کے آخری سو ایام میں اگر توجہ دی جائے تو عورت قلت الدم کا شکار ہونے سے بچ سکتی ہے۔ اس کے لیے لوہے اور فولک ایسڈ کی گولیاں حاملہ عورتوں کو دی جاتی ہیں۔

قلت الدم کی ایک قسم اور ہے جسے کلاں نہوضہ قلت الدم (Megaloblastic anaemia) کہتے ہیں۔ یہ فولک ایسڈ یا وٹامن بی12 یا دونوں کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اتنے لوگ مبتلا نہیں ہیں جتنے لوہے کی کمی سے پیدا قلت الدم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہرے پتوں والی سبزیوں کو استعمال کرکے فولک ایسڈ کی کمی کو پورا کرسکتے ہیں، لیکن وٹامن بی 12 کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جانوروں سے حاصل غذائیں مثلاً دودھ، گوشت، انڈے وغیرہ کھانا ضروری ہیں۔ وٹامن بی 12 کی کمی ماں کا دودھ پیتے بچے میں بھی ہوسکتی ہے، جس کی وجہ ماں کے دودھ میں وٹامن بی 12 کی کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ماں کو زیادہ وٹامن کی غذائیں دی جانی چاہیے۔

ناقص تغذیہ کے مزید امراض

ناقص تغذیہ سے پیدا مندرجہ بالا بیماریوں کے علاوہ غذا میں دوسرے وٹامن، بی مرکب، کی کمی سے بھی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بیماریاں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً منہ اور زبان میں جلن اور سوجن منہ کے دہانوں کے کناروں اور ہونٹوں کا پھٹنا۔ یہ بیماریاں غذا میں وٹامن بی مرکب خصوصاً رائیبوفلیون کی کمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ تھایامن کی کمی سے مرض بیری بیری (استسقاء کی قسم کی بیماری) پیدا ہوتا ہے۔ یہ بیماری ان لوگوں کو ہوتی ہے جو بہت کوٹا اور صاف کیا ہوا چاول کھاتے ہیں۔ نکوٹنک ایسڈ کی کمی سے درشت جلدی (پیلگرا) ہوجاتی ہے۔ اس مرض میں دھوپ کی وجہ سے ورم جلد پیدا ہوجاتا ہے۔ دوسری علامتیں اسہال (دست)، زبان میں سوجن اور جلن اور کچھ دماغ پر بھی اثر ہوتا ہے۔ مکائی پیداوار کے علاقوں میں جہاں لوگوں کی خاص غذا مکا (جوار) ہے پیلگرا عام طور پر ہوتا ہے، جس کی وجہ جوار میں لیوسین امینوایسڈ کی زیادتی ہے۔ اعتدال سے جوار استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

بی وٹامنوں کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کو روکنے کا آسان طریقہ ان غذاؤں کا کھانا ہے جن میں یہ وٹامن پائے جاتے ہیں۔ ثابت اناج اور جنس چھنا مثلاً گیہوں، راگی، جوار، باجرہ، دالیں، گری دار میوے، اور تلہن عام طور پر زیادہ بی وٹامنوں کی غذائیں ہیں۔ ہرے پتوں والی سبزیوں میں خاص طور پر زیادہ رائیبوفلیون اور فولک ایسڈ ہوتا ہے۔

پہاڑی علاقوں میں کنٹھ مالا اور گھینگے کا مرض وہاں کی غذا اور پانی میں آیوڈین کی کمی ہے۔ دوسری غذائی بیماری جلبانیت (Lathyrism) ہے۔ اس میں آہستہ آہستہ ٹانگوں میں تشنجی رعشہ اور فالج ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے آدمی لنگڑا اور اپاہج ہوجاتا ہے۔ یہ مرض زیادہ تر نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غذا میں زیادہ کھیسری دال کا استعمال ہے۔ تھوڑی مقدار میں اس دال کو استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کو مستقل غذا کا اہم جز بنا لینے سے یہ بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔ کھیسری دال میں ایک جز مواد سامہ (Toxin) ہوتا ہے اسی کی وجہ سے جلبانیت کا مرض (Lathyrisn) پیدا ہوتا ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ یہ مواد پانی میں محلول ہے اور آسانی سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ اس کو الگ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دال کو دو گھنٹے گرم پانی میں بھگا دیتے ہیں پھر نتھار کر پانی الگ کردیتے ہیں اور دال کو دھوپ میں سکھا لیتے ہیں۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ دال کو چاول کی طرح ابال کر اس کا پانی نکال دیتے ہیں۔ دال سے اس طرح مواد سامہ نکال کر اور لوگوں کو کم کھیسری دال استعمال کرنے کی ترغیب دے کر اس مرض پر قابو پایا جارہا ہے۔ ■

ماخذ: ہماری غذا، **مصنف:** شکیل احمد، **دوسرا ایڈیشن،** جولائی ستمبر 1988، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اردو صحافت پر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات

محمد سہیل

> اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی، ان ترقیوں کے ساتھ اردو صحافت کے آنگن میں نئی روشنی آب وتاب کے ساتھ نظر آئی، اردو اخبارات، رسائل وجرائد کی اشاعت اور طباعت کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا۔

موجودہ دور کو سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے، جدید ٹکنالوجی نے ہمارے رابطے اور معلومات کے طریقے میں انقلاب برپا کردیا ہے، ٹکنالوجی (Technology) لفظ انگریزی میں یونانی زبان سے آیا ہے، جس کے معنی کسی فن یا تکنیک کا منظم مطالعہ کے ہیں۔

ٹکنالوجی سے مراد وہ وسائل، طریقے اور نظام ہیں جو مسائل کو حل کرنے، کام کو بہترین طریقے سے انجام دینے اور انسانی صلاحیتوں کو بہتر اور کارآمد بنانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں، موجودہ صدی میں جدید ٹکنالوجی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوچکی ہے، انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس ٹکنالوجی سے خالی نہیں رہا، ایجادات واختراعات کا سلسلہ جاری ہے، روزانہ ایسی ایسی ایجادات، آلات دنیا کے سامنے آرہے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے اپنی حیرت انگیز ترقی اور وسعت کی وجہ سے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے، انسانی زندگی کے دھارے کو موڑ دیا ہے، انسان کی سوچ وفکر، گفتگو، تہذیب وثقافت اور اس کے طرز زندگی کو بدل دیا ہے، دوریوں اور فاصلوں کو ختم کردیا ہے، زندگی کے ہر شعبے میں نت نئی تبدیلیاں نظر آرہی ہیں، سماجیات سے لے کر اخلاقیات تک، معاشیات سے لے کر سیاسیات تک، تعلیم سے لے کر ادب وثقافت تک، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، اور ان تبدیلیوں کے دوررس اثرات جہاں ایک طرف زندگی کے ہر میدان اور شعبے میں دیکھے جارہے ہیں، تو وہیں دوسری طرف اردو صحافت کے میدان میں بھی دیکھے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر احسان عالم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

”اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی، ان ترقیوں کے ساتھ اردو صحافت کے آنگن میں نئی روشنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئی، اردو اخبارات، رسائل وجرائد کی اشاعت اور طباعت کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا، دنیا آج گلوبل ولیج میں تبدیل ہوچکی ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو صحافت کی مسافت پر لگام لگانا آسان ہوتا گیا، کمپیوٹر کی آمد اور انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ اردو صحافت کا دائرہ کافی تیزی سے وسیع ہوتا گیا، اکیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی اردو اخبارات کی ظاہری شکل وصورت اور خوبصورتی میں کافی اضافہ ہوگیا جو عام قارئین کی توجہ کا مرکز بنا، دہلی، اتر پردیش، بہار، جموں وکشمیر، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال وغیرہ صوبوں میں اردو صحافت نے کافی ترقی کی، اخبارات اور رسائل بڑے پیمانے پر شائع ہونے لگے۔“

(امام اعظم، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2016، ص 141)

اکیسویں صدی میں جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع ترسیل کا کنٹرول ہے، ہر پل رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کی اطلاع لمحوں میں ساری دنیا میں پہنچ جاتی ہے، عوامی ذرائع ترسیل کی بے پناہ ترقی نے تمام عالم انسانیت کو انگشت بدنداں کردیا ہے، آج ٹی وی، فلم، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، الیکٹرانک میل، موبائل فون، ویڈیو کانفرنسنگ، سٹیلائٹ چینلز اور ڈیجیٹل صحافت کا دور دورہ ہے، دنیا بھر کی معلومات محض انگلی کی ایک جنبش کی مرہون منت ہوگئی ہیں۔

آج ہم جس سماج میں جی رہے ہیں، اسے مکمل طور پر ایک معلوماتی اور ڈیجیٹل سماج بنانے میں ان جدید وسائل ابلاغ و ترسیل کا بہت بڑا رول ہے، ان کے ذریعے ہر طرح کی معلومات اور خبریں تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگیں، دنیا بھر کی خبریں انٹرنیٹ کے ذریعے لمحوں میں اِدھر سے اُدھر پہنچ جاتی ہیں، ان ذرائع ترسیل کی قوت اور دسترس کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جاسکتا ہے، آج دنیا کی ہمہ جہت ترقی میں عوامی ذرائع ابلاغ سب سے اہم رول ادا کر رہے ہیں، یہ ہماری سماجی، معاشی، تجارتی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر ہر طرح اثر انداز ہو رہے ہیں، زیادہ تر دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ عوامی ذرائع ابلاغ نے ہماری مادی ترقی کو، مادی وسائل کو، ہماری تہذیبی اقدار اور فکری میلانات کو شدت سے متاثر کیا ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں مواصلات اور ابلاغ عامہ کی غیر معمولی توسیع نے عوام کی روایتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس نے ہمارے سماج کے سامنے ایک بڑا چیلنج کھڑا کر دیا ہے، عوامی ذرائع ترسیل نہ صرف دنیا کا نقشہ بدل رہے ہیں بلکہ دنیا کی تقدیر کو بھی انھوں نے اپنی مٹھی میں کر لیا ہے، ترسیل اور کمیونی کیشن ایسی تکنیکیں ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا، خوشی کی بات ہے کہ ہماری نئی نسل اس جانب متوجہ ہوئی بھی ہے، اسے اس میدان کی وسعت کا اندازہ ہو گیا ہے اور وہ اس امر سے واقف ہے کہ اس میں آزادانہ طور پر کام کیا جاسکتا ہے، وہ شعبۂ ابلاغیات یعنی ریڈیو، ٹی وی، صحافت اور فلم سے براہ راست وابستہ ہونا چاہتی ہے، اس لیے کہ اس میں روزگار کے مواقع موجود ہے۔

زندگی آج جس قدر تیز رفتار ہوئی ہے صحافت کی ترقی کی رفتار اس سے کہیں تیز ہے، انسان نے زمین پر جتنی سرحدیں بنائی ہیں، چودھیوں پر آہنی پردے لٹکائے ہیں صحافت نے ان گھیروں کو ہمیں توڑنے پر مجبور کیا ہے اور یہ تغیر کچھ یوں ہی نہیں ہوا، اس کے لیے ذات اور ذہن کے اندر جو دیواریں اور سرحدیں تھیں اسے عبور کرنے کا سلیقہ آدمی نے اسی سے سیکھا، اس عبوری عمل میں صحافت نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات انسانی علوم پر بھی پڑے ہیں، تہذیبی تاریخ مرتب کرنے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے، تہذیب کے مختلف ادوار کو، ان کے رد و قبول کو عالمی حافظے میں محفوظ کرنے کا کارنامہ بھی اس نے انجام دیا ہے، ان کارناموں کے مظاہر کم وبیش دنیا کے سارے ممالک کی زبانوں میں موجود ہیں، اور یہ مظاہر ہمارے لیے زندہ دستاویز ہیں، جو رونما ہونے والے عالمی واقعات سے صحافت کے انسلاک کی گواہی دیتے ہیں۔

جدید ٹکنالوجی کے اثرات کی وجہ سے اردو صحافت مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والی صدی اردو صحافت کے لیے ایک خوش آئند صدی ہوگی، اردو اخبارات و رسائل نے اپنی بساط بھر ٹکنالوجی کو استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور آج اردو کے اخبارات میں جدید ترین ٹکنالوجی کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس نے نہ صرف برصغیر میں اپنا پرچم بلند کیا ہے بلکہ اس نے کئی نئی بستیاں بسائیں اور نئے آشیانے آباد کیے ہیں۔

عابد انور اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

'' جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے معاملے میں کسی بھی زبان کے اخبارات سے اردو کے اخبارات کمتر نہیں ہیں اور خبروں کے معاملے میں بھی اردو کے اخبارات پیچھے نہیں ہیں خصوصا بین الاقوامی خبروں کے سلسلے میں اردو کے اخبارات اہل وطن کی تمام زبانوں کے اخبارات سے آگے ہیں، اردو کے اخبارات میں بین الاقوامی خبروں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور نمایاں طور پر شائع کیا جاتا ہے، اردو پروگرام ان پیج نے اپنے خوبصورت نوری نستعلیق کے اخبارات کی طباعت میں انقلاب برپا کیا ہے۔''

(تنزیل اطہر، ڈاکٹر، الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2015، ص123)

آج جدید ٹکنالوجی کی مدد سے اردو خلیجی ممالک سمیت مغربی ممالک یوروپ افریقی ممالک میں بولی جارہی ہے اور وہاں سے کئی اخبارات بھی شائع ہو رہے ہیں، انٹرنیٹ کی توسیع نے تو ایک انقلاب برپا کر دیا ہے، ہر جگہ سے ویب اور ای اخبارات شائع ہو رہے ہیں جو نہ صرف اردو زبان کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں بلکہ اردو صحافت، شاعری اور ادب کو بھی عوام الناس تک پہنچا رہے ہیں، آج ہندوستان میں انٹرنیٹ کی زبان اردو ہے، اگر کسی کو بھی اپنی بات مؤثر انداز میں کہنی ہوتی ہے تو اردو زبان، اردو شاعری اور اردو جملوں کا سہارا لیتا ہے، یہ کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کا ہی کمال ہے کہ فیس بک ہو یا ٹوئٹر ہر جگہ اردو کی دھوم ہے۔

آن لائن ایڈیشن اور سوشل میڈیا ویب سائٹس کی بدولت اردو صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، ایک عام اندازے کے مطابق دو لاکھ سے زائد اردو کی ویب سائٹس اس وقت موجود ہیں جن سے اردو صحافت کے علاوہ اردو زبان و ادب کی ترویج واشاعت میں مدد مل رہی ہے، اردو سافٹ ویئرس، ڈکشنریز، اردو

"
جدید ٹکنالوجی کے اثرات کی وجہ سے اردو صحافت مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والی صدی اردو صحافت کے لیے ایک خوش آئند صدی ہوگی۔
"

اخبارات و جرائد، اردو اکیڈمیز، کتاب گھر، اردو سیکھنے سکھانے کے ذرائع ان میں شامل ہیں۔ آزادی کے بعد اکیسوی صدی کے آغاز میں پہلی بار اردو صحافت میں جدید ترین ٹکنالوجی کا استعمال کیا گیا۔ دہلی، ممبئی، کولکاتہ، حیدرآباد، پٹنہ، بنگلور اور ملک کے دوسرے بڑے شہروں سے نئے نئے اخبارات منظر عام پر آرہے ہیں جو صحافتی معیار اور جدید ترین ٹکنالوجی کے آئینہ دار ہیں۔ مختلف اقسام کے فونٹس کے استعمال سے اردو اخبارات اور ان کے مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے ایڈیشنز کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے جب کہ فوٹو شاپ، کورل ڈرا، پیج میکر جیسے سافٹ ویئرس کی بدولت گرافک ڈیزائننگ، تصاویر کی صفحے کی مناسبت سے تزئین و ترتیب کی جارہی ہے، یہی طریقہ کار میقاتی جرائد اور کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی تیار کیا جارہا ہے۔

دوردرشن پر 24 گھنٹے تک چلنے والا نیوز چینل ڈی ڈی اردو، سہارا گروپ کا عالمی سہارا اور اخبار 'منصف' کا 'منصف ٹی وی' اردو کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ای ٹی وی اردو، روبی ٹی وی، 4TV، ٹی نیوز گزشتہ کئی سالوں سے اردو صحافت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ دور درشن اور اردو صحافت کا رشتہ مضبوط اور اٹوٹ ہے۔ دوردرشن کے اردو پروگراموں بالخصوص خبرنامے، مباحث، انٹرویوز وغیرہ کے لیے اردو صحافت سے وابستہ اہم شخصیات کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا رہا، اگرچہ کہ اسے خاطر خواہ سرپرستی حاصل نہیں ہے، تاہم اردو صحافت کا سفر دوردرشن کے ذریعے بھی جاری ہے۔ ای ٹی وی اردو ایک قومی ٹیلویژن چینل ہے، یہ دنیا کے بیشتر ممالک میں دیکھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ دکن کا خبر نامہ، خاص بات، عالمی منظر وغیرہ قبول عام پروگرام ہیں۔

آج اردو کے زیادہ تر اخبارات اپنا آن لائن ایڈیشن شائع کر رہے ہیں، یہ اردو صحافت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی آج ہندوستان میں اردو صحافت کی ترسیل ہو رہی ہے۔ ان کے ذریعے ثقافتی، ادبی، سماجی، تعلیمی مباحثے، مذاکرے اور تبصرے پیش کیے جا رہے ہیں، بیشتر اردو اخبارات نے ویب سائٹ پر انگریزی ایڈیشن بھی جاری کئے ہیں جس کی بدولت غیر اردو داں افراد بھی ان اخبارات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

دور حاضر کے معروف صحافی ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز رقمطراز ہیں:

''اردو صحافت کے روشن امکانات کے ثبوت کے طور پر دنیا بھر کے اخبارات، جرائد کے آن لائن ایڈیشنس ہیں جن کی تعداد میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب، صحافت کو مستقبل قریب میں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے، یہ دوسری زبانوں کے شانہ بشانہ ہے۔''

(ہمایوں اشرف، ڈاکٹر، اردو صحافت: مسائل اور امکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2018، ص 169)

سوشل میڈیا بھی جدید ٹیکنالوجی کا ایک اہم جز ہے، انٹرنیٹ بلاگز، سماجی روابط کی ویب سائٹس، پیغام رسانی کے اسمارٹ فون ایپس، ای میل اور ایس ایم ایس وغیرہ پر سوشل میڈیا محیط ہے۔ سوشل میڈیا کی مقبولیت عصر حاضر میں برقی اور طباعتی ذرائع ابلاغ سے کہیں زیادہ ہے۔ دراصل سوشل میڈیا کی مقبولیت کا راز اس کی سرعت اور برق رفتاری میں پوشیدہ ہے۔ موجودہ دور میں لوگوں کے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ سوشل نیٹ ورکس کی موجودگی میں اخبارات اور نیوز چینلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے ذریعے خبر رسانی سے وابستہ اداروں کو اپنے قارئین اور ناظرین کے تبصروں اور آرا سے آگاہی کے بھرپور مواقع ملتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد اقبال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''سوشل میڈیا صحافت میں جو سب سے بڑی انقلابی تبدیلی لائی وہ یہ ہے کہ اس نے صارفین کو محض قاری ہی نہیں رہنے دیا بلکہ اسے معلومات یا خبروں کو جمع کرنے، سجانے اور دوسروں کے ساتھ اشتراک کرنے کے قابل بنا دیا اور ایک نیا نام 'شہری صحافت' دیا، اس طرح سوشل میڈیا نے قارئین رسامعین رناظرین اور صحافی کے درمیان موجود خط کو مبہم اور دھندلا کر دیا، پہلے جو قاری سامع یا ناظر کی حیثیت رکھتے تھے اب محض خبروں کو پڑھنے، سننے یا دیکھنے تک ہی محدود نہیں رہ گئے ہیں بلکہ خبروں کی تشکیل، ترسیل، تجزیے و تبصرے میں بھی فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی ابلاغ کی یہ دنیا بڑی وسیع ہے اور ذاتیات سے لے کر سماجیات تک، عمرانیات سے لے کر سیاسیات تک دنیا کے ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔''

(اکیسویں صدی میں اردو صحافت، ص 281-280)

سماجی دنیا کے اثرات اردو صحافت کی دنیا میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج سوشل نیٹ ورکس کی بدولت اردو صحافیوں، ادیبوں اور قلمکاروں کی رسائی دنیا کے گوشے گوشے میں ہونے لگی ہے۔ ان کے ادبی، علمی تحقیقی، تنقیدی مضامین، تصنیفات و تخلیقات دنیا میں عام ہونے لگی ہیں۔ ان پیج میں مضمون، کلام ٹائپ کر کے بیک وقت ہند و پاک ہی نہیں بلکہ امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، ڈنمارک کے اخبارات و جرائد کو ای میل کر دیجیے، کبھی املا کی غلطیوں کے ساتھ تو کبھی ایڈیٹنگ کے بعد شائع ہو جائیں گے۔ ویسے کاپی پیسٹ کی روایت بھی عام ہونے لگی ہے۔ اخبارات کے اخبارات، مضامین کے مضامین من و عن کاپی پیسٹ ہو جاتے ہیں۔ یہ روایت بہت قدیم ہے پہلے پڑوسی ملک کے ڈائجسٹ، ناولس حتی کہ قرآنی نسخے، مذہبی کتابیں ہمارے یہاں انتہائی اخلاص کے ساتھ نقل کر لی جاتی تھی۔ اب انٹرنیٹ کی سہولت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ، ای میل، ان پیج نے اخبارات و جرائد کی مشکلات کو کم کر دیا ہے، ایڈیٹر و سب ایڈیٹرس کے بوجھ کو کم کر دیا ہے۔ یو این آئی، قندیل آن لائن، بصیرت آن لائن، فکر و خبر، دی وائر، مضامین ڈاٹ کام اور ملت ٹائمز وغیرہ جیسے آن لائن خبر رساں ادارے اردو صحافت کی ترویج میں غیر معمولی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کی سہولتوں نے مشرق و مغرب کے اجنبی معاشروں میں اُردو نژاد باشندوں کو زبان اور تہذیب کی اجنبیت کے احساس کو ختم کرنے کا سنہرا موقع فراہم کیا ہے۔ اس جدید ترٹکنالوجی کی مدد سے پیغام کی ترسیل اُردو والے کو ایک اجنبی ملک میں

رہتے ہوئے اپنی لسانی اور ثقافتی جڑوں کی جانب لوٹ جانے کا موقع فراہم کیا ہے، رسالوں، کتابوں، روزناموں میں دن رات منتقل ہونے والا مواد ان اردو والوں کی دسترس میں بھی آگیا ہے جو انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کی سہولتوں کو استعمال کرنے کو اپنی عادت اور مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ دلّی میں اگر 'نوائے وقت' اور 'جنگ' کی سرخیوں اور اس کی خبروں سے روزانہ واقف ہونا ممکن ہے تو 'انقلاب' اور 'سیاست' جیسے ہندوستانی اخباروں کو انٹرنیٹ کے پھیلے ہوئے رابطوں میں ڈھونڈ کر پڑھ لینا آسان ہوگیا ہے اور اس کی وجہ سے قارئین قومی و بین الاقوامی واقعات، سماجی ،سیاسی ،معاشی اور تہذیبی معاملات و مسائل سے باخبر رہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کو سوشل میڈیا کی صدی کہا جاسکتا ہے۔ دنیا کو گلوبل ولیج بنانے میں سوشل میڈیا کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ سوشل میڈیا انٹرنیٹ پر مبنی ایپلی کیشنز کا ایک گروپ ہے جو نظریاتی اور تکنیکی بنیادوں پر کھڑا ہے، جو صارفین کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت دیتا ہے۔ آج انٹرنیٹ کے صارفین کا زیادہ تر وقت سوشل میڈیا سائٹس پر ہی گزرتا ہے۔ آج ہر طبقہ اور عمر کے لوگ سوشل سائٹس کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف بھی ہو رہے ہیں اور خبروں، معلومات، تصاویر اور ویڈیو کلپنگ کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ بلاشبہ سوشل میڈیا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر اثر ہوا ہے مگر اسے ایک انقلابی، تعمیری اور مثبت اثر کہا جاسکتا ہے کیونکہ سوشل میڈیا سائٹس کی بدولت الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی رسائی بھی ملک، زبان اور قوم کے حدود اور خطوط سے بالاتر ہو کر دنیا کے گوشے گوشے تک ہو رہی ہے۔ جن اخبارات کی رسائی دوسرے ممالک تک ممکن نہ تھی اب وہ اپنے اخبارات کے لنکس کو سوشل میڈیا سائٹس پر مربوط کر کے ساری دنیا میں پھیلانے کے قابل ہو چکے ہیں۔

ایک دور تھا جب پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا کو نہ صرف اپنے اپنے ملک بلکہ دوسرے ممالک کی پالیسیوں کا احترام اور پابندی کرنی ضروری تھی۔ دوسرے ممالک کی سرحدوں میں داخلے کے لیے ان اخبارات کو سنسر کی کسوٹی سے گذرنا پڑتا تھا۔ سوشل میڈیا سائٹس کے ذریعے کوئی بھی اخبار کسی بھی ملک میں سنسر کے بغیر پڑھا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس سائٹس پر اس ملک میں پابندی عائد نہ ہو۔ اردو صحافت کی تعداد اشاعت گھٹ سکتی ہے مگر سوشل میڈیا سائٹس کی بدولت ان کے قارئین کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے تک اردو اخبارات اگر مشرق وسطی یا امریکی و یوروپی ممالک کو روانہ کیے جاتے تو کم از کم تین دن تا ایک ہفتے کا وقت درکار ہوتا۔ اور بیشتر اخبارات اپنے ہفتہ واری ایڈیشن

اکیسویں صدی کو سوشل میڈیا کی صدی کہا جاسکتا ہے۔ دنیا کو گلوبل ولیج بنانے میں سوشل میڈیا کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ سوشل میڈیا انٹرنیٹ پر مبنی ایپلی کیشنز کا ایک گروپ ہے جو نظریاتی اور تکنیکی بنیادوں پر کھڑا ہے، جو صارفین کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت دیتا ہے۔ آج انٹرنیٹ کے صارفین کا زیادہ تر وقت سوشل میڈیا سائٹس پر ہی گزرتا ہے۔

ہی بھیجنے کے اہل ہوتے کیونکہ ایئر چارج کو برداشت کرنے کے وہ متحمل نہ ہوتے۔ اس کے علاوہ ان ممالک کی پالیسی کی بنا پر بہت سارا مواد تلف کر دیا جاتا۔ اخبار دوسرے ملک کو پہنچتے تک تاریخ کا حصہ بن جاتا اب سوشل میڈیا سائٹس کی بدولت جس ملک یا شہر میں اخبار شائع ہوتا ہے وہاں کے قارئین کے ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی سوشل میڈیا سائٹس کی بدولت یہ اردو اخبارات امریکہ سے چین تک، جاپان سے سعودی عرب تک پہنچنے لگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ قارئین کی رائے اور ردعمل سے بھی وہ فوری آگاہ بھی ہو جاتے ہیں۔ گوگل انالیٹکس کے ذریعے روزانہ، ہفتہ واری، ماہانہ اور سالانہ اخبارات کے آن لائن صارفین کی تعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے جس سے دنیا بھر میں اخبارات کی اہمیت اور افادیت مسلم ہو جاتی ہے۔ اخبارات کے آن لائن ایڈیشن کو اڈورٹائزمنٹس ملنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں جو اخبارات کے مالی استحکام کی بنیاد ہے۔

ماہرین کے مطابق جدید ٹیکنالوجی اردو صحافت کو فروغ دینے کا باعث بن رہی ہے، امریکہ، چین، روس، برطانیہ اور جرمنی سمیت کئی ممالک نے خبروں کی ترسیل کے لیے اردو سروس شروع کر رکھی ہے۔ ناروے، سویڈن، کناڈا سمیت دنیا کے کئی ملکوں میں خبروں کی فراہمی کے لیے ہزاروں اردو ویب سائٹس کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ پہلے لوگ ہندوستان کا اردو اخبار پاکستان میں اور پاکستان کا اردو اخبار امریکہ میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ڈاک کے ذریعے اگر اخبارات و رسائل منگوائے بھی جاتے تھے تو خبریں اور مضامین باسی ہو جاتے تھے، لیکن آج جدید ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعے کناڈا، امریکہ، برطانیہ میں بیٹھا شخص ایک بٹن دبا کر ہندوستان کے اردو اخبارات و جرائد، میگزین اور دیگر ویب سائٹ کی ورق گردانی کر سکتا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دونوں ذرائع سے بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اپنا نمایاں مقام بنا رہی ہے۔

اردو کے معروف صحافی سہیل انجم اپنی کتاب 'میڈیا، اردو اور جدید رجحانات' میں لکھتے ہیں:

''آج اردو کے صحافیوں میں جدید ٹکنالوجی سے استفادہ کی صلاحیتیں موجود ہیں اور اردو اخبارات کے دفاتر میں جدید ٹکنالوجیز اور وسائل سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ دہلی میں ایسے کئی اخبارات ہیں جو بیرون ملک کے پریس کی جانب اپنی کھڑکی کھولے ہوئے ہیں اور وہ اس پر نظر رکھتے ہیں کہ ان اخباروں میں کیا شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے قارئین کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے بہت سی چیزیں لے کر شائع کر دیتے ہیں۔''

(سہیل انجم، میڈیا، اردو اور جدید رجحانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2010، ص 101)

اس مختصر سے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ جدید ٹکنالوجیز اور وسائل نے اردو صحافت پر ہر اعتبار سے دیرپا نقوش و اثرات مرتب کیے ہیں اور اردو صحافت کو نئی سمتوں اور تغیرات سے آشنا کیا ہے۔

■

Mohd Suhail
Research Scholar,Department of Urdu
Lucknow University,Lucknow
Lucknow-226020(U.P)
Email:sahilsayeed1990@gmail.com

حسرت کا تصورِ عشق

محمد عارف

رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی اپنی افتادِ طبع اور فکر و نظر کے اعتبار سے یگانۂ روزگار شخص تھے۔ اردو کی غزلیہ شاعری میں ان کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو ایک نئی توانائی اور قوتِ فکر و نظر بخشی۔ کسی بھی شاعر کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے زمانے سے واقفیت حاصل کی جائے کہ سمجھ میں آسکے کہ آخر کیا رجحانات و میلانات اور اسباب و علل تھے جن کے سبب شاعر نے یہ اشعار قلمبند کیے۔ علی گڑھ کے آسمان شعر و ادب پر درخشاں ستاروں میں سے ایک نمایاں نجم الثاقب حسرت موہانی کا نام ہے۔ غزل میں جس وقت حسرت موہانی کا عروج تھا اس وقت داغ اور امیر کے اشعار کی گونج ابھی باقی تھی۔ داغ کا شوخ رنگِ سخن اتنا مقبول ہوا کہ اس وقت کے تمام نامور شعرا میں سے معدودے چند کے علاوہ کوئی بھی اس رنگ سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ اس ماحول میں حسرت موہانی نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ پیشہ ور محبوب کو چھوڑ کر اپنی داستانِ عشق کی بنیاد اس محبوب پر رکھی جو ان کے ہی خاندان کا کوئی جیتا جاگتا فرد تھا۔ اور شوخی کے بجائے اپنی طبیعت کی مناسبت سے زیادہ زور تجربے کی صداقت پر دیا، زبان بھی صاف وشستہ اور روزمرہ کی زندگی سے بہت قریب رکھی اور انسانی نفسیات کا بھی خیال رکھا۔

داغ کے مانند وہ بھی اپنے اشعار میں ایک کامیاب عاشق کا رول ادا کرتے ہیں جبکہ دیگر شعرا اپنے کمالِ فن کے باوجود ناکام عاشق نظر آتے ہیں۔ اس طرح حسرت موہانی کو بھی وہی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی جو داغ کے حصے میں آئی اور حسرت رئیس المتغزلین کہلائے۔

حسرت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ اور حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں کو موضوع نہیں بنایا، بلند خیالی اور معنی آفرینی سے احتراز کیا اور اپنے اشعار کو تقلیدِ لفظی و معنوی سے دور رکھا۔ انھوں نے ساری زندگی دار و رسن اور قید و محن کی آزمائشوں میں گزاری، لیکن اپنے قلب و نظر اور فکر و خیال کی دنیا کو حسن و عشق کی رعنائیوں سے تر و تازہ رکھا۔ حسرت کی شاعری میں فلسفہ اور تعقل و تفکر نہیں بلکہ صداقت، معصومیت اور کھرا پن ہے۔ حسرت موہانی کی نظر میں معیاری شاعری کے تین اہم اجزا ہیں۔ جذبات عالی، جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری۔ اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ حسرت کی شاعری کی بنیاد جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری پر ہے۔ انھوں نے متوسط اور شریف گھرانے کی اس عورت کو اپنا موضوعِ شاعری قرار دیا جو کہ باحیا ہے اور عفت و پاکدامنی کا مجسمہ ہے۔ اس کے دل میں بھی محبت کے جذبات اُمنڈ رہے ہیں لیکن محبت کا اقرار کرتے ہوئے حیا اور تذبذب دامن گیر ہو جاتے ہیں۔ وہ رسمِ وفا کی پاسداری بھی کرنا چاہتی ہے مگر زمیندار گھرانوں کی تہذیبی وضع داری سے مجبور ہو کر انکار کر دیتی ہے۔ لیکن یہ انکار اس قبیل سے ہے جس میں اقرار کا پہلو بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو

وہ ان کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا
دل مایوس کو گرویدہ گفتار کر لینا

ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے
برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے

حسرت موہانی کے دم سے ہی اردو غزل کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، اور یہ ایسی خدمت ہے جس نے انھیں لازوال اور دائمی بنا دیا ہے۔ انھوں نے فقط غزل کو حیاتِ نو ہی نہیں بخشی بلکہ اسے ایک نیا وقار بھی عطا کیا۔ بڑے سے بڑا نقاد بھی جو حسرت کی شاعری کو دوسرے اور تیسرے نمبر کی شاعری سمجھتا ہے وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ غزل کا احیا حسرت موہانی کے ہی دم سے ہوا ہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ، حسرت کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اردو شاعری اور اردو زبان پر احسان ہے۔ حسرت نے غزل کی آبرو اس زمانہ میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغہ میں تھی۔ انھوں نے اردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی۔ حسرت غزل کے بڑے شاعروں میں تسلیم کیے جاتے ہیں اور اردو شاعری کے مسلسل ارتقا میں ان کا اہم مقام ہے۔ ان کے خیال اور انداز بیان دونوں میں شخصی اور روایتی عناصر کی آمیزش ہے۔ حسرت خالص غزل گو تھے ان سے پہلے بڑے بڑے جید غزل گو گذرے تھے۔ معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں، پھر بھی حسرت کی غزل گوئی ممتاز اور منفرد ہے۔ اس لیے کہ حسرت غزل کا سہارا غزل سے ہی لیتے ہیں کسی اور سے نہیں، غزل گوئی کوئی کرے، غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔'' (رشید احمد صدیقی: کچھ حسرت کے بارے میں۔ نگار، 1952، ص 22)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ:

''حسرت کا ادب تین ادبی رجحانات کا امتزاج ہے۔ سرسید کی ادبی تحریک سے انھیں واقعیت پرستی اور حقیقت پسندی ملی۔ امیر اور داغ سے انھوں نے غزل کا لوچ اور اس کا بانکپن حاصل کیا اور لکھنؤ مکتب کی شاعری کے ایک ردِ عمل کے نتیجہ میں حسرت کی شاعری میں شگفتگی، لطافت، زندہ دلی، بے تکلفی، سادگی اور نفاست کی خصوصیات پیدا ہوئیں، اور اس طرح حسرت کی شاعری صحیح رنگِ تغزل سے آشنا ہوئی۔'' (ڈاکٹر عبادت بریلوی: حسرت کا تغزل۔ نگار، 1952، ص 44)

حسرت موہانی نے غزل کا انداز بدلا۔ انھوں نے عشقیہ شاعری میں ارضیت پیدا کی اور عشق کے حقیقی جذبات اور تجربات کا غزل میں اظہار کیا اور غزل کو ایک نئے غنائی آہنگ سے آشنا کیا۔

حقیقت یہی ہے کہ انسان کو جنسی اور نفسیاتی خواہشات کی غلامی سے آزاد کرا کے تہذیب و تمدن نے ہی اسے انسانیت اور آدمیت کی شناخت عطا کی ہے، اب اگر

انسان انھیں خواہشات نفسانی کا اسیر ہو کر دوبارہ تہذیب و تمدن سے عاری دنیا میں چلا جائے جہاں نفس امارہ کی حکمرانی ہو اور جنسی آرزوؤں کی تکمیل ہی سرمایۂ حیات سمجھی جاتی ہو تو یہ ابتذال اور انحطاط کی آخری منزل ہے۔ ایسی حالت میں حسرت موہانی کا غزل کے میدان میں وارد ہونا کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ مجنوں گورکھپوری اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

’’ہمارے اندر ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں، ہم کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں سے اردو غزل میں نئی توانائی آ گئی ہے۔ اب اس سے ایک نئی اور خوش آئند سمت میں قدم اٹھایا ہے۔‘‘

(مجنوں گورکھپوری، حسرت کی غزل، جنوری، فروری 1952، ص12)

معروف مصور ’سیزان‘ نے ایک تصویر بنائی تھی جس میں ایک شخص کو کپڑوں پر استری کرتے ہوئے مستی میں گاتے اور گنگناتے ہوئے دکھایا گیا تھا، یہ تصویر رومانوی (Impressionism) کا نمائندہ شاہکار بن گئی تھی۔ اس لیے کہ زندگی کی سختیاں برداشت کرنے والے سماج کے نچلے طبقے کو تمام مشقتوں اور پریشانیوں کے درمیان مستی و سرشاری میں گاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ حسرت کی عشقیہ شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔ ان کی شاعری میں بھولے بھالے اور زمانے کی نیرنگیوں سے بے خبر چہرے کسی معصومیت سے جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ان چہروں کے پس منظر میں سماج کے متوسط طبقے سے متعلق در و دیوار نظر آتے ہیں۔

حسرت کے عشق میں خودداری ہے جس کے سبب وہ اظہار تمنا کرنے سے گریز کرتے نظر آتے ہیں اگر اظہار کیا بھی تو اس پر بعض اوقات نادم سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ان کے عشق کی پاکیزگی اور خودداری ہی کا نتیجہ ہے۔ مثلاً

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا!!

حسن کے سامنے اگر حسرت موہانی کبھی ہمت بھی کرتے ہیں تو ایسے رازدارانہ انداز میں کہ محبوب کو خبر نہ ہو۔ اور بعض اوقات تو حسرت کی شریفانہ احتیاط اور معصومیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ محبوب کے لطف و کرم کے اشارے کو بھی نہیں سمجھتے اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے اپنی کم ہمتی کو تسلیم بھی کیا ہے۔

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے شوق پابوسی نہ سمجھی پستی ہمت تری اس لطف ایما کو

اور اگر کبھی اپنے تذبذب اور کم ہمتی پر غلبہ حاصل کر کے اپنے محبوب کو داستان شوق سنانا بھی چاہتے ہیں تو وہ التماس کی کشمکش میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اظہار شوق کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ آرزو کے اظہار سے زیادہ آرزو کی یاد کے دیوانے ہیں اس لیے اس یاد کو دل سے لگا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

کیوں کر کوئی سنائے انھیں شوق کی وہ بات جو پڑ گئی ہو کشمکش التماس میں!

حسرت موہانی علی الاعلان اور بہانگ دہل مضامین کو باندھتے ہیں۔ ان کے اندر کسی طرح کے تذبذب یا جھجک کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ بے خودی اور وارفتگی کے اظہارات حسرت کی اخلاقی جرأت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اسی صاف گوئی اور بے باکی کے سبب بعض اوقات انھیں صفائی دینی پڑتی ہے کہ ان کے باطن میں کوئی کھوٹ نہیں ہے ان کا باطن پاک و پاکیزہ اور شفاف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

حسرت کا دل آئینہ ہے اک پرتو حق کا گو اس کی نظر شیفتہ حسن بتاں ہے

یا پھر ایک جگہ مقطع میں اپنے عشق کی پاکیزگی کا یوں اعلان کرتے ہیں۔

وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاکباز اس کا دیار شوق میں ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا

عشق و محبت کی وارداتوں پر حسرت کے اشعار کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی معاملات میں حسرت نہایت ہی بے باکی اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے تھے اسی طرح شاعری اور سخن وری کے میدان میں بھی اخلاقی جرأت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی وارفتگی اور بیساختگی انسانی جذبات پر پردہ ڈالنے کی روادار نہیں تھی۔ بلکہ جیسے جیسے ان کے اندر پختگی اور انفرادیت پیدا ہوتی گئی ان کا قلم اور زیادہ جسور اور جری ہوتا گیا اور ان کا بیان اور زیادہ صریح اور واضح ہوتا گیا۔ حسرت کی شاعری جذبات و احساسات کی کمی کو خیالات اور تصورات کے ذریعے پر کرنا چاہتے ہیں، لیکن تصور اور دوسرے خارجی محرکوں کی طرح جذبے کے خلا کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ تصورات کی شاعری میں اکثر اوقات بے لطفی اور سپاٹ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ سوائے ایسی صورت کے کہ تصورات کی گہرائی میں جذبات کی کارفرمائی موجود ہو جیسے غالب کے یہاں ہے۔ مگر اوسط درجے کا اور معمولی شاعر اپنے اشعار میں تصورات کا سہارا اس وجہ سے لیتا ہے کہ وہ جذبات کی کمی کا تدارک کر سکے۔ حسرت کی حقیقت نگاری میں تخیل کی بھی کارفرمائی ہے لیکن اس انداز سے کہ وہ حقیقت کو اور زیادہ موثر اور دلکش بنا دیتی ہے۔ معنویت کی تخلیق شاعری ہے۔ داخلی جذبات اور خارجی محرکات کا امتزاج حسرت کے مادی تجربات اور مشاہدات میں معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ حسرت چشم بینا بھی رکھتے ہیں اور دوراندیش بھی ہیں۔ وہ غزل کے اداشناس تھے، اس کی ملائمت اور رمزیت کی حدود سے آشنا تھے اس لیے قید و بند کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے باوجود اور اپنے تیکھے سیاسی شعور اور مسلسل سیاسی جدوجہد کے باوجود انھوں نے سیاست اور سیاست کی راہ میں آپ بیتی کو علی الاعلان غزل میں بیان نہیں کیا۔ بال گنگا دھر تلک کی تعریف میں غزل اور چکی کی مشقت والے اشعار اور اسی قبیل کے چند دوسرے اشعار کے سوا اس کا تذکرہ ان کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

حسرت موہانی کی کلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حسن و عشق کی داستانیں رقم کرنے والے اس شاعر نے حسن کی رعنائیوں اور دلربائیوں کے انگنت پہلوؤں اور تہوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سعی و کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ حسرت کے لیے عشق فقط دل لگی اور دل بستگی کا سامان نہیں بلکہ عشق مختلف اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔

مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرت نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینہ

حسرت کے نظریے کے مطابق عشق انسان کے اندر مثبت تبدیلیاں لاتا ہے اور اس کے منفی جذبات کو ختم کرتا ہے۔

مجموعہ خوبی ہوئی عشاق کی سیرت یہ کیا ہے اگر عشق کا اعجاز نہیں ہے

عشق ہی کی بدولت حسرت شاعر بنے اور عشق ہی کی بدولت انھوں نے نام و نمود حاصل کیا۔ عشق ہی کے سبب ان کی شعری صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا اور عشق ہی نے انھیں ’حسرت‘ کے نام سے دنیا والوں سے روشناس کرایا۔

جب سے کہا عشق نے حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

■

Mohammad Arif
49-B/15, Stanley Road, Bali Colony
Prayagraj- 211002
Mob.: 7705964091
aarifprince857@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

عریش (ادب اطفال)

مصنف: قمر جمالی

صفحات: 121، قیمت: 40 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: منور حسن کمال، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔25

بچوں کو قدرتی طور پر کہانیاں سننے اور پڑھنے کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو قصے اور کہانیوں میں ابتدائی عمر کے بچوں کے لیے نصیحتیں ہوتی تھیں اور وہ ان کے دل و دماغ میں رچ بس جاتی تھیں۔ کہانیاں اور قصے سنانے کے اس عمل سے بچوں اور ان کے بڑوں کے درمیان محبت و موانست پیدا ہو جاتی تھی۔

آج مائیں بچوں کے ذرا رونے اور شرارت کرنے پر ان کے ہاتھ میں موبائل تھما دیتی ہیں جس کے نقصانات سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بچنا بہت ضروری ہے اور انھیں چاہیے کہ وہ اگر کہانیاں نہ سکا سکیں تو کم از کم قلم و کاغذ سے ان کا رشتہ ضرور جوڑیں تاکہ موبائل کی اسکرین سے ان کی آنکھوں کو ہونے والے نقصان سے بچا سکیں۔

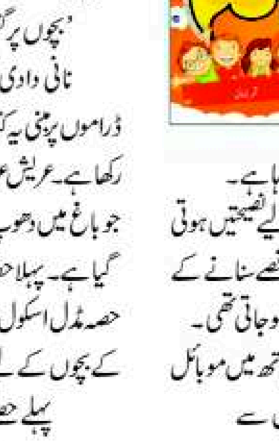

پیش نظر کتاب 'عریش' اپنے عہد کی معروف ادیبہ قمر جمالی کی تصنیف ہے۔ بچوں کی کہانیوں پر مشتمل 'عریش' ان کی اہم کتاب ہے۔ وہ نصف صدی سے لکھ رہی ہیں، جن میں افسانے، ناول اور تحقیقی مضامین شامل ہیں لیکن ادب اطفال پر ان کی توجہ نہیں تھی۔ کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتی ہیں:

"...اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نیک کام کی توفیق عطا کی اور ہماری توجہ ادب اطفال کی طرف مبذول کرائی اور اسے تکمیل کا حوصلہ بھی عطا کیا۔ عمر کے اس پڑاؤ میں غیرت کا احساس ہوا کہ پچھلی نصف صدی سے ادب کی دنیا کی صحرانوردی کی۔ تقریباً ڈھائی سو سے سوا تخلیقات سے قارئین کے ذوق سلیم کا سامان کیا..."

"اب عمر طبعی کو پہنچے تو احساس ہوا کہ ہمارے بعد اس دولت کا کیا ہوگا کیونکہ ہم نے بنیادی کام تو کیا ہی نہیں یعنی... نونہالوں میں مطالعے کا ذوق مہمیز کرنے کی نہ تو سعی کی اور نہ سامان کیا..."

"ہمیں پچھتاوا ہوا کہ ہم نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا جو مستقبل میں دراصل ہماری ادبی روایات کے پاسبان ہوں گے۔ اگر ہم ان میں مطالعے کا شوق پیدا نہ کریں تو ہماری کتابوں کو پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

'بچوں پر گفتگو' کے تعلق سے بھی قمر جمالی نے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں:

نانی دادی کی زبانی بیان کیے گئے قصوں، حکایتوں پر مبنی چودہ کہانیوں اور دو ڈراموں پر مبنی یہ کتاب انھوں نے بچوں کی نذر کی ہے۔ اس کتاب کا نام انھوں نے 'عریش' رکھا ہے۔ عریش عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں گھاس پھوس سے بنا گھر یا سائبان جو باغ میں دھوپ سے بچنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ پرائمری اسکول تا مڈل اسکول کی سطح کے بچوں کے لیے ہے اور دوسرا حصہ مڈل اسکول تا ہائی اسکول سطح کے بچوں کے لیے ہے۔ گویا پہلا حصہ 6 تا 12 برس کے بچوں کے لیے ہے اور دوسرا حصہ 12 برس سے زیادہ عمر کے بچوں کے لیے ہے۔ پہلے حصے میں ننھی چڑیا، انعام، اللہ پر بھروسہ، مرغ اور مٹر کا دانہ، بندر ہوا تڑی پار، الول ملول ہیں۔ جب کہ دوسرے حصے میں سچی دولت، زیرک لڑکی، فوجی اور بھوت، بھائی ٹی ٹی رام، بونے کی ہانڈی، پھول پا شاہ زادی، اور ٹلو خان ہیں اور آخر میں دو ڈرامے 'دیا جلتا رہا' اور 'کونپل' ہیں۔

قمر جمالی کی بچوں کے لیے ان تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہایت سادہ، آسان اور سلیس زبان میں کہانیاں رقم کی ہیں۔ ایسی زبان کا استعمال کیا ہے کہ بچے اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔ جہاں کہیں اگر مشکل الفاظ آ ہی گئے ہیں تو انھوں نے کہانی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی کے تحت ان کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک ادیب کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ بچوں کی ذہنی سطح کو دھیان میں رکھتے ہوئے بچوں کے لیے لکھی گئی تحریروں کو آخری شکل دے۔ اس سلسلے میں قمر جمالی کا نام ان ادیبوں کی پہلی صف میں شامل ہوگا جنھوں نے ادب اطفال میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ قمر جمالی کے الفاظ میں "اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کسی بچے کو اس کتاب سے تازگی ملی اور اس میں موجود حکایتوں سے سیکھ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت بارآور ہوئی۔"

امید ہے بچے اس کتاب کو ذوق و شوق سے پڑھیں گے اس لیے اس کتاب میں ان کی دلچسپی کا ہر سامان پیش کرنے کی بہت عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

تحقیق و تنقید

[redacted]

غالب نئی تشکیل

مصنف: پروفیسر عبدالحق

صفحات: 243، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: بتسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر شمیم احمد، سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر عبدالحق اپنی اقبال شناسی لیے معروف ہیں۔ ان کے جان وتن میں اقبال بسے ہوئے ہیں۔ اقبالیات پر تالیف وترتیب کو ملا کر ان کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ماہر اقبال کے طور پر اپنی مستحکم شناخت رکھنے والے پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے ساتھ، غالب فہمی میں بھی ایک مقام حاصل کیا۔ 'غالب اور غالبیات' (2016) کے بعد 'دیوان غالب' شائع کیا جو غالب کا ایک اہم اور نادر مخطوطہ ہے۔ یہ مخطوطہ 2019 میں مرکزی حکومت کی سرپرستی میں منظر عام پر آیا۔ 'غالب نئی تشکیل' غالب پر تیسری کوشش ہے جس میں 'غالب اور غالبیات' کے مضامین کے ساتھ تقریباً چھ نئے مضامین شامل ہیں۔ اسے ایک اضافہ شدہ ایڈیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس اضافے سے پہلی کتاب کی علمی توقیر میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے نادر ونایاب موضوعات پر مضامین کی شمولیت نے غالب شناسی کے نئے امکانات روشن کیے ہیں۔ جواب تک زیادہ تر ناقدین کی نظر سے محروم رہے ہیں۔ آج تک غالب کی قرآن فہمی پر نظر نہیں ڈالی گئی اور نہ اسے ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ پروفیسر موصوف نے بڑی عرق ریزی سے غالب کے اردو و فارسی کلام میں مستعمل قرآن کریم کی آیات کے حوالے سے فکر وشعر کے حسین امتزاج پر فکر انگیز مضامین قلم بند کیے ہیں اور غالب کے قلب ونظر کے نہاں خانے میں موجود ایمان و یقین کے نور کو بے پردہ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو دیوان کے حوالے سے لکھا گیا مضمون قدرے مختصر ہے جب کہ فارسی کے شعری حوالوں پر مشتمل مضمون تفصیلی ہے۔ وجہ صاف ہے کہ فارسی کلام اردو کے مقابلے میں کہیں ضخیم اور وقیع ہے۔ ایسا ہی دوسرا مضمون 'حضور رسالت مآب — غالب کی فکری آگہی کا سرچشمہ نور' بھی ایمان فروزی کے ساتھ فکر انگیز اور آگہی سے معمور مضمون ہے۔ مطالعے کے یہ زاویے ندرتِ خیال کے نتائج ہیں، جن پر پروفیسر موصوف کی ہمیشہ نظر رہتی ہے۔ نئی سوچ اور نئے پہلو کی تلاش ان کا خاصا ہے۔ 'غالب کی پیامی شاعری' کا بھی یہی حال ہے۔ غالب کو عام طور پر صرف طے شدہ نظریوں سے ہی دیکھا جاتا ہے، جو زیادہ معتبر نہیں ہے۔ غالب اقدار پرستی کے قائل ہی نہیں گرویدہ ہیں۔ ان مضامین میں ان کے ایمان و آگہی کی جمال آفریں تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ غالب کا شعری افتخار بھی توجہ طلب ہے۔ اگرچہ یہ مضمون فارسی کے حوالوں سے گراں بار ہے مگر غالب پر لکھنے والے حضرات کی مجبوری ہے کہ فارسی کے انمول خیالات سے گریز نہیں کر سکتے۔ نئے مخطوطے کا تعارف بھی دیوانِ غالب کے معلوم شدہ نسخوں کے تجزیہ پر مبنی ہے۔ اسے حیاتِ غالب سے قریب تر اور بہت معتبر نسخہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ دریافت بھی اقبال شناس کے مقدر میں محفوظ کی گئی تھی۔ پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی کے ساتھ غالب شناسی اور مخطوطہ شناسی ان کے مطالعے کی وسعت کے غماز ہیں۔ نئے اور منفرد موضوعات کی جستجو اور پھر ان کی کامیاب پیشکش ادب کے سنجیدہ قارئین کو ترغیب دیتی ہے کہ ان نئے پہلوؤں کو نئے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اسی لیے مخزن لاہور، فکر ونظر علی گڑھ اور ایوان اردو، دہلی کے حالیہ شماروں میں قرآن و غالب سے متعلق مضامین کو جریدہ کا ابتدائی عنوان قرار دیا گیا ہے۔ پروفیسر توقیر عالم فلاحی (پروفیسر شعبۂ دینیات) مدیر، فکر ونظر، نے اداریے میں لکھا ہے:

'قرآن کریم اور غالب کے شعری حوالے فارسی کلام کی روشنی میں' جولائی تا دسمبر فکر ونظر کے مشمولات میں پہلا مضمون پروفیسر ایمرٹس پروفیسر عبدالحق کا ہے۔ جو غالب کی عربی شناسی اور قرآنی آیات کے پس منظر میں غالب کی شاعرانہ قادرالکلامی اور لازوال شعری تخلیقات پر دال ہے۔ پروفیسر موصوف نے دلنشیں پیرایۂ بیان اور اچھوتے انداز میں غالب کی شخصیت کے اس گوشے کو منصۂ شہود پر لانے کی قابل مبارک باد کوشش کی ہے۔''

حقیقت یہ کہ غالب کی فکر ونظر کی تشکیل کے اس لازوال سرچشمہ پر غور نہیں کیا گیا۔ اب غالب کے مطالعہ میں ایک نئی رہ گزر کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضمون 'غالب کے شعری اسالیب' بھی خیال آفریں نکات کا آئینہ خانہ ہے۔ غالب کی شعری صناعی اور ترسیل کی سحر آفرینی پر یہ مضمون منفرد اسلوب کا حامل ہے۔ غالب و اقبال کے فکری اور فنی اشتراک پر ایک نادر مضمون ان کے ذہنی رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔ غالب سے اقبال کی قربت اور نسبت کے لاشعوری رشتوں کی وضاحت پر یہ ایک منفرد مضمون ہے۔ جو دونوں عظیم فنکاروں کے فکر وفن کی تفہیم کے لیے چراغ رہ گزر کا حکم رکھتا ہے۔ دونوں بڑے فن کاروں کے انگریزی تراجم کا جائزہ بھی مطالعے کی چیز ہے۔ ضمیمہ میں ذوق کی قصیدہ نگاری پر غور طلب اور پرلطف مضمون ہے، جسے ذوق شناسی کے لیے لازم کہا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام مضامین بھی چشم ودل کی کشادگی کا باعث ہیں اور ہمارے تنقیدی شعور کی پرورش کے لیے ناگزیر اہمت کے حامل ہیں۔

سوانحی ادب

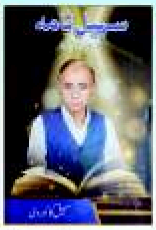

سہیل نامہ ایک کامیاب منظوم سوانح

مصنف: محی الدین سہیل کاکوروی

صفحات: 308، قیمت: 530 روپے

ناشر: ساوی پبلیکیشن لکھنؤ

مبصر: محمد غفران نسیم، 233/44، کوڑے والی گلی، پاٹہ نالہ چوک، لکھنؤ

اردو شاعری میں منظوم سوانح پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر مایوس واپس آتی ہے لیکن شوق تحقیق اگر پختہ ہے تو دو منظوم سوانح دستیاب ہیں ایک پاکستان کے مشہور اور مقبول شاعر حمایت علی شاعر کی 'آئینہ در آئینہ' اور دوسری ایک خاتون قلم کار رشیدہ عیاں کی 'میری کہانی' دونوں قلمکاروں نے فن کا التزام رکھتے ہوئے یہ کار مشکل اور اہم کارنامہ انجام دیا۔ یہ منظوم کاوشیں اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسی ضمن میں گزشتہ دنوں لکھنؤ اسکول کے ایک معتبر اور منفرد شاعر سہیل کاکوروی کی کتاب 'سہیل نامہ' کا اجرا ہوا۔ جو ہندوستان میں منظوم سوانح کی پہلی کاوش ہے۔ جبکہ رشیدہ عیاں لندن کی شہری ہیں اور حمایت علی پاکستان کے شاعر ہیں۔ اس اعتبار سے سہیل کاکوروی کو پورے ہندوستان میں فوقیت اور اولیت حاصل ہوگئی ہے۔ محی الدین علوی سہیل کاکوروی

چار زبانوں کے ماہر ہیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندی، اردو، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔جن میں دو کتابیں بک آف ریکارڈ میں درج ہیں۔پھلوں کا راجہ 'آم' پر شاعری میں ان کی کتاب 'آم نامہ' لمکا بک آف ریکارڈ (2015) میں درج ہوئی اور طویل غزل میں محاوروں کے استعمال کے منفرد ادبی کام پر مبنی ان کی کتاب 'نیلا چاند' ایشیا بک آف ریکارڈ (2021) میں درج ہے۔اس سال کی تازہ کتاب 'سہیل نامہ' جو کہ منظوم سوانح عمری ہے۔308 صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کا مطالعہ قاری کو پچھلے پہر نیند سے بغاوت کر کے زیادہ سے زیادہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ہر شعر میں ایسا سحر اور ایسا ربط ہے کہ قاری اگلا شعر پڑھنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔اس سوانح میں زبان و بیان کے لحاظ سے کوئی تکلف نہیں برتا گیا۔شعوری طور پر کچھ مخفی رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔شاعر کو جیسے جیسے واقعات یاد آتے جاتے ہیں وہ پیکر شاعری میں ڈھالتا جاتا ہے اور اس طرح بہت خوبصورتی سے زندگی کی داستان بلکہ حقیقت بیانی آگے بڑھتی جاتی ہے۔سوانح اگرچہ مثنوی کے طرز پر ہے تاہم اشعار شاعر کے اس مزاج کے آئینہ دار ہیں جس کی بنیادوں میں غزل پیوست ہے۔نزاکت خیال نمایاں ہے اور بغیر کسی شک کے کہا جاسکتا ہے کہ سچ بولنے سے گریز نہیں کیا گیا ہے۔

سوانح میں حب الوطنی انسانیت یکجہتی خیر سگالی جیسے موضوعات پر متعدد اشعار ہیں۔تیوہاروں اور موسموں کے علاوہ مظاہر قدرت پر غزلیں بھی ہیں۔کم از کم ایک شعر میں اپنے محبین اور متعلقین شعرا اور دانشوروں کے بھی نام بہت سلیقے سے نظم کیے ہیں۔برجستگی نے اشعار کو وہ روانی عطا کی ہے کہ قاری سبک موجوں سے کھیلنے کا لطف لیتا ہے۔نمونے کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں ۔

اردو ہے اور محبت ہندوستان ہے — موتی نکلے ہیں مجھ میں یہ انمول اے سہیل
زرخیز ہو زمیں میری آب رواں رہوں — اللہ ملک وقوم کا میں پاسباں رہوں
اس میں جواب میرے ہیں اور میرے ہی سوال — لکھتا ہوں میں شعور کی رو میں یہ اپنا حال
غزلیں میری پسند جو آجائیں داد دیں — ہولی دیوالی عید کنہیا پہ بھی تو ہیں
تخلیقیت ہی میرے جنوں کی ہے بانگی — کمپیوٹر اور قلم کو تھکاتا ہوں روز ہی

ساوی پبلی کیشن لکھنؤ کے زیر انتظام شائع 'سہیل نامہ' پڑھنے کے لائق دلچسپ شعری کاوش ہے۔

خود نوشت سوانحی ادب: تعارف و تجزیہ (کتاب اول)

مصنف/ناشر: ڈاکٹر سید وجاہت مظہر
صفحات: 310، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ملنے کا پتہ: ٹی 116/1، سکنڈ فلور
مین مارکیٹ، اوکھلا گاؤں، نئی دہلی۔110025
مبصر: ڈاکٹر ظفر محمود
صدر شعبۂ اردو، مادھو گورنمنٹ کالج، اجین (مدھیہ پردیش)

ڈاکٹر سید وجاہت مظہر کی کتاب 'خود نوشت سوانحی ادب: تعارف و تجزیہ (کتاب اول)'، اپنے موضوع پر کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل تصنیف ہے۔یہ بنیادی طور پر خود نوشت سوانح نگاری کے فنی، ہیئتی اور تاریخی پہلوؤں اور منتخبہ خود نوشت سوانح عمریوں کے تعارف و تجزیے پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے اور انداز بیان سنجیدہ و تجزیاتی ہے۔

اس کا پہلا باب 'خود نوشت سوانح نگاری: لوازمات، دشواریاں اور امکانات' ایک مبسوط تحقیقی مضمون ہے۔اس میں مصنف نے فن خود نوشت سوانح نگاری کے جن بنیادی پانچ لوازمات کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہیں: دیانت داری، خود شناسی، اظہار کی صلاحیت، عصری آگہی اور انتخاب واقعات۔ ان ناگزیر لوازمات کا ادراک خود نوشت نگار کے لیے لازمی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں کی درجہ بندی' پر محیط ہے۔ یہ باب مواد اور ہیئت کے لحاظ سے خود نوشتوں کے جن بنیادی زمروں کی نشاندہی کرتا ہے، وہ یہ ہیں: ادبی خود نوشت سوانح عمریاں، فنی خود نوشت سوانح عمریاں، سیاسی خود نوشت سوانح عمریاں، مذہبی خود نوشت سوانح عمریاں، صحافتی خود نوشت سوانح عمریاں، متفرق خود نوشت سوانح عمریاں، ناول نما خود نوشت سوانح عمریاں اور منظوم خود نوشت سوانح عمریاں۔

تیسرے باب کا عنوان 'خود نوشت سوانح نگاری کا نسائی زاویہ' ہے۔یہ مضمون ملک اور بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی خواتین کی خود نوشتوں کے ارتقائی سفر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اردو کی دو خواتین کی تحریر کردہ آپ بیتیوں 'بری عورت کی کتھا' اور 'جنت سے نکالی ہوئی حوا' کے تعارف و تجزیے پر فوکس کرتا ہے۔

کتاب کا اگلا باب 'انقلاب 1857، دستنبو اور داستان غدر' ہے۔اس تحقیقی مضمون میں وجاہت مظہر نے دور غالب کے تناظر میں ان کی مشہور کتاب 'دستنبو' میں پائے جانے والے خود نوشت سوانحی عناصر پر روشنی ڈالی ہے اور اس دور کے اہم شاعر وادیب سید ظہیر الدین حسین دہلوی کی آپ بیتی 'داستان غدر' کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی سعی کی ہے۔

برصغیر کے اردو کے چند ادبا اور شعرا نے اپنی داستان حیات منظوم بھی تحریر کی ہیں۔ ان میں اہم نام حمایت علی شاعر، رشیدہ عیاں، ادیب سہیل، فضا اعظمی اور سہیل کاکوروی کے ہیں۔مصنف نے 'خود نوشت سوانح نگاری اور منظوم خود نوشت سوانحی نگارشات' عنوان کے تحت اپنے مضمون میں ان منظوم تخلیقات کا ہیئتی اور فنی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سید وجاہت مظہر نے آگے علاحدہ علاحدہ ابواب میں حکیم احمد شجاع کی 'خوں بہا'، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی 'گرد راہ'، آل احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں'، سعیدہ بانو احمد کی 'ڈگر سے ہٹ کر'، رفعت سروش کی 'پتہ پتہ بوٹا بوٹا'، 'بمبئی کی بزم آرائیاں' اور 'اور بستی نہیں یہ دلی ہے'، شکیل الرحمٰن کی 'آشرم' اور ندا فاضلی کی 'دیواروں کے بیچ' جیسی اہم خود نوشتوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

خود نوشت سوانحی مضمون نگاری بھی خود نوشت سوانحی ادب کے سلسلے کی ایک کڑی مانی جاتی ہے۔ یہ دراصل خود نوشت سوانح حیات ہی کی نسبتاً غیر مکمل اور مختصر شکل کہی جاسکتی ہے۔اس کا بنیادی وصف اختصار ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹر سید وجاہت مظہر: 'خود نوشت سوانحی مضمون اور خود نوشت سوانح حیات میں وہی فرق ہوتا ہے جو افسانے اور ناول میں ہوا کرتا ہے۔' کتاب میں شامل باب بعنوان 'خود نوشت سوانحی مضامین: ایک جائزہ' میں وہ لکھتے ہیں کہ سوانحی مضمون نگار کو کوشش کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی کے کسی ایک پہلو کے بیان ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھے یا پھر چند مخصوص

پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ پیش کردے۔ عام طور پر خودنوشت سوانحی مضمون پڑھنے کے بعد قاری کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وجاہت لکھتے ہیں کہ اردو میں اکثر ادبی رسائل وجرائد میں خودنوشت سوانحی مضامین پر مشتمل خصوصی شمارے شائع کرنے کی مضبوط روایت رہی ہے۔ 1941 میں نیاز فتح پوری کے ماہنامہ 'نگار' کے خصوصی شمارے میں شعرا کے مضامین کے ساتھ ان کے نمائندہ کلام کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ خودنوشت سوانحی مضامین اور شخصی خاکوں پر مبنی جن دیگر ادبی رسائل نے خصوصی نمبر نکالے، ان میں 'نقوش' کے 1964 میں دو ہزار صفحات پر مشتمل، دو جلدوں میں منقسم، 'آپ بیتی نمبر' کی اشاعت، اور صابر دت کے جریدے 'فن اور شخصیت' کے سوانحی اور خودنوشت سوانحی مضامین اور آپ بیتیوں پر مرکوز خصوصی شماروں کی 1980 میں اشاعت تاریخی اہمیت کی حامل مانی جاتی ہے۔ ماہنامہ 'آجکل'، 'نیا دور' اور دیگر رسائل وجرائد نے بھی خودنوشت سوانحی مضمون نگاری پر مشتمل خصوصی شمارے شائع کیے۔ 2016 میں عالمی اردو ادب کے کتابی سلسلے 'دستاویز' میں عہد حاضر کے اہم ادبی ستونوں کے تحریر کردہ خودنوشت سوانحی مضامین منظر عام پر آئے ہیں۔ کتاب کے آخری باب میں مصنف نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خودنوشت سوانحی مضمون بعنوان 'تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ' کا بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر سید وجاہت مظہر کے چند منتخبہ تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو انھوں نے اردو کے خودنوشت سوانحی ادب کے فنی، ادبی، تاریخی اور سماجی تناظرات کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ یہ مختلف ریسرچ اور ریفریڈ جرنلس اور اہم علمی وادبی رسائل وجرائد اور کتابی سلسلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بالیقین، کتاب میں بطور ابتدائیہ شامل، نامور ادیب وناقد سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود اور معتبر محقق وصحافی حقانی القاسمی کے تاثراتی مضامین بھی کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ترتیب

'اسرار گاندھی': ایک منفرد تخلیق کار

مرتب: جاوید نظر

صفحات: 255، قیمت: 300 روپے

پبلشر: رہجان پبلی کیشنز، C-28، کریلی اسکیم، پریاگ راج

مبصر: سیفی سرونجی، سہ ماہی 'انتساب عالمی'، سرونج (ایم پی)

اسرار گاندھی میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ میں نے ان کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں اور 'انتساب' میں بھی چھاپی ہیں۔ لیکن اُن پر لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ منفرد اسلوب بھی رکھتے ہیں اور بے تکلف بھی لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں توازن ہے اور وہ کردار سازی میں بھی مہارت رکھتے ہیں، جس طرح ہر لکھنے والے کا اپنا ایک الگ انداز ہوتا ہے اسی طرح ہر قاری کی پسند بھی جدا ہوتی ہے۔ کسی کو کہانی کا پلاٹ پسند آتا ہے، کسی کو ڈائلاگ، کسی کو کردار وغیرہ۔ جس افسانہ نگار میں تمام خصوصیات ہوں وہ قاری کا پسندیدہ افسانہ نگار بن جاتا ہے اور جو تخلیق کار اپنے قاری کا حلقہ وسیع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ یقیناً بڑا فنکار بن جاتا ہے۔ اسرار گاندھی کے افسانے پڑھنے والوں کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ناقدین کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ اپنے فن پر عبور حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے ان پر لکھنا شروع کیا تو اتنے مضامین لکھے گئے کہ ایک ضخیم کتاب ترتیب دی گئی۔ ان مضامین کو ترتیب دے کر جاوید نظر نے 'اسرار گاندھی ایک منفرد تخلیق کار' کے عنوان سے شائع کیا۔ پونے تین سو صفحات کی اس کتاب میں کم از کم 25 قلم کاروں کے مضامین، اسرار گاندھی کے چند منتخب افسانے رنگین تصاویر کے ساتھ شامل ہیں۔ شمیم حنفی، خورشید اکرم، علی احمد فاطمی، رحمٰن عباس، غضنفر علی، بشیر مالیرکوٹلوی جیسے کئی معتبر ادیبوں نقادوں نے لکھا ہے۔ طارق چھتاری لکھتے ہیں:

''اسرار گاندھی ہمارے عہد کے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانے کے روایتی فن سے حسب ضرورت استفادہ کرتے ہوئے اپنا مخصوص انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی جدید زندگی کی عکاسی نہایت فنکاری کے ساتھ کی ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان تخلیقی بھی ہے اور پر اثر بھی۔''

ارجمند آرا لکھتی ہیں: ''اسرار گاندھی ایک ترقی پسند ادیب ہیں اور ترقی پسند تحریک کے اس دور کے نکتہ چیں جب ادب کے بعض ارباب اختیار، ادیبوں کے سوچوں پر پہرے بٹھا رہے تھے اور مختلف ادیبوں کو اندر سے باہر کر رہے تھے۔ یہ بھی چھوٹی سطح پر ایک آمرانہ فکر کے غماز تھے اور ان کے عہد اختیار میں دائرے کے اندر کے بہت سے ادیب گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اس صورت حال پر ناقدانہ نظر رکھتے ہوئے اسرار گاندھی نے ایک بیباک لیکن رمزیہ افسانہ اردو ادب کو دیا ہے۔ اس وجہ سے اس کی معنویت اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔''

اسی طرح دیگر لکھنے والوں نے اسرار گاندھی کے افسانوں سے متعلق لکھا ہے اور انھیں اس عہد کا ایک اہم افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ کسی نے ان کے اسلوب پر روشنی ڈالی ہے، کسی نے ان کے افسانوں میں زندگی کی عکاسی کی بات کی ہے تو کسی نے ان کے افسانوں کا کھل کر تجزیہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسرار گاندھی ہمارے عہد کے ایسے سچے فنکار ہیں کہ زندگی کی بے شمار تلخیوں کو کہانی بنا کر جب پیش کرتے ہیں تو کہانی ہمارے ذہن ودل کے گوشوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ سیاست اور جوڑ توڑ سے دور رہ کر صرف اپنی تخلیقی قوتوں کے بھروسے اسرار گاندھی نے یہ کامیاب سفر طے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تمام معتبر قلم کاروں نے ان پر بیباکی سے لکھا ہے اور انھیں اس عہد کا بڑا فنکار تسلیم کیا ہے۔

ادب اطفال

قومی ستارے

مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 96، قیمت: 50 روپے

ناشر: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: حسن محمود، صدر مدرس، فاطمہ اُردو ہائی اسکول، جماعت خانہ چنچے واڑی، مومن پورہ، گلبرگہ۔ 585104 (کرناٹک)

زیر نظر کتاب 'قومی ستارے' میں بین الاقوامی شہرت ومقبولیت یافتہ شخصیات جن کا تعلق ہندوستان کی جدوجہد آزادی، تعلیم، سیاست وسماج، زبان وادب اور

صحافت سے تھا اور جو اپنے میدان کی نمائندہ شخصیات تھیں، اُن کی حیات اور خدمات سے متعلق نہایت سادہ مگر عمدہ انداز میں پندرہ شخصیات پر مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اُن نمائندہ شخصیات میں راجارام موہن رائے، سر سید احمد خان، مہاتما جوتی راؤ پھلے، حکیم اجمل خان، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر رادھا کرشنن، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر، ڈاکٹر ذاکر حسین جہاں شامل کتاب ہیں، وہیں سروجنی نائیڈو اور اندرا گاندھی پر مضامین خواتین رہنماؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ شخصیات کے علاوہ بھی اور کئی ایسی شخصیتیں موجود ہیں جن پر لکھا جاسکتا تھا لیکن مشمولہ شخصیات کا انتخاب صاحب تصنیف کا اپنا ذاتی انتخاب ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ تمام اپنے اپنے میدان کے نمائندہ شخصیات ہیں۔

کتاب 'قومی ستارے' میں غضنفر اقبال نے جن ستاروں کی بزم سجائی ہے اس میں شامل ہر ایک ستارہ اپنے آپ میں ایک کہکشاں کی مانند ہے۔ مذکورہ شخصیتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں اور نہ ہی ان پر پہلی بار لکھا گیا ہے۔ تاہم غضنفر اقبال کی یہ تصنیف ان معنوں میں منفرد ہے کہ انھوں نے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں بچوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہانی کے انداز میں ان شخصیات سے متعلق مضامین قلم بند کیے ہیں۔ یہ کتاب خصوصاً بچوں کے لیے ایک بہترین تحفے سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال نے 'قومی ستارے' میں ہمارے ملک کے نہایت روشن ستاروں کی روشنی کو خوبصورتی کے ساتھ بکھیرا ہے۔ اور نونہالوں کو اس روشنی سے مستفید ہونے کے لیے نہایت سادہ اور دلنشیں انداز اختیار کیا ہے۔ امید ہے یہ کتاب بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی نہایت معلومات افزا ثابت ہوگی۔ مجھے قوی امید ہے کہ مستقبل میں اسکولی نصاب کے لیے اس کتاب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ جناب رؤف صادق (ممبئی) کا بنایا ہوا کتاب کا سرورق جاذبِ نظر اور عنوان کی ترجمانی کرتا ہے۔ انھیں کا مندرجہ ذیل شعر کتاب کی معنویت کو مزید ابھارتا ہے۔

زمیں آسماں تک ہیں روشن جو سارے یہ قومی ستارے ہیں قومی ستارے

جناب ساجد حمید (شموگہ) کے 15 منفرد خاکے ہیں، جو کتاب کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔

فکشن

آسمان منزل (ناول)

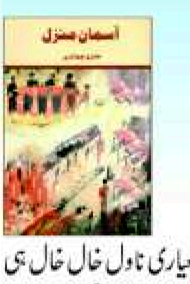

مصنف: طارق چھتاری

صفحات: 211، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ریختہ پبلی کیشن بی 37، سیکٹر 1، نوئیڈا۔ 211301 (یوپی)

مبصر: اسد رضا، F-97، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی۔ 110025

اردو ہی میں نہیں بیشتر اہم عالمی زبانوں میں منفرد معیاری ناول خال خال ہی منظر عام پر آتے ہیں لہٰذا معروف فکشن نگار پروفیسر طارق چھتاری کا پر فکر اور پر مغز ناول 'آسمان منزل' کا مطالعہ کرکے از حد مسرت ہوئی کیونکہ زیر بحث ناول عام ناولوں کی روایتی لیک سے ہٹ کر ہے:

''یہ ناول چھ ابواب میں منقسم ہے جن کے عنوانات بھی منفرد ہیں مثلاً پہلے باب کا عنوان ہے مکان کا سایہ، دوسرا باب چندا کی سرائے تیسرا فرش بازار جبکہ چوتھے باب کا نام ہے گڑھی بہلول پور، پانچواں باب منزل منزل سفر اور آخری یعنی چھٹا باب ہے فلک پیا ناول میں انگریزی دورِ حکومت، جاگیردارانہ معاشرہ اور تقسیم ہند کے بعد کے انقلابات اور واقعات کی عکاسی دلچسپ جزئیات نگاری کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاری ہر دور میں رخشِ تصور پر سوار ہوکر پہنچ جاتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

ولی قلندر شاہ کے مزار کی منظر کشی کرتے ہوئے ناول نگار رقمطراز ہے ''چاروں کونوں میں رکھے عود سوز احاطے کی سحر آگیں فضا میں سرمئی دھوئیں کا جال بن رہے تھے، عقیدت مند مزار پر اگربتیاں جلاتے، کچھ لوگ کپڑے کچھ پھولوں کی چادریں چڑھاتے اور صحن میں آکر بیٹھ جاتے، کیا ذات پات، مذہب ملت اور کیسے بھید بھاؤ؟ واہ ولی قلندر شاہ ہر جمعرات کو یہی نظارہ ہوتا ہے۔''

مصنف نے اس ناول میں ہر دور کے کرداروں، ذہنی حالات، معاشرہ، تہذیب، میلوں ٹھیلوں، محلوں حویلیوں اور عام گھروں، رسم و رواج سب کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں اور ناول کو پڑھتے ہوئے ہم اسی دور میں پہنچ جاتے ہیں جیسے مرزا عاشق علی بیگ، کنور مکرم علی خان اور راجہ تیغ بہادر، شمس، سکینہ، صبا وغیرہ اپنے اپنے دور کے نمائندے ہیں نیز انھیں کرداروں کی مدد سے طارق چھتاری نے نئی اور پرانی تہذیبوں کے درمیاں تصادم کی تصویر کشی کی ہے جس کی وجہ سے ناول کا ہیرو شمس ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس ناول کا بین السطور پیغام یہ بھی ہے کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور پروفیشنلزم و صارفیت کے دور میں بھی اپنے ماضی، ادب، موسیقی و فنون سے کنارہ کشی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کے بغیر انسان ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ طارق صاحب نے اپنی اس تخلیق میں بازیگروں و ہیجڑوں اور طوائفوں وغیرہ کا بھی تذکرہ شائستہ انداز میں کیا ہے۔ مصنف نے ناول کے دوسرے باب میں تزک جہانگیری اور انڈیا ٹوڈے ہندی میں چھپے ہوئے مواد سے بھی جزوی طور پر استفادہ کیا ہے مثال کے طور پر وہ ناول کے ص 40 پر رقمطراز ہیں:

''جہانگیر بادشاہ ہودے سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا اور بائیس ہرن شکار کیے۔ خان اعظم کو حکم دیا ان کھالوں کی جانماز بنوا کر خیمہ خاص میں بچھوا دی جائیں مابدولت کی سواری فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوگی۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ نجومیوں نے کوچ کا جو وقت مقرر کیا تھا اس سے دو گھڑی پہلے اگلے پڑاؤ کے مخبر نے کارواں سالار کی خدمت میں حاضر ہوکر اطلاع دی کہ سرحدی علاقے میں شورش پھیل گئی ہے۔ اسباب ہیں امیر کے وہ اعمال و افعال جو فقط بادشاہوں کو زیب دیتے ہیں۔''

اس طرح ناول نگار نے کہیں کہیں داستانوی انداز بیان اختیار کیا ہے جو ناول کو مزید دلچسپ بنا دیتا ہے اسی طرح پانچویں باب 'منزل منزل سفر' کے صفحہ 175 پر طارق چھتاری 'آسمان منزل' کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آسمان منزل دراصل وہ کوٹھی ہے جسے برطانوی دور حکومت میں شہر کی ایک مشہور شخصیت برج لعل شاعر نے تعمیر کرایا تھا دولت ورثے میں پائی تھی۔ فارسی زبان کے دلدادہ تھے اور شاعری اردو میں کرتے تھے۔ ادبی مجلسوں میں شرکت کرنا اور خود محفلیں آراستہ کرنا ان کا شوق تھا اسی شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے آسمان

منزل میں ایک کلب قائم کیا تھا۔ اس میں میوزک ہال اور ڈانس فلور کے علاوہ ایک کتب خانہ بھی تھا۔''

'آسمان منزل' اگرچہ کامیاب اور مقبول افسانہ نگار پروفیسر طارق چھتاری کا پہلا ناول ہے تاہم مواد، تکنیک اور زبان و بیان نیز زمان و مکان اور کرداروں کے لحاظ سے یہ منفرد ناول ہے۔ اسی لیے اردو کے عالمی شہرت یافتہ ادارہ ریختہ نے اسے نہایت آب وتاب سے چھاپا ہے۔ ریختہ اور ناول نگار دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شاعری

قطعاتِ مجذوب

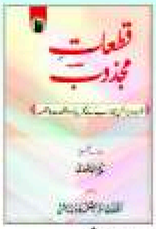

تالیف: ندیم احمد انصاری

صفحات: 198، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: طاہرہ خاتون، B005، نزمن وشواس، نزمن نگر، نیلے مورے نالاسوپارہ ویسٹ، ضلع پال گھر، مہاراشٹر: 401203

'قطعاتِ مجذوب' خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے تقریباً دو سو قطعات کا مجموعہ ہے۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی کے معاصر ہیں۔ ان کا نام اور کلام علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ خصوصاً تصوف وسلوک سے تعلق رکھنے والے حضرات ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے مطابق ''خواجہ صاحب فطری شاعر تھے، شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا، وہ صرف تلمیذ الرحمٰن تھے، اول تو شاعری کا سنجیدہ فطری مذاق اور ذوقِ سلیم اور اس پر تصوف کی چاشنی اور اس میں بھی جگ بیتی نہیں بلکہ اپنی کہانی، سب مل ملا کر ان کی شاعری اپنے زمانے کی شاعری کا بے مثال نمونہ تھی۔ زیادہ تر غزل کہتے تھے۔ غزل کی زبان کے ساتھ خیالات کی لطافت عجیب چیز تھی۔''

خواجہ عزیز الحسن مجذوب نہایت زود گو اور پُر گو شاعر تھے، لیکن اب تک ان کا کلام فقط تین مجموعوں میں شائع ہوا ہے: (1) مجذوب اور ان کا کلام، مرتبہ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی (2) کشکولِ مجذوب، مرتبہ مولانا ظہور الحسن کسولوی (3) گفتۂ مجذوب، مرتبہ ڈاکٹر سوز شاہجہاں پوری۔ قطعاتِ مجذوب کا ماخذ آخرالذکر دو مجموعے ہیں۔ یہ قطعات ان مجموعوں میں چیدہ چیدہ درج تھے، ندیم احمد انصاری نے ان مجموعوں کو از اول تا آخر کھنگال کر تمام قطعات کو یکجا کیا، تکرار کو حذف کیا، شعروں اور مصرعوں کی نوک پلک درست کی اور جدید اصولِ تحقیق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مفید مجموعہ تیار کر دیا۔ اکثر قطعات دونوں مجموعوں میں موجود تھے، لیکن بعض کسی ایک میں تھے اور دوسرے میں نہیں۔ یہ قطعات معنوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہیں، اس لیے کہ ان میں روحانیت کا عنصر غالب ہے۔

قطعاتِ مجذوب کی تالیف وترتیب کے متعلق ندیم احمد انصاری نے لکھا ہے کہ اس کے لیے انھوں نے 'کئی ماہ تک مسلسل محنت کی ہے، اس کا اندازہ حاشیے کے مطالعے سے ہوسکتا ہے'۔ کتاب اور حواشی کے مطالعے سے یہ بات واقعی درست معلوم ہوتی ہے۔ ہر ہر قطعے کے ایک ایک مصرعے کو انھوں نے دونوں مجموعوں میں تقابل کے بعد درج کیا ہے اور ناگزیر صورتِ حال میں عروضی اور قیاسی تصحیح بھی کی ہے۔ چار مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(1) قطعاتِ مجذوب، ص: 41 پر ایک قطعہ اس طرح مرقوم ہے۔

مترس از بلائے کہ شب درمیان است — یہ پڑھ کر نہ سو شب بھر آرام ہی سے
ارے کوچ تو صبح ہونے پہ ہوگا — مگر فکرِ توشہ تو کر شام ہی سے

اس کے حاشیے میں وہ لکھتے ہیں: کشکولِ مجذوب (ص: 243) میں دوسرے مصرعے میں 'پڑھ' کی جگہ 'کہہ' اور تیسرے مصرعے میں 'تو' کی جگہ 'گو' ہے۔

(2) قطعاتِ مجذوب، ص: 51 پر ایک قطعہ اس طرح درج ہے۔

طبیعت کی رو زور پر ہے تو روک — نہیں تو یہ سَر سے گزر جائے گی
ہٹا لے خیال اس سے کچھ دیر کو — چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی

اس کے حاشیے میں وہ لکھتے ہیں: کشکولِ مجذوب (ص: 226) میں لفظ 'یہ' حذف ہوگیا ہے، جس سے مصرعے کا وزن سالم نہیں رہا۔

(3) ص: 90 پر ایک قطعہ اس طرح ہے۔

اللہ رے جذب وحیرتِ دیوانہ آج کل — گھیرے ہوئے ہے جاہل وفرزانہ آج کل
مجذوب لو لگائے جو بیٹھا ہے یار سے — اک شمع بن رہا ہے یہ پروانہ آج کل

اس کے حاشیے میں موصوف لکھتے ہیں: گفتۂ مجذوب (ص: 403) میں 'جذبِ حیرت' اور کشکولِ مجذوب (ص: 233) میں 'جذب وحیرت' لکھا ہوا ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے تصحیح وتنقیحِ متن میں ندیم احمد انصاری کی باریک بینی اور جاں فشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے فقط چار پر اکتفا کیا گیا ہے۔

'قطعاتِ مجذوب' کی ابتدا میں تقریباً بائیس صفحات کا وقیع مقدمہ بھی درج ہے، اس میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی شخصیت وشاعری، اردو میں قطعہ نگاری اور خواجہ صاحب کی قطعہ نگاری وغیرہ پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ بہ ذاتِ خود قابلِ مطالعہ ہے۔

ابتدائے کتاب میں تمام قطعات کے پہلے مصرعے کو لے کر فہرست بھی مرتب کر دی گئی ہے، اس کی مدد سے کسی بھی قطعے تک رسائی آسان ہوگئی ہے۔ مقدمے کے بعد پہلے اردو اور آخر میں فارسی قطعات درج کیے گئے ہیں۔

کُل ملا کر یہ کہ 'قطعاتِ مجذوب' علمی وادبی، تحقیقی وتنقیدی نقطۂ نظر سے ایک بہترین کاوش ہے، امید ہے کہ باذوق قارئین اس سے محظوظ ہوں گے۔ اردو زبان و ادب میں اس طرح کی محنت کرنے والے محقق اب کم نظر آتے ہیں، اس لیے مؤلف ومرتب کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

احساس کی خوشبو

شاعر: بہار الہ آبادی

صفحات: 144، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: اجے بھارتی پرکاشن، مٹھی گنج، مایا پریش روڈ، پریاگ راج

مبصر: توصیف بریلوی

البرکات کالج آف گریجویٹ اسٹڈیز، علی گڑھ یوپی – 202122

'احساس کی خوشبو' جناب بہار الہ آبادی کا شعری مجموعہ ہے جس میں 50 غزلیں اور محض 4 نظمیں شامل ہیں۔ ان غزلوں سے پیشتر بہار الہ آبادی نے اپنی غزل گوئی

کی ابتدا کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اس کے بعد تین اور حضرات پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر راشد طراز اور خلیق الزماں نصرت صاحب کے تاثرات بھی بہار صاحب کی غزل گوئی پر شامل کیے گئے ہیں۔ بہار الہ آبادی کا اصل نام ڈاکٹر اجے مالوی ہے اور اردو کے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادب میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

'احساس کی خوشبو' میں انھوں نے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار صنف غزل کے ذریعے میں بخوبی کیا ہے۔ یوں تو غزل کا مطلب ہی ہے 'سخن با یار گفتن' یعنی محبوب سے محبت کی باتیں کرنا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ غزل محض عشق و محبت کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں رہی بلکہ اس میں معاشرے کے دیگر مسائل بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ اس طرح غزل کا دامن وقت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا گیا اور بڑے بڑے شاعروں نے غزل کے موضوعات میں تبدیلی کی اور اس میں طرح طرح کے مضامین باندھے۔ یوں بھی غزل جیسی صنف سخن کی بقا کے لیے یہ طریقہ بہت ہی کارآمد رہا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ غزل میں دنیا کا ہر موضوع پیش کر دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر اجے مالوی نے ایک طرف جہاں اپنی غزلوں میں عشق و محبت اور روایتی موضوعات پیش کیے ہیں تو دوسری طرف ان کی غزلوں میں دیگر نئے موضوعات یا غزل کے مزاج کے برخلاف موضوعات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گریباں چاک یا دامن بھی تار تار نہیں   مرے نصیب میں اب تیرا انتظار نہیں
بھلا رہا تھا تری بے وفائیوں کو میں   مگر لگا کہ مجھے اس پہ اختیار نہیں

ان دونوں اشعار کو پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی اشعار غزل کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

معروف شاعر کرشن کمار طور بہار الہ آبادی یعنی ڈاکٹر اجے مالوی کے متعلق رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر اجے مالوی کی غزلوں کا ایک بڑا وصف ان کا فطری دھیما پن ہے۔ ان کی غزلوں میں غنائیت کی حسن آمیزی ہے اور ان کے الفاظ کا چناؤ اور شعروں کا دروبست ایسا ہے کہ کہیں بھی بیگانے پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ وہ ظاہر و باطن کی دیکھی اور ان دیکھی باتوں کو ایسی خلاقانہ انداز میں ظاہر کرتے ہیں کہ نتیجہ سرشاریت سے بھرپور نکلتا ہے۔ ڈاکٹر اجے مالوی تخلیق کا ایسا پیکر بنتے ہیں، وہ کیفیات کا ایسا خارجی وجود تراشتے ہیں جو ان کی غزلوں کے نفس مضمون سے یکسر میل کھاتا ہے۔'' (کتاب ہٰذا)

غزلوں کے علاوہ چار نظمیں بھی 'احساس کی خوشبو' کا حصہ ہیں جن کے عنوان ہیں:

امن، کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے، رات اور جوگن اور 'تنہائی اور یادیں' وغیرہ۔ ان آزاد نظموں میں روانی اور معنی خیزی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ نظمیں شدید تنہائی اور جدائی کے احساس سے مملو نظر آتی ہیں اور ان کی معنی خیزی اور اختصار ان کو مقبول بنانے میں اہم کردار کرتا ہے۔ نظم 'کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے' سے ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے   دیکھ کر یوں نکل جاتے
جیسے جاتے ہیں راہ میں یہ اجنبی لوگ   نہ ہوتی ہے خوشی ان کو ملنے کی
کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے   نہ ہوتا ہے غم ان کو بچھڑنے کا

نظم کے اس حصے میں اس درد و کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو بقیہ نظموں میں بھی شامل ہے۔ نظم 'امن' کی نوعیت دوسری ہے لیکن اس میں بھی ایک قسم کی روانی اور آزادانہ انداز قابل توجہ ہے۔

اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ بہار الہ آبادی کی غزلیہ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں بھی کشش ہے اور وہ خود کو پڑھوانے کی قوت خود میں رکھتی ہیں۔ بلاشبہ مذکورہ مجموعے میں بہار صاحب کی چار ہی نظمیں شامل ہیں لیکن امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے ساتھ ساتھ پر لطف نظموں سے بھی محظوظ کرواتے رہیں گے۔

جھریاں

شاعر: شکیل شفائی

صفحات: 192، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: دیو پربھا پرکاشن،

مبصر: سلیم انصاری، HIG3، آنند نگر

ادھارتال، جبل پور۔ 482004 (مدھیہ پردیش)

شکیل شفائی عرصۂ دراز سے گیسوئے سخن کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ اب سے تقریباً دو دہائی قبل انھوں نے سابق صدر جمہوریہ ہند عزت مآب اے پی جے عبدالکلام کی انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے کتابی شکل میں میرا سفر کے نام سے شائع کرایا تھا جسے حسب توقع خاطر خواہ پزیرائی حاصل نہ ہو سکی، قارئین و ناقدین کی اس عدم توجہی اور تغافل کا افسوس شکیل شفائی کو بہت رہا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے جس نے شکیل شفائی کو اپنی شاعری کے کلیات کی اشاعت سے روکے رکھا ہے۔ دیکشت دکوری، معین اختر انصاری اور بسنت چودھری (نیپال) جیسے مخلص اور بے غرض دوستوں کی خواہش، کوشش اور اصرار پر انھوں نے اپنی شعری کلیات سے منتخب غزلوں کی اشاعت پر رضامندی ظاہر کی جسے خود ہی جزوی شعری مجموعے سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا یہ انتخاب ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے لہٰذا امید کی جا سکتی ہے کہ اس انتخاب میں شامل غزلیں ادب کے سنجیدہ قارئین کے ایک وسیع حلقے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گی۔

شکیل شفائی کی شاعری میں کسی فلسفے یا بہت گہری فکر کی تلاش بے سود ہے، اپنی زندگی کے طویل شعری سفر میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کے علاوہ بھی تجربات اور مشاہدات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی سلیقہ مندی اور سادگی ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے مزاج اور اس کے روایتی ڈکشن نیز اس کے فکری نظام کی اساس سے بخوبی واقف ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں تہذیبی قدروں کے انحطاط اور معاشرے کے ایک عام آدمی کے مسائل و مصائب کو تخلیقی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہی نہیں ان کے یہاں زندگی سے مکالمہ کرنے کی حوصلہ مندی بھی ہے اور اپنے عہد کے زخموں پر مرہم رکھنے کی آرزومندی بھی۔ شکیل شفائی سے میرے تعلقات تقریباً چار دہائیوں کے طویل دورانیے پر محیط ہیں۔ لہٰذا میں ان کی شاعری کے تخلیقی عمل کے داخلی نظام کے بارے میں یہ کہنے میں حق بجانب

ہوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کو زندگی اور اس کے انسلاکات کا معتبر حوالہ بنا دیا ہے۔ مزاجاً درویشانہ اور قلندرانہ صفت رکھنے کے باوجود ان کے یہاں انحراف واحتجاج کے جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ میں اپنے اس خیال کی تائید میں چند اشعار بطور حوالہ پیش کرتا ہوں۔

ہر عمل کا تو کوئی ردعمل ہوتا ہے　　　اس نے پر نوچ لیا تب مرے شہپر نکلا
پلٹ کے آئے تو پایا نہ آشیانے کو　　　نکل گئے تھے بہت دور آب و دانے کو
عجیب ردو بدل آگیا رویوں میں　　　جو محترم ہیں کبھی احترام کرتے تھے
میں اپنا قتل یوں نظر انداز کر گیا　　　اس حادثے سے جیسے مرا واسطہ نہ ہو
بے ثباتی کا ابھی اپنی یقیں آیا کہاں　　　اے ہوا ہم خاک کے پتلوں کو چھوکر دیکھنا
آدمی انسان کے معیار سے کم تر ملے　　　دورِ حاضر میں ہمیں انسان بھی پتھر ملے

ان اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شکیل شفائی کی شعری سوچ کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ وہ زندگی کے صحت مند رویوں کے شاعر ہیں، وہ انسانی ہمدردیوں اور نظم وضبط کے شاعر ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک قابلِ ذکر حصہ محکمۂ دفاع کے سخت ترین اصول وضوابط کے زیر اثر گزارا ہے جس کے واضح اثرات ان کی شاعری میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی اس جزوی کلیات یعنی زیرِ نظر شعری مجموعے جھریاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ ان کی شاعری کو کسی ازم، تحریک یا کسی بھی طرح کی نظریاتی وابستگی کے فریم میں فٹ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی شاعری پر قدیم وجدید کا ٹھپہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ بس وہبی شاعر ہیں بے غرض اور بے لوث، اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مشقِ سخن میں ہنوز مصروف، اپنے زخموں کو کھرچ کر روشنی کشید کرنے والا شاعر۔ ان کے ہر ایک شعر میں عصری شعور وآگہی کا عکس جھلکتا ہے یعنی ان کے یہاں رومانی خیالات کا فقدان صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ کہ شکیل شفائی کے یہاں بعض اشعار میں اجتماعی شعور کی رو کا احساس ہوتا ہے اس کے علاوہ تلمیحاتی فکر کے واضح اشارے بھی ان کی غزلوں میں ملتے ہیں۔

فرشتو! تم ہی بتلاؤ اب اس انسان کا رتبہ　　　جو پیچھے قافلے کے آئے اور سالار ہوجائے
کچھ نہ ہو پاس تو اس طور سے صدقہ کرنا　　　اپنے ماں باپ کو شفق سے نہارا کرنا

مجھے اندازہ ہے کہ شکیل شفائی کی شاعری تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے، انھوں نے بے شمار غزلیں کہی ہیں اور بقول ان کے ان کی کلیات کا مسودہ بھی کتابت شدہ محفوظ ہے اور اشاعت کا منتظر بھی۔ جسے وہ شائع کرنے سے اس لیے بھی گریزاں ہیں کیونکہ وہ اپنی ترجمہ شدہ کتاب میرا سفر کے حشر سے مایوس ہیں۔ ایسے میں ان کی غزلوں کا یہ انتخاب بھی غنیمت ہے کیوں کہ ان غزلوں کے مطالعے سے ہمارے ناقدینِ شعروادب ان کی تخلیقی قدر و قیمت کا تعین کرسکیں گے۔ ■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:　　　دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کے ’خبرنامہ‘ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔ یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

معیاری مواد اور اس کی پیشکش قومی اردو کونسل کی ترجیحات میں شامل: ڈاکٹر شمس اقبال

ایف آئی پی کی طرف سے قومی اردو کونسل کو بک پروڈکشن میں ایکسی لینس ایوارڈ

نئی دہلی: دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز کی طرف سے قومی اردو کونسل کو بک پروڈکشن میں ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کے لیے ایکسی لینس ایوارڈ 2024 سے نوازا گیا ہے۔ دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز تقریباً 9 زمروں میں ہر سال قومی سطح کا ایکسی لینس ایوارڈ دیتی ہے۔ اس بار جرنلس اینڈ ہاؤس میگزین زمرے میں قومی اردو کونسل کے ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کو دوم انعام سے نوازا گیا ہے۔ اول انعام سنسکرت کے سمسکریتا پرتیبھا کو دیا گیا جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہوتا ہے اور سوم انعام گجراتی کے ماہنامہ ’یوجنا‘ کو دیا گیا جو پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ایوارڈ دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز کے چوالیسویں تقسیم انعامات کے موقعے پر دیا گیا۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے یہ ایوارڈ پروڈکشن ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ اجمل سعید نے حاصل کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے ایکسی لینس ایوارڈ ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معیاری مواد اور اس کی پیش کش قومی اردو کونسل کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم مواد، تزئین وآرائش اور طباعت و اشاعت ہر سطح پر بہتر سے بہتر معیار قائم کریں۔ طباعت و اشاعت کے باب میں قومی اردو کونسل نے اپنی ایک امتیازی شناخت قائم کی ہے۔ یہاں سے ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کے علاوہ ماہنامہ بچوں کی دنیا، ماہنامہ خواتین دنیا اور ایک سہ ماہی مجلّہ فکر و تحقیق بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی اردو کونسل مختلف علمی، ادبی، سائنسی، تاریخی، طبی اور دیگر اہم موضوعات پر کتابیں بھی شائع کرتی ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2024

'اردو ذریعہ تعلیم اور موجودہ تکنیکی منظرنامہ این ای پی 2020 کے تناظر میں' کے عنوان سے یک روزہ سمینار کا انعقاد

نئی دھلی / بھوپال : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور ریجنل سینٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھوپال کے اشتراک سے مانو ریجنل سینٹر بھوپال کیمپس میں اردو ذریعہ تعلیم اور موجودہ تکنیکی منظرنامہ این ای پی 2020 کے تناظر میں کے عنوان سے یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں خیر مقدمی

کلمات پیش کرتے ہوئے این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ کثیر لسانیت کا دور ہے۔ ہمیں اردو کے ساتھ دیگر زبانوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے اور ان میں اپنی استعداد بہم پہنچانی چاہیے۔ تبھی ہم کامیاب ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سائنسی اور تکنیکی عہد میں ٹیکنالوجی ترقی کی کلید ہے، عصری تقاضوں اور ترجیحات سے ہم آہنگ ہوکر ہی ہم ترقی کے منازل طے کر سکتے ہیں ٹیکنالوجی کی وجہ سے زبانوں کو نئی قوت اور وسعت نصیب ہوئی ہے اور امکانات کے نئے دروازے کھلے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن ریجنل ڈائرکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھوپال کیمپس نے تعارفی کلمات میں کہا کہ ہمیں اردو ذریعہ تعلیم میں معیار پر توجہ دینی ہوگی۔ پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد رجسٹرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونی حیدرآباد اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے آن لائن شامل ہوئے انھوں نے اپنے خطاب میں تفصیل سے این ای پی 2020 کے نفاذ اور اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی، اس موقعے پر کلیدی خطبہ پروفیسر اے آر فتیحی سابق چیئرمین شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج تکنیک کی کار فرمائی زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ ایک بٹن دبانے سے بہت سے امور انجام پا جاتے ہیں۔ اس تکنیک نے بہت سی آسانیاں فراہم کی ہیں لیکن اس سے کچھ نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ ہم ان پر پوری طرح منحصر ہوتے جارہے ہیں۔ اب ہم اپنی ذہانت وصلاحیت کا کم استعمال کر رہے ہیں۔ جن اداروں میں بنیادی سہولیات دستیاب نہیں ہیں وہاں تکنیکی ترقی کا خواب کیسے دیکھا جائے۔ لیکن اس سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے. اے آر فتیحی نے سی بی ٹی اور ٹیکنالوجی کی اصطلاحات اور دیگر تکنیکی تدریسی مواد کو تفصیل سے بیان کیا۔ ڈاکٹر اقبال مسعود سابق ڈپٹی سکریٹری اردو اکادمی، بھوپال نے اس اجلاس کی نظامت کی جبکہ اظہار تشکر قومی کونسل کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے کی۔ چائے کے وقفے کے بعد پہلا تکنیکی سیشن ہوا جس کی صدارت پروفیسر نعمان خان اور ڈاکٹر اقبال مسعود نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر تلمیذ فاطمہ، جناب محمد سادات خان، ڈاکٹر ذکی ممتاز، ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر بھانو پرتاپ پریتم نے مقالات پڑھے جبکہ نظامت ڈاکٹر نیتی دتا نے کی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر توقیر راہی نے ادا کی. ظہرانہ کے بعد دوسرا تکنیکی اجلاس ہوا جس کی صدارت پروفیسر نوشاد حسین پرنسپل سی، ای، ٹی بھوپال نے کی. اس سیشن میں ڈاکٹر اندر جیت دتا، ڈاکٹر ترنم خان، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شیخ عرفان جمیل اور ڈاکٹر شبیر احمد نے مقالات پڑھے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر پروینی پنڈا گلے نے انجام دیے، اس اجلاس کا اختتام جناب محمد سادات خان کے اظہار تشکر پر ہوا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 اکتوبر 2024

قومی اردو کونسل میں ’اردو ذریعہ تعلیم: مسائل وامکانات‘ کے موضوع پر گفتگو

نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام صدر دفتر جسولہ نئی دہلی میں ’اردو ذریعہ تعلیم: مسائل وامکانات‘ کے عنوان سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی کو پدم شری ملنے پر استقبالیہ پیش کیا اور کہا کہ قاضی صاحب کا رشتہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے بہت گہرا ہے۔اردو ذریعہ تعلیم: مسائل وامکانات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو زبان کو مثبت نظریے

سے دیکھنا چاہیے۔اردو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی، لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندی اور انگریزی کے بعد روزگار کے مواقع اردو میں حاصل ہیں۔

مہمان ذی وقار ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اردو اسکولوں کو معیاری بنانے کے لیے اقدام کرنے ہوں گے اور اعلیٰ تعلیم کی طرف دلجمعی کے ساتھ متوجہ ہونا ہوگا۔انھوں نے اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑنے کی وکالت کرتے ہوئے اس سلسلے میں کونسل کے اقدام کی ستائش بھی کی۔انھوں نے بتایا کہ فلم انڈسٹری نے اردو زبان کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

جناب محمد افضل نے کہا کہ اردو زبان آپ کی شخصیت کو پر وقار بناتی ہے اور آپ کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو باہر آکر روشنی پھیلانے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اردو کے الفاظ اور کشش سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان میں قوت اور کشش ہے جو انسان کو سرخرو بناتی ہے۔

جناب محمد عبدالستار نے اردو اخبارات کو بہتر بنانے پر زور دیا۔اس موقعے پر گورننگ کونسل کے ممبران میں محترمہ نازنین انصاری (وارانسی)، جناب عرفان علی عبدالماجد پیر زادے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔جناب ارشد فریدی (دہلی)، ڈاکٹر سید مشیر عالم (اڈیشا)، ڈاکٹر شمشیر سنگھ (جموں وکشمیر) اس پروگرام میں شریک تھے۔قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پروگرام میں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمین) جناب محمد احمد، ریسرچ آفیسر انتخاب احمد، ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر امتیاز احمد (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) کے علاوہ کونسل کا پورا عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اکتوبر 2024

اردو لینگویج لرننگ موبائل ایپ کا مواد تیار کرنے کے لیے دو روزہ ورکشاپ

نئی دہلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام اردو لینگویج لرننگ موبائل ایپ کا مواد تیار کرنے کے لیے دو روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ اردو لینگویج لرننگ موبائل ایپ موجودہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمارا ایپ ملٹی پرپز ہونا چاہیے تاکہ بچے اور بڑے سبھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ آنے والے دنوں میں اس کی اہمیت مزید بڑھنے والی ہے۔ ہمیں مواد عصری تقاضوں اور ضرورت کے مطابق منتخب کرنا چاہیے۔ اگر عالمی معیار کو اپنایا جائے گا تو اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

اس ورکشاپ میں پروفیسر جہانگیر احمد وارثی (چیئر مین شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر غضنفر (علی گڑھ)، ڈاکٹر شمیم احمد (ایسوسی ایٹ پروفیسر، سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر سید تنویر حسین (اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر خان شاہد وہاب (پرنسپل، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول، جسولہ، نئی دہلی)، ڈاکٹر نوشاد منظر (گیسٹ فیکلٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) وغیرہ بحیثیت ایکسپرٹ شامل ہوئے۔

اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب شاہنواز محمد خرم (ریسرچ آفیسر)، محمد افضل حسین خان، افروز عالم، فیضان الحق وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 ستمبر 2024

'ہندی پکھواڑا' کی مناسبت سے ہندی میں مسابقۂ مضمون نویسی پوزیشن لانے والے شرکا کو نقد انعام و توصیفی اسناد سے نوازا گیا

نئی دہلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں 'ہندی پکھواڑا' کی مناسبت سے 24 ستمبر کو ہندی زبان میں مسابقۂ مضمون نگاری کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں کونسل کے مختلف شعبوں سے 14 ملازمین نے حصہ لیا۔ آج قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مسابقے کے نتائج کا اعلان کیا۔ اس موقعے پر پہلی،

دوسری، تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے شرکا کے علاوہ دو شرکا کو تشجیعی انعامات سے بھی نوازا گیا۔ تشجیعی انعام پانچ سو روپے نقد اور توصیفی اسناد کی شکل میں گلشن آنند اور مبشرہ خلیل کو دیا گیا، جب کہ گوروشانڈل نے پہلی، محمد افروز اور فیضان الحق نے دوسری اور مشہود عالم نے تیسری پوزیشن حاصل کی، تینوں کامیاب شرکا کو بالترتیب تین، دو اور ایک ہزار روپے و توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے مسابقے میں کامیاب ہونے والے شرکا کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جو لوگ کامیاب نہیں ہوسکے، وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبانیں ایک دوسرے کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں انھیں ہندی میں بھی دفتری کام کاج کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر کونسل کا عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 ستمبر 2024

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سہ روزہ سمینار

نئی دھلی: علم و دانش کے ارتقا کا سفر ہو یا تہذیب وتمدن کی تاریخ یا پھر تسخیر فطرت سے وابستہ دعوے یہ سب تحقیق کے مرہونِ منت ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر انور پاشا نے ایوان غالب کے بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمینار کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروگراموں میں ریسرچ اسکالر ایک دوسرے کے قریب بھی آتے ہیں۔ سمینار کی صدارت ہندی کے ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی نے کی، انھوں نے کہا کہ تحقیق میں موضوع اور تحقیق کرنے والے کی ہم مزاجی ضروری ہے ورنہ تحقیق کرنے والا ریسرچ کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ریسرچ اسکالر سمینار کا سلسلہ 1999 سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

ریسرچ اسکالرز غالب سمینار کے دوسرے دن ملک و بیرون ملک کے ریسرچ اسکالرز نے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر مشتاق عالم قادری نے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے سمینار میں شرکت سے پہلے اپنی تحریر کو بار بار پڑھیں تا کہ مقالے کی کمیاں ہم پر واضح ہوجائیں۔ اس اجلاس میں جناب محمد فراز خان جناب شاہ رخ عبیر، جناب حسن سعید، محترمہ شہلا کلیم، جناب محمد فیصل اور جناب محمد شبلی آزاد نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب اسعد اللہ نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جناب معصوم مرادآبادی اور پروفیسر ندیم احمد نے کی۔ جناب معصوم مرادآبادی نے صدارتی تقریر کے دوران کہا کہ تحقیق میں دیانت داری بنیادی شرط ہے۔ اگر کسی نے آپ کی مدد کی ہے تو کھلے دل سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ آج کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے میں ماضی کی یادوں میں ڈوب گیا ہوں۔ کیوں کہ 1999 میں جب پہلی بار ریسرچ اسکالر سمینار ہوا تھا تو میں نے اس میں مقالہ پیش کیا تھا۔ اس اجلاس میں جناب محمد نعیم رضا، جناب فیضان الرحمٰن، جناب محمد وسیم حسین بٹ، محترمہ راحیلہ تبسم، جناب رام اگرہ، محترمہ نور افشاں نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ جناب یوسف رضا نے انجام دیا۔ تیسرا اجلاس آن لائن منعقد ہوا جس میں پاکستان سے ریسرچ اسکالرز نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز سمینار کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کون کون سے موضوعات آج کل زیر تحقیق ہیں۔ اس اجلاس میں جناب محمد نصر اللہ، جناب رضا اللہ، محترمہ شائستہ حسن، جناب قاسم حیات، جناب افہام الحسن، جناب عرفان حیدر نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب نوید رضا نے کی۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر شاہینہ تبسم نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ تحقیق کے لیے تحقیقی مزاج ہونا بہت ضروری ہے۔ سندی تحقیق کو اپنی تحقیق کی آخری منزل نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس اجلاس میں محترمہ ساجدہ خاتون، جناب محمد نسیم، جناب غلام قادر، جناب پی الیاس خاں، جناب عرفان انجم نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ محترمہ آصفہ زینب نے ادا کیا۔

سمینار کے تیسرے اور آخری دن چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی پروفیسر سید اختر حسین نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ کہی ہوئی باتوں کو دہرانا تحقیق نہیں ہوسکتی۔ اس اجلاس میں محترمہ رانی حفیظ، جناب حشمت علی، محترمہ رابعہ تبریز، محترمہ غوثیہ کوثر، محترمہ غزالہ شیریں، جناب سید انوار اصفی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب محمد مصطفیٰ نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ارشد القادری نے کی۔ صدارتی تقریر میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ریسرچ اسکالر سمینار سے میری جذباتی وابستگی ہے کیونکہ میں نے پہلا مقالہ اسی سمینار میں پیش کیا تھا۔ اس اجلاس میں ایڈوکیٹ ایم۔ رئیس فاروقی کی مرتبہ کتاب 'طالب رام پوری دانشوروں کی نظر میں' کی رسم اجرا اردو کی اہم شخصیات پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر ادریس احمد، ڈاکٹر ارشد القادری، ایڈووکیٹ عمران ملک کیرانوی، جناب اطہر حسین انصاری کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس اجلاس میں محترمہ ماندانا کلاہدوز محمدی (ایران)، محترمہ ہدیٰ علی (سیریا)، محترمہ فاطمہ سید مدنی، جناب عبدالمہیمن قادری، جناب نور الزماں، جناب احمد حسن نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت

ڈاکٹر مہتاب جہاں نے کی اور نظامت کے فرائض محترمہ عظمت النسا نے ادا کیے۔ اجلاس میں محترمہ محبوب بی، محترمہ سیدہ مریم الٰہی، محترمہ نہاں، جناب امام الدین امام، جناب محمد اعظم نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوبکر عباد نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ سیمینار میں مقالہ پیش کرنا بھی ایک ہنر ہے۔ کوشش کرنا چاہیے کہ موضوع کے لحاظ سے زبان اور انداز اختیار کیا جائے۔ اس اجلاس میں محترمہ سنبل صبیحہ، محترمہ شگفتہ نازنین، جناب شوکت علی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب مصباح الدین نے کی۔ سیمینار کے اختتام پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام مقالہ نگار، صدور، ناظم اجلاس اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 7 اکتوبر 2024

مولوی محمد باقر: شخصیت اور ان کا عہد

نئی دہلی: پریس کلب آف انڈیا (پی سی آئی) کے زیر اہتمام جنگ آزادی کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کی یاد میں 'مولوی محمد باقر: شخصیت اور ان کا عہد' کے عنوان سے یادگاری تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر مشہور مورخ اور دی بروکن اسکرپٹ کی مصنفہ ڈاکٹر سوپنا لڈل نے مولوی محمد باقر کی زندگی پر روشنی ڈالی اور 1857 کی بغاوت کے دوران ان کی قربانیوں کو یاد کیا۔ قابل ذکر ہے کہ مولوی باقر دہلی اردو اخبار کے بانی مدیر تھے۔ سوپنا لڈل نے اس بات پر زور دیا کہ کس طرح مولوی باقر برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کی آواز بن گئے تھے، جس نے 1857 کی بغاوت اور ہندوستانی صحافت کی تاریخ دونوں میں ایک اہم شخصیت بنا دیا۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پریس کلب آف انڈیا کے صدر گوتم لہری نے مولوی محمد باقر کو ہندوستانی صحافت کا علمبردار قرار دیا۔ سینئر صحافی اے یو آصف نے مولوی باقر کی تحقیقاتی اور فیلڈ رپورٹنگ میں شاندار کام کی تعریف کی۔ اس موقعے پر 'مولوی محمد باقر اور موجودہ اردو صحافت' کے عنوان پر مذاکرے کا انعقاد ہوا، جس میں نئی نسل کے تین صحافیوں سہیل اختر قاسمی، محمد تسیم، نیوز 18 اردو کی منزہ شاہ نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت پریس کلب آف انڈیا کے جوائنٹ سکریٹری مہتاب عالم نے کی۔ اس موقعے پر مختلف علوم و فنون سے وابستہ شخصیات کے علاوہ کئی اداروں میں کام کر رہے صحافیوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 ستمبر 2024

خواجہ حیدر علی آتش اور ان کا عہد

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'خواجہ حیدر علی آتش اور ان کا عہد' کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر

رسول نے کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ خواجہ حیدر علی آتش کا شمار نمایاں ترین کلاسیکی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کے میدان میں اپنی مخصوص شناخت قائم کی۔ جدید زمانے میں آتش کی شاعری کو خاص اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ آتش کی شاعری فنی نقطۂ نظر سے جس مرتبے کی ہے اس لحاظ سے اس کے گوشوں پر گفتگو نہیں ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کا فریضہ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر نسیم احمد نے انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کلاسیکی شاعری سے خاص انسیت ہے۔ میں نے مصحفی جو آتش کے استاذ ہیں ان کے دیوان پر کام بھی کیا ہے۔ آتش کی شاعری مجھے بہت متاثر کرتی ہے لیکن وہ ہماری گفتگو کے مرکز میں کم ہی آئے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ''خواجہ حیدر علی آتش اور ان کا عہد' ایک موضوع ہی نہیں بلکہ فریضہ بھی ہے کیونکہ آتش اور دبستان آتش سے اردو شاعری کی ایک توانا روایت وابستہ ہے۔

سیمینار کے دوسرے روز چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر نسیم احمد نے کرتے ہوئے کہا کہ آتش کا کلام ہماری شعری روایت میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور پر کسی شاعر کا مطالعہ صرف اس کے کلام کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے لیکن اصل مطالعہ وہ ہے جس میں شاعر تک آنے والی پوری روایت کا ادراک موجود ہو۔ اس اجلاس میں پروفیسر علیم اشرف، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر ابراہیم افسر، ڈاکٹر شاداب شمیم نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد علوی نے کی اور کہا کہ آتش یا ناسخ کا مطالعہ عام طور پر ایک دوسرے کے موازنے کے بغیر نہیں کیا جاتا، حالانکہ ناسخ اور آتش کا موازنہ ہی غلط ہے یہ رجحان شاید غالب کے اس خط سے پروان چڑھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس قسم کے شعر آتش کے یہاں بیشتر اور ناسخ کے یہاں کمتر ملتے ہیں۔ اس کے بعد سے یہ طریقہ عام ہوگیا کہ ایک دوسرے کے موازنے کے بغیر ان دونوں شاعروں کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ اس اجلاس میں پرفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر سبط حسن، ڈاکٹر عبدالباری نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر علیم اشرف نے کی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ تصوف ہماری شاعری میں روح کی طرح شامل ہے لیکن بعض اوقات شاعر اس سے فاصلہ بھی بناتا ہے۔ ہمیں ان مقامات پر بھی نظر کرنی چاہیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر محمد مقیم نے مقالات پیش کیے۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کی۔ انھوں نے کہا کہ دبستانوں کی تقسیم کو منفی رویہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ دبستان دراصل کسی خطے کے ذوق اور معیار کو نشان زد کرتا ہے، جب اقتدار دہلی کے پاس تھا تو یہاں کا معیار مستند تھا لیکن جب لکھنؤ ایک متبادل قوت کی صورت میں ابھرا تو اس نے اپنے معیار وضع کیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام اور ڈاکٹر امیر حمزہ نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اور 9 ستمبر 2024

ہندی ورکشاپ

نئی دھلی: ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن ابوالفضل انکلیو میں ہندی زبان کی ترقی کے لیے آج ایک روزہ ہندی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ ورکشاپ میں پروفیسر محمد معظم الدین اور ادارہ ہٰذا کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت رضا بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ کے ہندی انچارج ڈاکٹر انور جمال نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے ہندی ورکشاپ کے انعقاد کے مقاصد کو بیان کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر راحت رضا نے انسٹی ٹیوٹ میں ہندی میں ہونے والے کام کی پیش رفت پر ہندی انچارج سمیت تمام عملہ کو مبارکباد دی اور مستقبل میں ہندی میں سو فیصد کام کرنے کی ترغیب دی۔ ورکشاپ کے مہمان مقرر پروفیسر محمد معظم الدین نے 'سرکاری کام کے تکنیکی کاموں میں سادہ ہندی کا استعمال' کے موضوع پر اپنا تفصیلی لیکچر پیش کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائرکٹر نے مہمان مقرر کو یادگاری نشان پیش کیا۔ ورکشاپ کی نظامت ڈاکٹر انور جمال نے کی۔ ڈاکٹر ذکی احمد صدیقی کے شکریے کے ساتھ ورکشاپ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 ستمبر 2024

ساہتیہ اکادمی میں ہندی پکھواڑا

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہندی پکھواڑے کا آغاز کیا گیا۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب میں اکیڈمی کے ڈپٹی سکریٹری کرشنا کمبا ہون نے مہمانان کا

ستقبال کیا، جس کے بعد وزیر داخلہ امت شاہ کا پیغام اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری دیویندر کمار دیولیش نے پڑھ کر سنایا۔ اس پکھواڑے کا افتتاح ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر کمود شرما نے کیا۔ نامور ماہر لسانیات ادے نارائن سنگھ بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔ اپنے افتتاحی خطاب میں پروفیسر کمود شرما نے کہا کہ زبان ایک ایسی سرحد ہے جس میں اس سماج اور برادری کی ثقافت محفوظ رہتی ہے۔ ہم نے اتحاد کی زبان ہندی کو صرف اعداد و شمار کی زبان میں تبدیل کردیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندی تال میل کی زبان ہے، تسلط کی نہیں۔ ہندی زبان کی ترقی کا مطلب تمام ہندوستانی زبانوں کی ترقی ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے ادے نارائن سنگھ نے کہا کہ ہندی کی زبان، جغرافیہ اور زمانہ بہت دلچسپ ہے۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کی زبانوں یا مقامی بولیوں نے ہندی کو بہت زیادہ تقویت بخشی ہے۔ اس موقعے پر اکادمی کے ملازمین کے لیے ایک 'واک' مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں 12 شرکا نے حصہ لیا۔ مقابلے کے جج سینئر صحافی وریندر مشرا تھے۔ شرکا نے سوشل میڈیا پر چھپی ہوئی کتابوں اور ہندی کے مستقبل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت دیویندر کمار دیولیش نے کی اور شکریے کی تحریک ہندی کے ایڈیٹر انوپم تیواری نے پیش کی۔ پروگرام میں ساہتیہ اکادمی کے ملازمین اور افسران موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 ستمبر 2024

نعتیہ شاعری پر ایک روزہ قومی سمینار

نئی دھلی: نعت گوئی مدحت، شعریت اور عقیدت کے منفرد آمیزے سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ نعتیہ

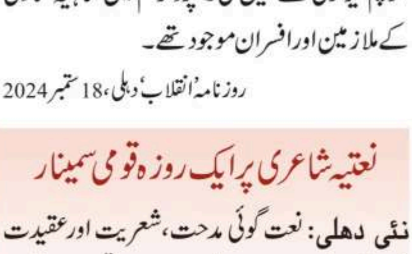

شاعری میں سب سے نازک مسئلہ حقیقت اور تخیل کی حد بندی کا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی کے زیرِ اہتمام 'تیرا وجود الکتاب (صبح تا شام رسالت مآب کے نام)' کے عنوان سے نعتیہ شاعری پر منعقدہ یک روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے پروفیسر سراج اجملی (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کیا۔ مہمانِ خصوصی پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ فارسی اور عربی کی بہ نسبت اردو نعت میں اضطراب کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ادارہ ادب اسلامی ہند کے صدر پروفیسر حسن رضا نے کہا کہ نصب العین، وژن اور مشن کے ٹرانسپوزیشن اور حسن کاری کے لیے کسی بھی تحریک کو ادبی محاذ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ نعتیہ شاعری ایمان بالرسالت کے جمالیاتی اور تخلیقی اظہار سے عبارت ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر سراج احمد قادری نے نعتیہ شاعری کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے نعت ریسرچ سینٹر انڈیا اور مجلّہ دبستانِ نعت کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ استقبالیہ کلمات میں پروگرام 'تیرا وجود الکتاب' کے کنوینر اور ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی کے صدر ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ نعتیہ شاعری روح کی جمالیات کا اعلیٰ وارفع اظہار ہے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی کے سکریٹری مصدق مبین نے انجام دیے۔ اجلاس کا اختتام ماہنامہ پیش رفت کے معاون مدیر ساجد انصاری کے اظہار تشکر پر ہوا۔

بحوالہ قندیل آن لائن ڈاٹ کام

اردو بک ریویو

نئی دھلی: 'اردو بک ریویو' اردو کو جدید تقاضے سے ہم آہنگ کرنے اور تحقیقی شعور بیدار کرنے کی کوششوں میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔'' یہ بات اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال نے اردو بک ریویو کے دفتر میں ویب سائٹ لانچ کے موقعے پر کہی۔ پریس کلب آف انڈیا کے صدر گوتم لہری اور دیگر مہمانان خصوصی کا استقبال کرتے ہوئے عارف اقبال نے 'اردو بک ریویو' کے مقاصد اور خدمات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو بک ریویو کی یہ ویب سائٹ یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل ہونے کے بعد یو جی سی کی خصوصی گزارش پر تیار کی گئی ہے اس ویب سائٹ کو رفتہ رفتہ مزید بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی رہے گی۔ اس تقریب کی صدارت پریس کلب آف انڈیا کے صدر گوتم لہری نے کی۔ اس موقعے پر جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں سینئر صحافی اے یو آصف (ڈائرکٹر پریس کلب آف انڈیا)، سینئر پروفیسر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈی ڈی نیوز کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر ادریس شاہجہانپوری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سید تنویر حسین، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی کے مالک اظہار ندیم، حکیم ڈاکٹر

آفتاب احمد، ریسرچ اسکالرز توحید حقانی اور نازش احمد خاص طور سے موجود تھے۔ پریس کلب کے صدر گوتم لہری نے اردو بک ریویو کی ویب سائٹ لانچ کرنے کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ کئی برسوں سے پریس کلب میں اردو صحافیوں کو ممبر شپ دیتے ہوئے وہاں اردو کو جائز مقام دینے کی کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں معروف اردو صحافی اور مجاہد آزادی محمد باقر (شہید) کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے پریس کلب آف انڈیا، نئی دہلی میں ان کا پورٹریٹ مستقل طور پر آویزاں کیا گیا ہے۔ پریس کلب میں اب ہر سال شہید محمد باقر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے پروگرام بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ گوتم لہری نے یہ بھی عندیہ دیا کہ اردو سے ان کو گہری دلچسپی رہی ہے اور عنقریب وہ اس زبان کو سیکھ کر اردو کی مزید خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ویب سائٹ کے منتظمین میں محمد عمران قنوجی، ندیم عارف اور محمد حنیف نعمانی نے میزبانی کے فرائض ادا کیے۔

روزنامہ 'صحافت' 29 ستمبر 2024

مولوی محمد باقر پر خطبہ

نئی دھلی: 'اردو صحافت میں جرأت اور بے باکی ملک کی تمام زبانوں کی صحافت سے زیادہ ہے اور یہ ان صحافیوں کی قربانیوں کا ثمر ہے جنھوں نے آزادی کی جدوجہد کے دوران اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سامراجی طاقتوں سے لوہا لیا۔' ان خیالات کا اظہار سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے اولین شہید صحافی مولوی محمد باقر کی شہادت کے تناظر میں اپنے کلیدی خطبہ کے دوران کیا۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن (آئی آئی ایم سی) کے ہیڈ کوارٹر میں انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور مولوی مجید حسن جیسے صحافیوں نے پنے اخبارات کے ذریعے مسلسل انگریز سامراج سے لوہا لیا۔ انھوں نے نہ صرف بے مثال قربانیاں پیش کیں بلکہ اردو صحافت کے لیے بھی اعلیٰ معیار قائم کیے۔ کلیدی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے آئی آئی ایم سی میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ویریندر کمار بھارتی نے کہا کہ اس خطبے سے طلبا کو بہت بنیادی اور اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ہم مستقبل میں بھی معصوم مرادآبادی کی خدمات سے استفادہ کریں گے۔ آئی آئی ایم سی میں اردو شعبے کے استاد محمد ثاقب نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''اردو صحافت میں معصوم مرادآبادی کا سفر چار دہائیوں سے جڑا ہے۔ ان کا شمار صف اول کے اردو صحافیوں میں ہوتا ہے۔ اردو صحافت پر ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بعد میں سوال و جواب کا سلسلہ چلا اور طلبہ نے اس خطبے کو اپنے لیے نہایت کارآمد قرار دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 ستمبر 2024

اترپردیش

یادِ متین

میرٹھ: ہم جب اپنے بزرگوں کو یاد کرتے ہیں تو دراصل اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ذکی طارق نے متین طارق باغپتی کی یاد میں آج کی محفل منعقد کر کے بہت اہم فرض کی ادائیگی کی ہے۔ متین طارق اہم کلاسیکی شاعر و ادیب تھے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے متین طارق باغپتی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور متین طارق باغپتی تعلیمی مرکز کے مشترکہ اہتمام میں منعقد 'یادِ متین' پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران کیا۔ پروگرام کی سرپرستی مولانا نورالحسن جب کہ صدارت پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب اور شکریے کی رسم محمد علی علوی نے ادا کی۔ اس دوران ڈاکٹر مستمر کی مرتب کردہ کتاب 'متین طارق کا جہان ادب' کا اجرا بھی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس دوران ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ اس سرزمین نے متین طارق باغپتی جیسی علمی و ادبی شخصیت پیدا کی جن کی ادبی، ثقافتی اور تہذیبی اقدار کو تمثیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے کہا کہ متین طارق ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو نابغۂ روزگار ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ قلندرانہ طبیعت کے حامل رہے اور یہ قلندرانہ اوصاف اور صوفیانہ طرز عمل ان کی شاعری میں بھی جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر نے کہا کہ متین طارق کی تنقیدی تحریروں کو اگر عملی تنقید سے تعبیر کر لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی تنقید میں تاثراتی رنگ کے ساتھ شگفتگی اور انتقاد کے پہلو کارفرما رہتے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ متین طارق باغپتی کا کلام ان کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ اردو تہذیب کا نام ہے، جس تہذیب کو متین طارق باغپتی نے آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر ذکی طارق نے کہا کہ آج مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ گذشتہ چھ ماہ سے میں والد صاحب کی کتاب کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور آج 'یادِ متین' کی صورت میں محنت کا ثمرہ ملا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فرحت خاتون، ڈاکٹر معراج الدین احمد، اسرارالحق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 ستمبر 2024

صولت پبلک لائبریری میں جلسہ تقسیم انعامات

رامپور: صولت پبلک لائبریری کے 90ویں یوم تاسیس کے موقعے پر خصوصی تقریب جشن 90واں یوم تاسیس و جلسہ تقسیم انعامات کا پروقار انعقاد صولت لائبریری کے

حمایت ہال میں ہوا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمود علی خاں صدر صولت لائبریری نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے منے علی انسپکٹر آف اسکول اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے اسرار احمد سابق ضلع تعلیم افسر جلوہ افروز رہے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض فائزہ زبیرہ نے اپنے مخصوص انداز میں ادا کیے۔ یوم تاسیس کی پروقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی منے علی ڈی آئی او ایس نے صولت پبلک لائبریری اور اس کے ذمے داران کو یوم تاسیس کے موقعے پر علمی، ادبی اور ثقافتی مقابلوں کے انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ لائبریری نے طلبا میں خود اعتمادی کا احساس بیدار کراتے ہوئے ان کی ذہنی، علمی، فکری، ادبی اور ثقافتی صلاحیتوں کے جوہر کا مظاہرہ کرنے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ مہمان ذی وقار اسرار احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ تعلیم ہی انسان کی کامیاب

زندگی کا ضامن ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر صولت پبلک لائبریری کے 90 ویں یوم تاسیس پر صدر، سکریٹری اور دیگر ذمے داران کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے بزرگوں کی اس تہذیبی وارثت کے کامیاب تحفظ کی امید جتائی۔ اس سے قبل سکریٹری صولت لائبریری ڈاکٹر عدنان ضیائی نے رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ فی الوقت صولت پبلک لائبریری کے خزانہ کتب میں ساڑھے چھ سو سے زائد مخطوطات اور نوادرات محفوظ ہیں۔ ودوران تقریب صولت لائبریری کے زیراہتمام 90ویں یوم تاسیس کی نسبت سے یکم ستمبر سے جاری مختلف مقابلوں کے نتائج کا اعلان کیا گیا اور مہمانان کے دست مبارک سے کامیاب طلبا و طالبات کوٹرافی، میڈل اور سند امتیاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 ستمبر 2024

غیرملکی زبانوں کی تدریس میں اے آئی اور ڈیجیٹل میڈیا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ غیرملکی السنہ کے زیراہتمام دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'غیرملکی زبانوں کی تدریس میں اے آئی اور ڈیجیٹل میڈیا' کی افتتاحی تقریب کینیڈی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ افتتاحی تقریب میں کانفرنس کے مقالات کی تلخیص پر مبنی 'بک آف ابسٹریکٹس' کا اجراعمل میں آیا۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں فیکلٹی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر محمد اظہر نے کہا کہ دنیا بھر میں طلبہ کی ابھرتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اے آئی کا تعلیم و تدریس کے ساتھ انضمام ضروری ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر راجیو سکسینہ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے طریقہ ہائے تدریس کی تشکیل نو میں اے آئی کے ابھرتے ہوئے کردار کا ذکر کیا۔ انھوں نے اے آئی ٹولز کے ذریعے زبان کی تعلیم و تدریس میں جدید طریقوں کو اپنائے جانے پر زور دیا۔ جے این یو کی سابق استاد پروفیسر مینو بخشی نے روایتی اساتذہ اور اے آئی کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اے آئی ایک طاقتور ٹول ہے، لیکن یہ تعلیم میں اساتذہ کے ناقابل تلافی کردار کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اے ایم یو کے شعبۂ لسانیات کے چیئرپرسن پروفیسر ایم جے وارثی نے زبان کی تدریس کی متحرک اور مسلسل ارتقاپذیر نوعیت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان کی تدریس کو وقت کے مطابق ڈھالنا چاہیے اور جاری ڈیجیٹل انقلاب کے ساتھ، اے آئی زبانوں کی تدریس وتعلیم کے طریقے کو تبدیل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اپنے ورچوئل خطاب میں، ڈاکٹر ایلینا ریمیز ووانے اے ایم یو کے اقدام کی تعریف کی اور زبانوں کی تدریس میں اے آئی اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا ذکر کیا۔ ہندوستان میں چلی کے سفیر جوآن انگولو نے زبانوں کی تدریس میں اے آئی کو ضم کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے چلی کی یونیورسٹیز اور اے ایم یو کے درمیان تعلیمی وثقافتی تبادلے میں تعاون کا یقین دلایا۔ کانفرنس کے سرپرست کی حیثیت سے پروفیسر محمد گلریز نے شعبہ غیرملکی السنہ کی کانفرنس کو بے حد موزوں قرار دیا اور کہا کہ لسانی علوم میں اے آئی کا انضمام تعلیم وتدریس کا منظرنامہ تبدیل کر رہا ہے اور اختراع کے نئے مواقع پیدا کر رہا ہے۔ کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر میوریش کمار نے کہا کہ یہ کانفرنس ہمارے طلبا اور اساتذہ کے لیے اے آئی اور ڈیجیٹل میڈیا میں جدید ترین پیش رفت کی تفہیم میں معاون ہوگی۔ شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز اینڈ نارتھ افریقن اسٹڈیز کی پروفیسر رخشندہ ایف فاضلی نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ تقریب کی نظامت سدرہ احمد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2024

ایم کوٹھیاوی راہی پر خصوصی نشست

گورکھپور: معروف اردو شاعر، افسانہ نگار، ادیب وصحافی ایم کوٹھیاوی راہی کی 19 ویں برسی پر ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ شہر کے حامد علی ہال، آغوشِ حمیدیہ، محلّہ گھاسی کٹرہ میں منعقد ادبی نشست میں ایم کوٹھیاوی راہی کی ادبی و سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ صدارت کر رہے ڈاکٹر محمد اشرف نے کہا کہ ایم کوٹھیاوی راہی مکمل ادیب تھے۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ کی جس صنف میں قلم اٹھایا اسے یادگار بنا دیا۔ ساجد علی میموریل سوسائٹی کے سکریٹری محبوب سعید حارث نے بتایا کہ ایم کوٹھیاوی راہی، فراق گورکھپوری کے ہمعصر تھے۔ راہی صاحب نے جو ادبی ورثہ چھوڑا ہے، نئی نسل کو اس سے روشناس ہونے کی ضرورت ہے۔ پروگرام کی نظامت کر رہے محمد فرخ جمال نے ایم کوٹھیاوی راہی کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا۔ نئی نسل کے افسانہ نگار آصف سعید نے بتایا کہ راہی دبستانِ گورکھپور کی شان تھے، ان کا دفتر اشتراک، ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ محمد انور ضیا نے بتایا کہ ایم کوٹھیاوی راہی ایک بہترین شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، نثر نگار ہونے کے ساتھ ہی بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ ضمیر احمد پیام نے کہا کہ ایم کوٹھیاوی راہی کی نظموں کا کوئی جواب نہیں۔ انھوں نے مجاز لکھنوی پر جونظمیں لکھیں وہ بہت مشہور ہوئیں۔ ان کے ریڈیائی ڈرامے بھی کافی شہرت کے حامل ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 ستمبر 2024

کرشن چندر کی فکشن نگاری

میرٹھ: ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت ہمارے سامنے کتنے کرشن چندر ہیں۔ کیونکہ کرشن چندر نے زمانے میں جو تڑپ محسوس کی اس کو قلم بند کر کے ہم تک پہنچایا۔ کسی بھی ادیب یا فن کار کی سبھی تخلیقات اہم نہیں ہوتیں۔ ہمیں کرشن چندر کو سمجھنے کے لیے خود کو وسیع النظر کرنا ہوگا۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیراہتمام منعقد 'کرشن چندر کی فکشن نگاری' میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کے بطور معروف فکشن ناقد پروفیسر قدوس جاوید سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی نے آن لائن شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور کیرالا سے ڈاکٹر کے پی شمس الدین اور شعبۂ اردو کی طالبات فرحت اختر اور لائبہ نے شرکت کی۔ جب کہ مقرر کے بطور آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین آن لائن موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات شروتی، تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت نزہت اختر اور شکریے کی رسم ڈاکٹر آصف علی نے انجام دی۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ اردو ادب میں کرشن چندر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

ان کی تصانیف تقریباً سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ کرشن چندر کا اسلوب بالکل انوکھا ہے۔ رومانیت کو جو بلندی کرشن چندر نے عطا کی ہے وہ کوئی دوسرا فکشن نگار عطا نہ کر پایا۔ ان کے افسانوں نے قارئین کو رُلایا بھی ہے اور تڑپایا بھی۔ اس دوران لائبہ نے 'کرشن چندر کی ناول نگاری'، فرحت اختر نے 'کرشن چندر کی افسانہ نگاری' اور ڈاکٹر کے۔ پی شمس الدین نے 'کرشن چندر: مایہ ناز فنکار' عنوانات سے بہترین مقالے پیش کیے۔

مہمانِ خصوصی پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ نئی صدی میں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اب نئی چیزیں آ گئی ہیں، نیا اسلوب آ گیا ہے۔ عصمت، بیدی، منٹو اور کرشن چندر وغیرہ پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن سوچنا یہ ہے کہ ہم عصمت، بیدی، منٹو وغیرہ کو کس طرح سے پڑھیں۔ بنیادی طور پر کرشن چندر نے کشمکش کو پیش کیا ہے۔ مذہبی ٹکراؤ، معاشی نابرابری کو ختم کرنے کے لیے کرشن چندر کے افسانے انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں ناولوں اور افسانوں کا فن وسیع اور منفرد حیثیت رکھتا ہے پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ کرشن چندر کو عصر حاضر میں بھی اہمیت حاصل ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 14 اکتوبر 2024

بہار

شکیلہ اختر: علامہ جمیل مظہری یادگاری تقریبات

پٹنہ: اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام بہار ابھیلیکھ بھون، نہرو پتھ، پٹنہ کے کانفرنس ہال میں شکیلہ اختر: علامہ جمیل مظہری مشترکہ یادگاری تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کا آغاز شمع افروز کے ذریعے ہوا۔ پروگرام کے آغاز میں استقبالیہ و تعارفی کلمات اسپیشل سکریٹری بشمول ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹریٹ محمد عمران نے پیش کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈائرکٹر نے کہا کہ افسانہ نگاری میں خاتون افسانہ نگار شکیلہ اختر اور شاعری کے ذریعے علامہ جمیل مظہری نے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری اور شاعری کے ذریعے قومی سطح ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بہار کا نام روشن کیا ہے۔ انھوں نے جو ادبی ورثہ چھوڑا ہے اس کی حفاظت کی ذمے داری نئی نسل پر عائد ہوتی ہے۔ شکیلہ اختر یادگاری تقریب میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ کی صدر شعبہ اردو پروفیسر شائستہ انجم نوری نے کہا کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر نے اپنی خاص شناخت بنائی ہے۔ ڈاکٹر نرجس فاطمہ اور ڈاکٹر نظام الدین احمد نے مقالہ پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات اور کارنامے پر گفتگو کی۔ علامہ جمیل مظہری کے حوالے سے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر کمالی، سابق صدر زیڈ اے اسلامیہ کالج، سیوان نے علامہ جمیل مظہری کے حوالے سے کہا کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر جامع اور بسیط کتابیں لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے عالمی شناخت قائم کی۔ مقالہ خواں میں ڈاکٹر سرتاج سبحانی، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے علامہ جمیل مظہری کی شخصیت اور کارنامے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے مشترکہ طور پر کہا کہ جمیل مظہری اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کی شہرت ان کی زندگی میں ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور انھوں نے ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ تقریب کی نظامت محمد ہاشم اور ڈاکٹر افشاں بانو نے کی۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر محمد عمران کے کلمات تشکر پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2024

اردو مسابقتی سمینار

سوپول: اردو زبان بہت ہی شیریں اور میٹھی زبان ہے، جو محبت کا پیغام دیتی ہے یہ مکمل طور سے ہندوستان کی زبان ہے۔ شیریں اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں مشہور و معروف مقبول بھی ہے، ان خیالات کا اظہار ضلع سوپول کے اقلیتی فلاح و بہبود انچارج آفیسر اردو زبان سیل انوراگ جی نے اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام سوپول کلکٹریٹ کے احاطے میں واقع لہٹن چودھری سبھا گار میں منعقد ضلع سطحی اردو مسابقتی سمینار میں کہیں۔ پروگرام کا آغاز مدرسہ ہاشمیہ پرساہی سوپول کے طالبہ اقلیما فاطمہ اور رافعہ پروین نے بہار گیت پڑھ کے کیا اور نظامت رضوان احمد سکریٹری انجمن ترقی اردو سوپول نے بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اپنے گھروں میں اردو ادب کا ماحول بنانا ہوگا۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں اردو زبان سیل کے لیے اردو مترجم جناب محمد افضل سفید بیگم و دیگر اردو زبان سیل کے کارکنان نے اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 26 ستمبر 2024

'حاشیائی اردو ادب اور شعری نشست' کا ایک منظر

تمل ناڈو

حاشیائی اردو ادب اور شعری نشست

چینئی (ساجد حسین ندوی): ساہتیہ اکادمی اور میاسی اردو اکیڈمی چنئی کے زیر اہتمام ایک روزہ سمپوزیم بعنوان 'حاشیائی اردو ادب اور شعری نشست' کا انعقاد نیو کالج کیمپس میں بتاریخ 19 ستمبر 2024 کو ہوا، جس میں ملک کے نامور ادبا اور شعرا نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر غیاث احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو نیو کالج نے کی۔ میاسی اردو اکیڈمی کے کنوینر جناب محمد روح اللہ صاحب نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور حاشیائی اردو ادب پر مختصر روشنی ڈالی۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی کے اردو اڈوائزری بورڈ کے کنوینر جناب چندر بھان خیال نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا: ہندوستان میں تقریبا 80 فیصد پسماندہ طبقہ ہے اور اس میں سے کچھ ایسے ہیں جو برسوں سے حاشیے پر ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہ اب ہے اور نہ ہی اس سے پہلے کوئی ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں منشی پریم چند نے

سب سے پہلے ان کی آواز بلند کی پھر ترقی پسند تحریک کے بعد بہت سے شعرا اور ادبا نے ان کو اپنا موضوع بنایا۔ میاسی کے معتمد اعزازی جناب الیاس سیٹھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میاسی اپنے قیام سے ہی اردو کی ترقی کے لیے کوشش کررہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ جنوری 2024 میں فری آن لائن اردو کلاسیس کا آغاز کیا گیا جس سے ملک و بیرون ملک کے 500 سے زائد طلبا و طالبات اور عمر رسیدہ مرد و عورت مذہبی تفریق کے بغیر مستفید ہو رہے ہیں اور اردو زبان سیکھ رہے ہیں۔ بنگلور سے تشریف لائے مہمان اعزازی مشہور شاعر جناب ماہر منصور نے شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یوں تو ہندوستان میں بہت سے طبقات ایسے ہیں جو حاشیے پر ہیں لیکن سب سے زیادہ جن کو نظر انداز کیا گیا ہے وہ مخنث طبقہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان سے ملاقات کرکے میں نے ان کی باتیں سنیں اور ان کے درد وکرب کو محسوس کیا اور ان کے بہت سے کنڑ اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ میاسی اردو اکیڈمی کے چیئرمین اور ساہتیہ اکادمی کے اردو اڈوائزری بورڈ کے ممبر جناب اے محمد اشرف نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ: پچھڑے اور پسماندہ لوگوں کو ہمیشہ سے ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ آج یہ سمپوزیم اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ آج سے قبل شہر مدراس میں اس موضوع پر کبھی کوئی سمینار منعقد نہیں ہوا۔ افتتاحی پروگرام کے بعد مقالہ کے سیشن کا آغاز ہوا جس کے پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر امان اللہ صاحب نے کی جبکہ ڈاکٹر سعید الدین، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر شکیلہ غوری اور ڈاکٹر طیب خرادی نے حاشیائی اردو ادب کے حوالے سے مختلف انداز میں مقالے پیش کیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر پروین فاطمہ نے کی جس میں ڈاکٹر غیاث احمد، پروفیسر ساجد حسین، پروفیسر سید باقر عباس اور پروفیسر سید شبیر حسین نے مقالے پیش کیے۔ اخیر میں شعری نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت چندر بھان خیال نے کی اور ملک کے نامور شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جس میں قابل ذکر شاہد مدراسی، کاتب حنیف، اکبر زاہد، اسانغنی مشتاق، صداء الآمری کے نام شامل ہیں۔ اخیر میں ساجد حسین نے جملہ مہمان کرام کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ساجد حسین ندوی، چینئی، 22 ستمبر 2024

راجستھان

مرادسعیدی شخص وشاعر

ٹونک: ٹونک کے کہنہ مشق شاعر جناب مراد سعیدی کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرہ اور سمینار ٹونک کے بیوٹی میرج ہال میں منعقد مشاعرے کی صدارت کے فرائض دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین جناب پروفیسر شہپر رسول نے انجام دیے۔ نظامت مشہور ناظم مشاعرہ معین شاداب دہلی نے کی۔

اگلے دن ہوٹل شیتل میں کل ہند سمینار کا انعقاد دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ سید ساجد علی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ اس سمینار میں نظامت کے فرائض جناب شعور آشنا صاحب نے انجام دیے۔ اس کے بعد سمینار میں تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ارشد عبدالحمید نے مراد سعیدی کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی، اس کے بعد برہان پور سے آئے جناب فیروز کمال نے خیالات کا اظہار فرمایا۔ کوٹہ کے پروفیسر نعیم فلاحی نے اس موقعے پر پُر مغز گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد حیدرآباد سے تشریف لائے ہوئے مقررِ خاص علامہ مسعود احمد صاحب نے بہت ہی جامع تقریر فرمائی۔ آج کے پہلے سیشن کے دیگر مقررین حضرات میں مہمانِ خصوصی جناب شہپر رسول، جناب خالد مبشر، جناب معین شاداب وغیرہم نے اپنے گرانقدر تاثرات سے نوازا۔ اس کے بعد اردو زبان وادب کی خدمات کے صلے میں ادیبوں اور شاعروں کو مراد سعیدی ایوارڈ 2024 سے نوازا گیا۔ ان میں ڈاکٹر رفعت اختر، کیپٹن محمد شمشیر خاں شاہین، مہدی ٹونکی اور شہناز فاطمہ، سید ساجد علی ٹونکی، ڈاکٹر سعادت رئیس، صوفی افتخار الدین اور ڈاکٹر معقول احمد ندیم شامل ہیں۔ ان سبھی کو شال اوڑھا کر اور اکیڈمی کے مومنٹو سے نوازا گیا۔ تقسیم ایوارڈ کے بعد دو کتابوں کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ یہ دونوں ہی کتابیں مراد سعیدی سے متعلق تھیں۔ ایک چار بیتوں کا مجموعہ 'غیرت گلزار' جس کے مرتب ڈاکٹر سعادت رئیس ہیں دوسرا مضامین کا مجموعہ 'مراد سعیدی شخص اور شاعر' جس کے مرتب سید ساجد علی ٹونکی ہیں۔

اس سمینار کے دوسرے سیشن میں پروفیسر خالد محمود صاحب کی زیرِ صدارت مقالات پڑھے گئے۔ ان مقالہ نگاروں میں جناب بدر احمد، جناب ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، ڈاکٹر سعادت رئیس، ڈاکٹر معقول احمد ندیم، ڈاکٹر عمران عاکف، ڈاکٹر صبا نور، محمد باقر حسین، ڈاکٹر فہیم الدین اور جناب سہیل پیامی صاحب شامل ہیں۔

آخر میں صدرِ سمینار پروفیسر خالد محمود صاحب نے صدارتی خطبے سے نوازا، پروگرام کے اختتام پر جناب فہیم الدین خاں سکریٹری مراد اکیڈمی نے سبھی حاضرین جلسہ، مہمانانِ ذی وقار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سمینار کے اختتام کا اعلان کیا۔

رپورٹ: فہیم الدین خاں (سکریٹری مراد اکیڈمی، ٹونک)، 26 ستمبر 2024

مہاراشٹر

انشائیہ اور دیگر اصنافِ ادب

ناگپور: 'برسوں کے ارتقائی سفر کے دوران ادبی اصناف مختلف تبدیلیوں، وسعتوں اور امکانات سے آشنا

ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ادب کے طالبِ علم کے لیے ان اصناف کا جاننا اور فن پاروں کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ بازار میں دستیاب نوٹس پڑھ کر آپ ڈگریاں تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن اپنے اندر ادبی شعور پیدا کرنے کے لیے ادبی تخلیقات اور ان سے متعلق تنقید کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔' ان خیالات کا اظہار معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ نے کیا۔ موصوف وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور، معروف بہ اولڈ مورس کالج کے شعبۂ اردو، عربی اور فارسی کی بزمِ ادبیات کے زیر اہتمام افتتاحی تقریب میں' انشائیہ اور دیگر اصنافِ ادب' کے عنوان کے تحت طلبا کی رہنمائی فرما رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر منوہر کمبھار نے کی۔ پروگرام کی غرض وغایت صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر شیخ عمران نے بیان

مارس کالج میں ندیم صدیقی توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے

کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر نصرت مینو نے مہمانانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ ایم اے فارسی سال اول کی طالبہ فاطمہ نے نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیئے۔ اس تقریب میں مقررِ خصوصی محمد اسد اللہ نے صنف انشائیہ کے خدوخال واضح کرتے ہوئے اس کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی اور انشائیے اور دیگر اصناف کے مابین تعلق کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں طنزیہ ومزاحیہ مضامین کو انشائیہ سمجھنے کا چلن عام ہے، اس کا سبب مغرب سے درآمد شدہ اس صنف کے متعلق معلومات کی کمی اور اور فن پاروں کے مطالعے کا فقدان ہے۔ صدر جلسہ نے اپنے صدارتی کلمات میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عزم، حوصلے اور استقلال ہی سے کامیابی ملتی ہے طلبہ ملک کا مستقبل ہیں، انھیں بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ ہونا چاہیے۔ صدر شعبہ فارسی ڈاکٹر ادھو کامبلے کے اظہارِ تشکر کے ساتھ بزم ادبیات کی تقریب کا اختتام ہوا۔

رپورٹ: ڈاکٹر نصرت مینو (صدر شعبۂ اردو)، 1 اکتوبر 2024

محفلِ افسانچہ، اجرا و مشاعرہ

اورنگ آباد: عالم گیر ہال، بیت الیتیم، نزد شاہی مسجد اورنگ آباد 'عکس ادب' کی جانب سے محفل افسانچہ،

اجرا و مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عظیم راہی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر فاطمہ فردوس، ڈکٹر نصرت حنفی، ڈاکٹر غزالہ پروین، ڈاکٹر شہاب افسر، ڈاکٹر یوسف صابر، ڈاکٹر نخشب مسعود (مالیگاؤں)، ڈاکٹر عزیز عرفان، معز ہاشمی اور صدر محفل ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنے منتخب افسانچے سنا کر خوب داد وتحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنے صدارتی خطبے میں موجودہ دور میں افسانچوں کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ افسانچے کے فن پر سیر حاصل بحث کی اور سنائے گئے افسانوں پر تنقید کی۔ اس اجلاس کی نظامت ادریس فاروقی عسکری نے بحسن وخوبی انجام دی۔ ڈاکٹر یوسف صابر کے شکریے پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مسرت فردوس نے کی۔ اس اجلاس میں مصنفہ ڈاکٹر صدیقی مدحت سلطانہ کی کتاب 'نسائی شاعری (تحقیق وتنقید)' کا اجرا بدست ڈاکٹر غزالہ پروین عمل میں آیا۔ اجلاس کے آغاز میں ڈاکٹر صدیقی مدحت سلطانہ نے 'نسائی شاعری' پر کام کرنے کے اپنے تجربات بیان کیے اور کتاب کی خوبیوں اور کمیوں پر بات کی۔ ڈاکٹر کیرتی جاولے نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کتاب کی مصنفہ کے کام کو سراہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر غزالہ پروین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تانیثیت اور نسائی ادب کے فرق کو واضح کیا اور تحریر کردہ کتاب 'نسائی شاعری' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مسرت فردوس نے اپنے صدارتی خطبے میں تانیثیت و نسائی ادب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صدیقی مدحت سلطانہ کی کتاب نسائی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور اس کتاب کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر کی۔ آخر میں ڈاکٹر یاسمین صدیقی نے شکریے کی رسم ادا کی۔ اس اجلاس کی نظامت راشدہ کوثر نے نہایت دلکش انداز میں کی۔ تیسرے اجلاس میں اسلم مرزا کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں شعرا نے اپنا منتخب کلام سنا کر خوب داد وتحسین حاصل کی۔ اس مشاعرے کی نظامت ارشاد ضیا (پربھنی) نے کی۔ چوتھا اور آخری اجلاس ڈاکٹر ارتکاز افضل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں 'عکس ادب' (سہ ماہی) اورنگ آباد کا اجرا بدست ڈاکٹر دوست محمد خان عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ابوبکر رہبر، ڈاکٹر عظیم راہی، ڈاکٹر دوست محمد خان اور صدرِ محفل ڈاکٹر ارتکاز افضل نے ڈاکٹر یوسف صابر کی مدیرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے 'عکس ادب' کی ترقی کے لیے رہبری کی۔ آخر میں ڈاکٹر یوسف صابر کے شکریے پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت احمد اورنگ آبادی نے اپنے منفرد انداز میں کی۔

پریس ریلیز: رفیع الناصر، مہاراشٹر، 2 اکتوبر 2024

مارس کالج میں ندیم صدیقی کا توسیعی خطبہ

ناگپور: وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور اور سیٹھ کیسری مل پوروال کالج کامٹی کے اشتراک سے شعبۂ اردو کی جانب سے مشہور شاعر، ادیب اور صحافی ندیم صدیقی کا توسیعی خطبہ رکھا گیا۔ طلبہ کے لیے ان کا یہ خطاب وسنت راؤ نائک انسٹی ٹیوٹ کے تاریخی Independence Hall میں منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر پروفیسر منوہر کمبھارے نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اظہر حیات کی کتاب 'اک نئی بات نکل آئی ہے' اور قاضی مشتاق احمد کی کتاب 'بازیافت اور دیگر افسانے' کا اجرا بھی جناب ندیم صدیقی، جناب پروفیسر منور کمبھارے اور پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان کے ہاتھوں کیا گیا۔

صدارتی خطاب میں پروفیسر منوہر کمبھارے نے کہا کہ زبان کی اپنی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے اور ہندوستان میں اردو زبان بہت اہم تسلیم کی جاتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ونئے چوہان نے کہا کہ زبان کے بغیر آپ کوئی کام نہیں کر سکتے ہر حال میں آپ کو بہترین زبان آنی ہی چاہیے۔ ڈاکٹر اظہر حیات نے اپنی کتاب کے متعلق کہا کہ یہ کتاب 29 اردو شاعروں پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ندیم صدیقی نے اس کتاب کو تذکروں کی کتاب بھی کہا۔ ڈاکٹر اظہر حیات نے قاضی مشتاق احمد کی کتاب کے متعلق کہا کہ قاضی صاحب کے افسانے نہایت دلچسپ ہوتے ہیں لہٰذا ان کے افسانوں کا مجموعہ 'بازیافت اور دیگر افسانے' ہم سب کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ 'اک نئی بات نکل آئی ہے' اس

کتاب کو ڈاکٹر ریشما تزئین نے مرتب کیا ہے۔ ادب اور صحافت کے عنوان پر طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے ندیم صدیقی نے دلچسپی سے سمجھایا کہ ادب اور صحافت کے درمیان کیا تعلق ہے اور ایک صحافی کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ طالب علموں نے ندیم صدیقی سے سوالات بھی پوچھے۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض ایس کے پوروال کالج کے پروفیسر محمد اسرار نے بحسن خوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر نصرت مینو نے تمام معزز مہمانان حاضرین اور طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں بڑی تعداد میں طلبہ نے حصہ لیا اور صحافت کی باریکیوں کو سمجھا۔

پریس ریلیز: اظہر ابرار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبہ اردو، سیٹھ کیساری مل پوروال کالج، ناگپور، 28 ستمبر 2024

اعزاز و اکرام

حکیم قمرالحسن ایوارڈ

علی گڑھ: اردو زبان وادب کے ممتاز محقق، صاحب اسلوب ادیب، بلند پایہ نقاد پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو ان کی شہرہ آفاق تصنیف 'تحریک آزادی اور اردو نثر' پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی سنسکرتی پریشد، محکمہ ثقافت، حکومت مدھیہ پردیش کی جانب سے 'حکیم قمرالحسن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اس باوقار ایوارڈ کے ساتھ 51 ہزار روپے کا چیک، توصیفی سند اور اعزازی مومنٹو شامل تھے جو بھوپال میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں وزیر ثقافت و سیاحت دھرمیندر سنگھ لودھی، شیو شیکھر شکلا پرنسپل سکریٹری محکمہ ثقافت، ایزپی نامدیو ڈائرکٹر سنسکرتی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی کے ہاتھوں عطا کیا گیا۔ تقریب میں ملک کے مایہ ناز ادیب، نقاد اور صحافی بھی کثیر تعداد میں شریک تھے جنھوں نے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی علمی و ادبی خدمات کو والہانہ انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ موصوف کی تحقیقی کاوشوں اور علمی فتوحات پر مباحث ہوئے، جہاں ان کی تصنیف 'تحریک آزادی اور اردو نثر' کو اردو ادب میں ایک سنگ میل قرار دیا گیا۔ تقریب کے دوران پروفیسر صدیقی نے خود بھی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اردو زبان کی فکری و ادبی ثروت مندی اور اس کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو کا مستقبل روشن ہے، بشرطیکہ اس کے علمی اور ادبی جہات کو مزید وسعت اور نوجوان نسل کو اردو کی طرف راغب کیا جائے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 ستمبر 2024

پروفیسر ہمایوں اشرف اور ڈاکٹر پرویز شہریار کو منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ 2024

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ گذشتہ دس برسوں سے معروف و مقبول جدید افسانہ نگار ڈاکٹر منظر کاظمی کے نام پر دو قومی ایوارڈ ز فکشن اور فکشن تنقید دیتا آرہا ہے۔ یہ ایوارڈ ان ادیبوں کو دیا

جاتا ہے جنھوں نے فکشن یا فکشن تنقید میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔ اب تک یہ ایوارڈ سلام بن رزاق، دیپک بدکی، قدوس جاوید، ارتضی کریم، صغیر افراہیم، شہاب ظفر اعظمی، بشیر مالیرکوٹلوی، نورالحسنین، خورشید حیات وغیرہ کو دیا جاچکا ہے۔ امسال یہ ایوارڈ معروف فکشن نگار ڈاکٹر پرویز شہریار اور معروف و مقبول فکشن ناقد پروفیسر ہمایوں اشرف کو دیے گئے ہیں۔ دونوں ہی شخصیات نے فکشن اور فکشن تنقید کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پرویز شہریار کی تخلیقات میں بھوک کی حمایت میں، ہما کو پرواز کرنے دو، بڑے شہر کا خواب، شجر ممنوعہ کی چاہ میں، بڑا شہر اور تنہا آدمی کے علاوہ بیدی کے منتخب افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ، منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور، فراق گورکھپوری: شاعر، نقاد، دانشور، راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری، کامرس: فرہنگ اصطلاحات، وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ ہمایوں اشرف نے بھی فکشن تنقید میں نمایاں خدمات انجام دیتے ہوئے متن اور مفہوم، معنی نما، منظر نامہ، الیاس احمد گدی، غیاث احمد گدی، رضا نقوی واہی، فکشن کی بازیافت، حیرت فرخ آبادی، فن اور فن کار، نکتہ نکتہ تعارف، عبدالصمد، سعادت حسن منٹو: ایک لجنڈ، درپس آئینہ، اردو صحافت مسائل اور امکانات، کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا، اندھیرے میں اپنا چہرہ، شناخت اور ادراک معنی وغیرہ جیسی تصنیفات اردو میں بیش قیمتی اضافہ ہیں۔ اس مرتبہ یہ ایوارڈ شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، اربن سروسز ٹاٹا اسٹیل اور کریم سٹی کالج کے اشتراک سے شہر جمشید پور کے کریم سٹی کالج میں ایک ادبی تقریب کے دوران 24 ستمبر 2024 کو دیے جائیں گے۔

پریس ریلیز: محمد شمشاد میرٹھ، 19 ستمبر 2024

جنید عبدالقیوم شیخ

ناگپور: اُفق ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، کامٹی ضلع ناگپور کے زیر اہتمام سوشل اردو ہائی اسکول سولاپور کے معلم و سائنسی مصنف جنید عبدالقیوم شیخ کو محمد ظفر حیات ریاستی مثالی معلم (آئیڈیل ٹیچر) ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، گاندھی باغ، ناگپور میں منعقدہ تقریب کی صدارت جناب ایس کیو زماں (سابق ایم ایل سی،

مہاراشٹر) نے کی۔ تقریب میں مختلف زمروں میں پرائمری، ہائی اسکول اور جونیئر کالج سے دو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، تین مثالی صدر معلم ایوارڈ اور 9 مثالی معلم ایوارڈ پیش کیے گئے۔ جنید عبدالقیوم گزشتہ 23 برسوں سے سائنس کی تدریس کر رہے ہیں۔ موصوف کی سائنسی موضوعات پر لکھی تین کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوئی ہیں موصوف کی کتاب کو مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ تقریب میں کثیر تعداد میں افراد نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: جنید شیخ، ناگپور، 24 ستمبر 2024

رسم اجرا

میر کے 150 منتخب اشعار

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام جشن میر کی تین سوسالہ تقریبات کے سلسلے کے تحت موجودہ دور میں انگریزی کے شاعر رنجیت ہوسکوٹے کی تخلیق کردہ میر کے 150 منتخبہ اشعار کے معاصر حسیت سے ہم آہنگ ترجمہ کی رسم اجرا آج انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر افتتاحی تقریر میں انجمن ترقی (اردو) کے جنرل سکریٹری

ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ ابھی میر پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ذکر میر کے سنسرڈ حصے پر گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اول تو ان لطائف سے میر کی حزن و یاس کے مجسم ہونے کی جو غلط تصویر ہمارے ذہنوں پر نقش ہوگئی ہے، اس کی مکمل تردید ہوتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان لطائف سے ہی میر اور فارسی کے مشہور شاعر بیدل دہلوی کے رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس موقعے پر رنجیت ہوسکوٹے نے کہا کہ وہ انگریزی کے شاعر ہیں مگر میر کی آفاقیت نے انھیں نہ صرف میر کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی طرف راغب کیا بلکہ اس ترجمے کے لیے انھوں نے اردو میں موجودہ تمام ضروری مواد کا مطالعہ کیا جس میں 'ذکر میر' کا وہ حذف شدہ حصہ بھی شامل ہے جسے سنسرڈ کیا گیا تھا۔ ان 150 اشعار کے ترجمے میں تقریباً چار برس اس لیے لگے کہ میر کے استعارات ہی نہیں بلکہ ان کی لفظیات بھی نہ صرف کثیر المعانی ہیں بلکہ اس لفظیات سے واقفیت کے لیے اس زمانے کی دلی میں ان الفاظ کے رائج معنی اور تلازمات سے واقفیت بھی ضروری ہے، جب میر شاعری کررہے تھے۔ سلیمان خورشید نے میر کے حوالے سے انجمن کی طرف سے کیے جارہے کاموں کی ستائش کی اور کہا کہ اس کو مزید جاری رکھا جائے۔ اس جلسے میں دلی میں میر کی شاعری سے دلچسپ رکھنے والے غیر اردو داں شائقین بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2024

شامِ غریباں

بلڈھانہ: فکشن اسوسی ایشن ناندورہ (فین) کے زیر اہتمام، نگر پریشد اردو مڈل اسکول ناندورہ (ضلع: بلڈھانہ، مہاراشٹر) میں، انور مرزا کے افسانچوں کا مجموعہ 'شامِ غریباں' کی رسم اجرا اور شعری و افسانوی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور شاعر یاسین زاہد نے پروگرام کی صدارت کی۔ پروگرام میں ممبئی سے افسانہ نگار وسیم عقیل شاہ اور بلڈھانہ کے نوجوان افسانہ نگار حسین قریشی نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اس محفل میں ملت اردو جونیئر کالج جلگاؤں (خاندیش) کے ہندی کے لیکچرار شیخ زیان احمد اور حضرت بی بی فاطمہ گرلس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج مالیگاؤں کے لیکچرار شارق ذوہیب سر بھی

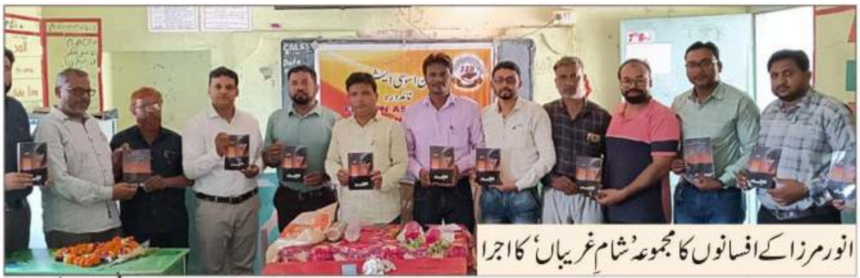

انور مرزا کے افسانوں کا مجموعہ 'شامِ غریباں' کا اجرا

موجود رہے۔ علیم اسماعیل نے پروگرام کی غرض و غایت بیان کی اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ انور مرزا کے افسانچوں کا مجموعہ 'شامِ غریباں' پر وسیم عقیل شاہ اور علیم اسماعیل نے مقالے پڑھے۔ اس کے بعد اجرا کی رسم ادا کی گئی۔ رسم اجرا کے بعد افسانہ خوانی کے سیشن کا آغاز ہوا۔ جس میں سید اسماعیل گوہر، وسیم عقیل شاہ، حسین قریشی، علیم اسماعیل، نفیس احمد نفیس اور شارق ذہیب نے افسانے اور افسانچے پیش کیے۔ افسانہ خوانی کے بعد شاعری کے سیشن کا آغاز ہوا۔ جس میں یٰسین زاہد، نفیس احمد نفیس، اظہر عاطف اور راحیل ابن انجم نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔ مالیگاؤں سے تشریف فرما ادب دوست شخصیت محمد شارق ذوہیب نے پروگرام کے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض مترنم لب و لہجے کے شاعر اظہر عاطف نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل، ناندورہ، 3 اکتوبر 2024

ناشاد اورنگ آبادی شخص اور عکس

پٹنہ: گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں فرزندان ناشاد اورنگ آبادی کی پیشکش پر علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام مشہور و معروف شاعر ناشاد اورنگ آبادی کی ادبی خدمات اور ان کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہوئی کتاب ناشاد اورنگ آبادی شخص اور عکس کے رسم اجرا اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے حصے کی شروعات گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ کے چیئر مین جناب ارشد فیروز کی صدارت میں کتاب کے اجرا اور اظہار خیال سے ہوئی۔ کتاب کا اجرا جناب امتیاز احمد کریمی، جناب اکبر رضا جمشید، جناب ارشد فیروز، جناب خورشید اکبر، جناب ڈاکٹر بسمل عارفی اور وسیم اورنگ آبادی نے کیا۔ نظامت کے فرائض علمی مجلس کے جنرل سکریٹری جناب پرویز عالم نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ سابق چیئر مین بی پی ایس سی جناب امتیاز احمد کریمی نے کتاب ناشاد اورنگ آبادی شخص اور عکس کو منظر عام پر لانے کے لیے ڈاکٹر بسمل عارفی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قابل ذکر کام کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ناشاد اورنگ آبادی کی زندگی کے مزید گوشوں کو جاننے اور ان کی شاعری کے جوہر کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ناشاد اورنگ آبادی کے پوتے عادل ادیب نے اپنے دادا کے لیے لکھا مقالہ ناشاد ایک روزن پڑھا جسے لوگوں نے بہت سراہا اور کہا کہ ناشاد صاحب اپنے بعد اردو ادب کی خدمت کے لیے اپنے پوتے کو تیار کرگئے ہیں۔ اس کے بعد جناب خورشید اکبر کی صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں موجود شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام کے ذریعے بہترین خراج عقیدت پیش کرکے حاضرین مجلس سے خوب داد و تحسین حاصل کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 29 ستمبر 2024

وفیات

الیاس خوری

بیروت: لبنان کے مشہور ناول نگار الیاس خوری نہیں رہے۔ کئی ماہ سے علیل رہنے والے خوری نے 76 سال کی عمر میں آخری سانس لی۔ ادیب خوری اپنے پیچھے

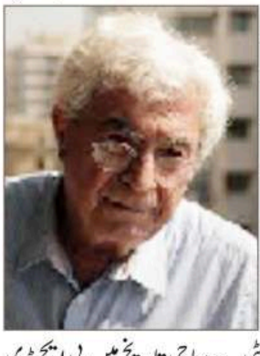

ادب کی ایک طویل میراث چھوڑ گئے ہیں۔ 1948 میں بیروت میں پیدا ہونے والے خوری نے لبنانی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پیرس یونیورسٹی سے سماجی تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ناول نگار خوری نے لبنان کے بڑے اخبارات جیسے انہار اور الصفیر کے ثقافتی حصوں کی تدوین کی۔ جریدے 'فلسطین اسٹڈیز' کے چیف ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ خوری کے ادبی کاموں

میں لٹل ماؤنٹین اور باب الشمس (سورج کا دروازہ) شامل ہیں۔ ان کے ناولوں کا عبرانی سمیت کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ خوری نے نیویارک یونیورسٹی، کولمبیا، پرنسٹن، اور لندن یونیورسٹی جیسے ممتاز اداروں میں بھی پڑھایا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 19 ستمبر 2024

تاج الدین اشعر

موجودہ عہد کے ممتاز و نامور ادیب بیباک صحافی اور شاعر تاج الدین اشعر رام نگری کا 11 اکتوبر 2024 کو ضعیف العمری کے سبب طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 96 برس تھی۔ بنیادی طور اشعر

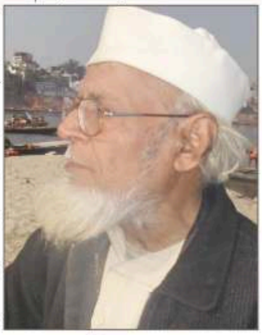

تاج الدین اشعر صحافی تھے۔ عمر کا بڑا حصہ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ مشرقی اتر پردیش کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ قومی مورچہ بنارس کے مدیر رہے۔ موصوف شاعری کی تمام اصناف سخن میں کمال فن رکھتے تھے نظم، غزل، مسدس، مخمس یا مثلث، رباعی ہو یا حاجی نامہ، رخصتی، سہرا، قصیدہ، مرثیہ ہر صنف میں معیار کا خیال رکھتے تھے۔ مرحوم اشعر صاحب کے اداریوں کے کئی مجموعے یا تو منظر عام پر آچکے ہیں اور کچھ زیر ترتیب ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے شعری مجموعوں میں متاع عقیدت نالۂ ساز، موج نسیم حجاز، واشگاف اور زیر ترتیب انقلابی نظموں کے مجموعے قابل ذکر ہیں۔

اشعر صاحب کی باقاعدہ مدرسہ یا اسکول کالج میں درس و تدریس نہ ہونے کے باوجود گھریلو تعلیم کی بنیاد پر عربی، فارسی، ہندی، اردو، سنسکرت، جیسی زبانوں پر زبردست عبور تھا یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ان کے پاس ریسرچ اسکالرز اپنے تعلیمی مسائل کے تصفیہ کے لیے آتے تھے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے سرفراز کیا جا چکا ہے، گزشتہ سال ان کی صحافتی خدمات کی سعی جمیل کے اعتراف میں ایک لاکھ روپے کا انعام اتر پردیش اردو اکیڈمی نے پیش کیا تھا ان کی تدفین بعد نماز جمعہ ان کے آبائی قبرستان گولا گھاٹ رام نگر بنارس میں عمل میں آئی۔ اشعر رام نگری کے انتقال پر ملال پر شہر کے سرکردہ افراد نے اظہار تعزیت پیش کی۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 12 اکتوبر 2024

عالم نقوی

دھلی: معروف صحافی اور ادیب عالم نقوی کا رام منوہر لوہیا اسپتال میں 4 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ ان کا جسدِ خاکی بذریعہ ایمبولنس لکھنؤ لایا گیا اور امام بارگاہ غفران مآب (وکٹوریہ اسٹریٹ چوک لکھنؤ) میں آبا واجداد کے پہلو میں جمعے کے

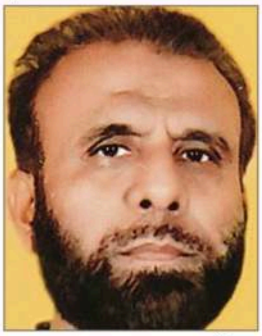

سہ پہر تدفین عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، 2 بیٹیاں اور 2 بیٹے شامل ہیں۔ عالم نقوی گزشتہ تین برس سے علیل تھے۔ انتقال سے قبل وہ اپنی بہن کے یہاں رہائش پزیر تھے، اچانک ان کی طبیعت بگڑ جانے کی وجہ سے انھیں کیلاش اسپتال نوئیڈا پھر رام منوہر لوہیا اسپتال لایا گیا۔ دوران علاج اسی اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 75 برس تھی۔ عالم نقوی بہترین اور منجھے ہوئے صحافی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے کئی برس تک روزنامہ انقلاب میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ وہ روزنامہ 'اردو ٹائمز' کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر بھی رہے۔ صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ 'عزائم' (لکھنؤ) سے کرنے والے عالم نقوی کے مضامین قومی آواز اور اودھ نامہ کے علاوہ مختلف رسائل میں اہتمام سے شائع ہوتے رہے۔ عالم نقوی انتہائی نیک، مخلص، نرم خو، خرد نواز اور منکسر المزاج تھے۔ ان کے انتقال سے دنیائے صحافت ایک عظیم صحافی سے محروم ہوگئی۔

روزنامہ 'انقلاب' 5 اکتوبر 2024

ارشد غازی

علی گڑھ: (مظفر حسین غزالی): ارشد منصور غازی کا مختصر علالت کے بعد 14 اکتوبر 2024 کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں آخری سانس لی۔ ان کی پیدائش انبیہٹہ ضلع سہارنپور کے ایک علمی خانوادے میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد مولانا

حامد الانصاری غازی مشہور زمانہ اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر اور والدہ ہاجرہ نازلی کا شمار بلند قامت افسانہ و ناول نگاروں میں ہوتا تھا۔ ارشد کے نانا سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب صاحب اور دادا مولانا محمد منصور غازی مجاہد آزادی تھے، جنھیں برطانوی حکومت نے ملک بدر کر دیا تھا۔

ارشد غازی ممبئی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سعودی عربیہ چلے گئے جہاں وہ لمبے وقت تک رہے۔ ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں کئی شعری مجموعے ہیں۔ 'ضرب آگہی' ان کا ایک لاجواب شعری مجموعہ ہے۔ ان کے بہت سے مضامین اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو زبان وادب کی بہت سی معتبر اور مؤقر شخصیات نے ارشد غازی کی رحلت پر خراج تعزیت بھی پیش کیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 14 اکتوبر 2024

سعید زاہدی

ھاپوڑ: ہاپوڑ کے شعر و ادب کے شیدائی سعید احمد زاہدی کا مختصر علالت کے بعد 13 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 85 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو صاحبزادیاں اور ایک فرزند ہیں جو ممبئی میں شعبۂ طب میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مرحوم کچھ دنوں سے علیل تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ان کی تجہیز و تدفین آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ سعید زاہدی کو اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اکثر مشاعروں کی زینت ہوا کرتے تھے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ انھوں نے سرکاری ٹیچر کے طور پر بھی اپنی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی شاعری میں پرانی قدروں کی آمیزش تھی۔ ترنم میں وہ بہت اچھی شاعری کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے شاعری کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ جب بھی ہاپوڑ آتے شعری نشست کا انعقاد ضرور کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

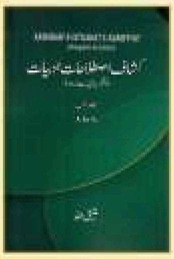

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 627+26

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (دوم)

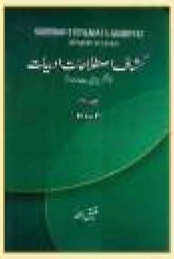

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 644+23

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (سوم)

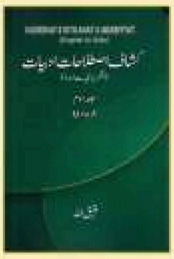

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 355+21

قیمت: 235 روپے

باقیات شکیل الرحمٰن (جلد اوّل تا پنجم)

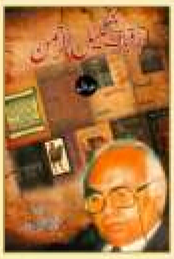

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: تقریباً 3400

قیمت: 2190 روپے (مکمل سیٹ)

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

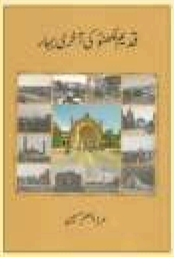

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

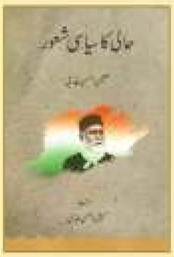

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

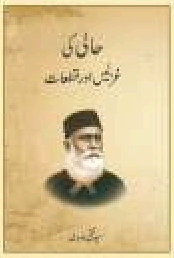

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर-२०२४,वर्ष:२६, अंक:११

URDU DUNIYA Monthly, November-2024, Vol.26, Issue:11

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/10/2024

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

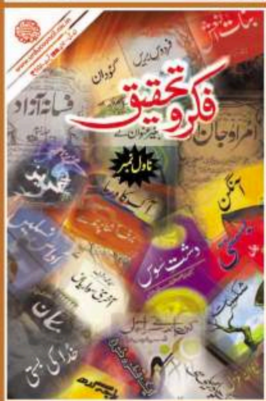

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6